زندہ اور متحرک ادب کا ترجمان

اُردو سہ ماہی

ثالث

کتابی سلسلہ.....۶

جلد-۲ شمارہ -۶

جنوری ۲۰۱۵ تا مارچ ۲۰۱۵

مدیر اعزازی اقبال حسن آزاد

مدیر ثالث آفاق صالح

نائب مدیر ڈاکٹر طیب رضا

تزئین کار: اعجاز رحمانی

رابطہ: : شاہ کالونی، شاہ زبیر روڈ، مونگیر۔۸۱۱۲۰۱
Mob.+91 9430667003
email.eqbalhasan35@yahoo.com
www.salismagazine.in

● پرنٹر، پبلیشر، پروپرائٹر ایڈیٹر ثالث آفاق صالح نے ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی سے چھپوا کر شاہ کالونی شاہ زبیر روڈ مونگیر ۸۱۱۲۰۱ سے شائع کیا۔

● 'ثالث' کے مشمولات سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

قیمت۔فی شمارہ	:	.....۱۲۵روپے (رجسٹرڈ ڈاک سے ۱۵۰/روپے)
سالانہ	:	.....۵۰۰روپے (رجسٹرڈ ڈاک سے ۶۰۰/روپئے)
خصوصی تعاون	:	.....پندرہ ہزار روپئے یا ۳۰۰/امریکی ڈالر

'ثالث' غیر ممالک میں

'ثالث' کی خریداری کی سہولت کے لئے ہم مختلف ممالک میں زرتعاون کی ذیل میں صراحت کر رہے ہیں۔

امریکہ	:	ساٹھ (۶۰) امریکی ڈالر
کناڈا	:	ستر (۷۰) کناڈا ڈالر
آسٹریلیا	:	چالیس (۴۰) امریکی ڈالر
برطانیہ	:	چالیس (۴۰) برطانوی پاؤنڈ
یو۔اے۔ای	:	ایک سو پچاس (۱۵۰) یو۔اے۔ای درہم
عمان	:	پندرہ (۱۵) عمانی ریال
سعودی عرب	:	ایک سو (۱۰۰) ریال
قطر:	:	ایک سو پچاس (۱۵۰) ریال
کویت	:	پچیس (۲۵) کویتی دینار
پاکستان	:	دو ہزار پانچ سو (۲۵۰۰) پاکستانی روپے

جن ممالک میں Western Union یا منی گرام کی سہولت ہے وہاں سے مدیر اعلیٰ کے پتہ پر رقم بھیجی جا سکتی ہے۔

TMCN اور دیگر تفصیلات درج ذیل ای۔میل پتہ پر بھیجی جا سکتی ہیں۔

eqbalhasan35@yahoo.com

سالانہ ممبر شپ کے لئے ہندوستان کے کسی بھی نیشنلائزڈ بینک کے کسی بھی برانچ کے ذریعے درج ذیل اکاؤنٹ میں رقم بھیجی جا سکتی ہے۔

Eqbal Hasan Azad
Union Bank of India
Munger Branch
A/c No. 389002010003800
IFSC Code-UBIN0538906

فہرست

	اداریہ	ادارہ	۵
	حمد	محمد شفیع الرحمٰن شفیع	۷
	نعت پاک	ڈاکٹر منظر اعجاز	۸
غزلیں	سید انور جاوید ہاشمی، حامدی کاشمیری، راشد طراز، وفا نقوی، اصغر علی بلوچ، عمر فرحت، مصداق اعظمی		۹ تا ۱۵
تبرک	نور احمد ناز کی غزلیں		۱۶
نظمیں	فاروق ناز کی، پرتپال سنگھ بیتاب، نسیم سید، سیمیں درانی		۱۸ تا ۲۲
مضامین	شمس الرحمٰن فاروقی: ایک مختصر جائزہ	ارشد جمیل	۲۳
	جانکی اور نسائی جنسیت کا شعور	پروفیسر علی رفاد فتیحی	۲۸
	پیغام آفاقی کا ناول ''پلیتہ''	سلیم خان	۳۵
	شہناز نبی کی نظمیہ شاعری: ایک مطالعہ	ڈاکٹر محمد زاہد الحق	۳۹
	میراجی کے شعری رویے	فیضان احمد ملک	۴۶
	نظیر اکبر آبادی کی شاعری میں مشترکہ تہذیب کی عکاسی	محمد فرحان دیوان	۵۵
	طنز و مزاح کے مابین رستہ	ارشاد آفاقی	۶۱
یاد رفتگاں	پیارے بھائی سید ارتضیٰ کریم کی یاد میں	مصطفیٰ کریم	۶۶
خاکہ	سیانا مجذوب	غضنفر	۷۱
افسانے	سیاہ ٹھپہ	علی اکبر ناطق	۷۸
	آدھا عشق	ممتاز رفیق	۸۸
	آلو قمیہ	ڈاکٹر نگہت نسیم	۱۱۱
	کیمیا	م۔ص۔ایمن	۱۱۸

	صرف چند کیلومیٹر دور	عبدالغنی شیخ	۱۲۵
	سیڑھیاں	طلعت زہرہ	۱۳۰
	ایک تھی بھوری کتیا	شاہد جمیل احمد	۱۳۵
	انکاؤنٹر	محمد علم اللہ	۱۳۹
ناول کا پہلا باب	راج سنگھ لاہوریا	اقبال حسن خان	۱۴۴
کتاب کا ایک باب	ڈیوٹی	رابرٹ ایم اسمتھ / ترجمہ: یونس خان	۱۶۸
پوسٹ مارٹم	اے دلِ آوارہ: شموئل احمد کی عمر گذشتہ کی کتاب	صفدر امام قادری	۱۹۴
تبصرے	شمس الرحمٰن فاروقی کے تبصرے	شمس الرحمٰن فاروقی	۲۱۰
مکتوبات	شمس الرحمٰن فاروقی، اقبال مجید، افتخار احمد خٹک، مصداق اعظمی، پرویز اختر، محمد علم اللہ۔		۲۲۱

◄◄ ● ►►

﴿ثالث ملنے کے پتے﴾

☆ ابن آس، فلیٹ نمبر ۱۲، بلیز ٹاور، مین راشد منہاس روڈ، گلشن اقبال، کراچی (پاکستان) 0321-204358

☆ بک امپوریم، سبزی باغ پٹنہ (بہار) +91 9304888739

☆ آزاد کتاب گھر، ساکچی، جمشید پور (جھارکھنڈ) +91 6576999980

☆ سکندر نیوز ایجنسی، لال چوک، سری نگر (جموں کشمیر) +91 9797797124

☆ عبدالمغنی، تاج بک ڈپو، اقرا مسجد کمپلیکس، مین روڈ، رانچی (جھارکھنڈ) +91 9304514659

☆ محمد فہیم، راعی بک ڈپو، ۷۳۴۔ اولڈ کٹرا، الہ آباد (یو۔پی) +91 9839982690

اداریہ

شعر و ادب کا مطالعہ ایک تہذیبی عمل ہے۔ یہی وہ عادت ہے جو انسان کو انسان بناتی ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی روبوٹ تو بنا سکتے ہیں لیکن انسان نہیں۔ آج سے بیس پچیس سال قبل تک تقریباً ہر زبان میں ادب اطفال کی باقاعدگی سے اشاعت ہوا کرتی تھی۔ بچوں کے لئے مزے دار کہانیاں اور معلوماتی مضامین شائع ہوا کرتے تھے اور یہ رسائل اور کتب گھر گھر جایا کرتے تھے۔ اسکول کے نصاب میں بھی اس قسم کی چیزیں شامل ہوا کرتی تھیں۔ اور اس کا معصوم ذہنوں پر بڑا مثبت اثر قائم ہوا کرتا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ آج کی بہ نسبت پہلے ہمارا سماج زیادہ مہذب اور پرسکون ہوا کرتا تھا۔ لیکن سائنس کی دن دونی رات چوگنی ترقی نے حالات کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔ مواصلاتی نظام کی برق رفتاری نے ساری دنیا کی سیاسی، تجارتی اور سماجی زندگی کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس کا اثر خاندانی اور عائلی زندگی پر بھی بہت گہرا پڑا ہے۔ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ نے اگر ایک جانب ہماری زندگی میں تیز رفتاری پیدا کرتی ہے تو دوسری جانب ہمیں ایک دوسرے سے بیگانہ بھی کر دیا ہے۔ آج کا انسان اپنے افراد خانہ کے بجائے ٹی وی، انٹرنیٹ اور فون پر زیادہ وقت گزارتا ہے۔ اس کا بھی منفی اثر بچوں پر پڑتا ہے۔ اب بچوں کو کہانیاں سنانے والی دادی، نانی یا بوا نہیں پائی جاتیں۔ ماں کی گود والے بچے بھی اب ٹی وی اور انٹرنیٹ کی گود میں بیٹھتے ہیں۔ اور وہی کچھ سیکھتے ہیں جو انہیں دیکھنے اور سننے کو ملتا ہے۔ چند روز قبل ایک دوست کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا کہ وہ آفس سے لوٹے تو ذرا موڈ میں تھے۔ انہوں نے پینٹ کی بیلٹ کھول کر ہوا میں لہراتے ہوئے از راہ مذاق فلم شعلے کے گبر سنگھ کی طرح گرج کر کہا۔ ''ناچ بسنتی ناچ'' پاس ہی ان کا چھوٹا بچہ کھڑا تھا۔ اس نے چلا کر کہا۔ ''خبر دار ممی! اس کتے کے سامنے کبھی مت ناچنا۔'' ہوسکتا ہے کہ بعض لوگ اسے محض ایک لطیفہ سمجھ کر ہنس دیں لیکن یہ ہمارے لئے ایک لمحۂ فکریہ ہے۔

انٹرنیٹ کے بڑھتے ہوئے اثرات کی وجہ سے ہماری زبان میں بھی ایک بڑی تبدیلی آ رہی ہے۔ کچھ لوگوں کی نظر میں یہ تبدیلی اچھی ہے اور بعض لوگ اسے اچھا نہیں سمجھتے۔ تبدیلی دراصل زندگی کی علامت ہے۔ زندہ چیزیں ہی رد و بدل قبول کرتی ہیں۔ آج ہماری زبان وہ نہیں ہے جو دو سو برس قبل

تھی۔ مفرس اور معرب اردو کا چلن کم ہوا ہے اور اس کی جگہ ہندی اور انگریزی آمیز زبان سامنے آ رہی ہے۔ اب ہمیں زبان کی اس بدلی ہوئی شکل کو قبول کرنا ہوگا لیکن یہ ملحوظ رہے کہ اس سے زبان کے بنیادی ڈھانچے کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔

☆☆☆

اردو رسائل کی اشاعت کے سلسلے میں ہزاروں پریشانیاں سامنے آتی ہیں۔ ہم نے کبھی جانب اشارہ نہیں کیا۔ ہمارا ایک مشن ہے اور ہم اپنے مقصد کو حاصل کرنے کی جانب گامزن ہیں۔ اردو کے ادبی حلقوں کی جانب سے اکثر یہ خدشہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ اس زبان میں نئے لکھاری سامنے نہیں آ رہے ہیں۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے نئے قلم کاروں کو سامنے لانا چاہیے۔ رسالہ نکالنے کا ایک مقصد نئے لکھنے والوں کی تربیت اور ان کی حوصلہ افزائی کرنا بھی ہے۔ الحمدللہ! اپنے اس مقصد میں ہم کافی حد تک کامیاب رہے ہیں۔ اور ہر شمارے میں کہنہ مشق ادیبوں کے ساتھ ساتھ بالکل نئے لکھنے والوں کو بھی جگہ دے رہے ہیں۔ زیر نظر شمارے میں بھی کئی ایسے نام شامل ہیں جو بالکل نئے ہیں لیکن اردو کا مستقبل انہی نئے ناموں سے وابستہ ہیں کیونکہ:

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اُٹھتے جاتے ہیں۔

☆☆☆

''ثالث'' نے ایک قلیل عرصہ میں بڑی کامیابی حاصل کی ہے اور اس نے پوری اردو دنیا میں اپنی ایک الگ شناخت قائم کی ہے۔ اس کے لیے ہم اپنے باذوق قارئین کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں۔ اس رسالے کی ویب سائٹ کو تادم تحریر اٹھائیس ہزار چھ سو چھ (۲۸،۶۰۶) سے زیادہ بار وزٹ کیا جا چکا ہے۔ آپ بھی درج ذیل لنک پر جا کر اس کے گذشتہ شمارے بالکل مفت پڑھ سکتے ہیں:

www.salismagazine.in

www.facebook.com/salismag

یہ شمارہ آپ کو کیسا لگا؟ ہمیں آپ کی گرانقدر رائے کا انتظار رہے گا۔ (ادارہ)

● شفیع الرحمٰن شفیعؔ

حمد باری تعالیٰ

زباں قاصر ہے پھر بھی حمدِ رب میں اس کی ہے رغبت
سرور وکیف و شرح و بسط کے احساس کی لذت
کیا در فاذکرونی کہ کے وا رب نے عنایت کا
ہے اذکرکم کا پھر اس کی طرف سے وعدۂ نعمت
ہے اقرب جو شہِ رگ سے وہ دل کی بات بھی جانے
تصور سے بھی پہلے جلوہ گر ہو اس کی خود رحمت
بنی آدم کی رحماں رب نے خود تکریم فرمائی
اگر مومن بنا کوئی تو اس کے واسطے عزت
کرم اس کا بشر پر بے حساب و فہم سے بالا
ادا جو شکر کرتا ہے زیادہ اس کو دے نعمت
بنانا چاہے جب وہ کچھ تو کن کہ دینا کافی ہے
اسے ہر چیز پر حاصل ہے ہر حالت میں ہر قدرت
نرالی شان ہے اس کی، احد بھی ہے، صمد بھی ہے
جِلا کرکہف کے مُردوں کو اس نے بخش دی شہرت
یگانہ لم یلد بھی ہے وہ یکتا اورلم یولد
وہی تخلیق کرتا ہے برودت ، خنکی و حدت
سمندر روشنائی ہو ، قلم اشجار ہو جائیں
ادا حق ہو نہیں سکتا شفیع اس کی ہے وہ ندرت

◀◀ ● ▶▶

Chand Manzil Nawab Bahadur Road
Panta City 800008 Mob. 9304856774

● ڈاکٹر منظر اعجاز

نعت

جب جلوہ گہِ ناز کو بازار بنایا
خود بکنے چلا،خود کو خریدار بنایا
چاہا کہ ہے چہرہ تو ہو پہچان بھی اپنی
تب جلوے کو آئینے کا زنگار بنایا
اس عالم اسفل میں اُگایا شجرِ نور
ہر شاخ کو پھر اس کی گُہر بار بنایا
اِک خواب پسِ خواب تھا تعمیرِ جہاں کے
تعبیر ،تجھے سیّد ِ ابرار بنایا
ہے رمز خداوند کے اظہارِ خودی کا
اُمّی لقب و محرم اسرار بنایا
دستارِ فضیلت سے سجایا سرِ اقدس
ہم سب کا نبیؐ، نبیوں کا سردار بنایا
مقصود نمائش تھی اسے قدرتِ فن کی
تخلیق کے فن کا تجھے شہکار بنایا
سلطانیٔ کونین تجھے بخش دی اس نے
یوں تجھ کو جہانگیر و جہاندار بنایا
اللہ نے جو عرش کے پائے پہ لکھا نام
اُس نام کو سر نامۂ اخبار بنایا
کی وقف ترے نام جو کونین کی دولت
تو لوح و قلم کا تجھے مختار بنایا
اسرا کی گزر گاہ کٹھن تھی پئے جبریل
آساں تری خاطر مرے سرکار بنایا
ہمدم نہ کوئی، مونس و پُرساں نہ کوئی تھا
تجھ کو مِرا مونس،مِرا غمخوار بنایا
نعتِ شہہ کونین کی توفیق دی مجھ کو
مطلع کو مرے مطلعِ انوار بنایا

منظرؔ کرم اس کا ہے کہ میں نے بھی کسی طور
نذرانے کو گلدستۂ اشعار بنایا

◀◀ ● ▶▶

Prof &Head,P.G.Deptt Of Urdu ,
A.N.College,Patna-800013
Mob:9431840245

سید انور جاوید حاشمی

شکوک ذہن میں رکھے گمان پہنے ہوئے
یہ کون آ گیا اُردو زبان پہنے ہوئے

کہیں پہ اُلفتِ خالص نہ اِلتفات ملے
بسا ہے شہر تجارت دکان پہنے ہوئے

کہاں سے لائے گی زیور غریب کی بیٹی
نجوم و شمس تو ہیں آسمان پہنے ہوئے

بلند و بالا پلازے وہاں پہ ملتے ہیں
ہمارے کھیت تھے جس جا پہ دھان پہنے ہوئے

میں دیکھتا تھا برہنہ نگاہ سے منظر
جب ایک ناؤ چلی بادبان پہنے ہوئے

◀◀ ● ▶▶

Flat No: B-301
Al Amna Avenue 7D/1
North Karachi (Pakistan)

حامدی کاشمیری

ملنے کا اہتمام کرنا تھا
ان کا جینا حرام کرنا تھا

میرے آتے ہی بند کی آنکھیں
رشتے کا احترام کرنا تھا

وادیٔ مرگ کا بلاوا ہے
جینے کا انصرام کرنا تھا

شام سے ہی چنار لرزاں ہیں
صبح کو قتل عام کرنا تھا

اب کوئی مرحلہ نہیں باقی
کام اپنا تمام کرنا تھا

بے در و بام ہے سرا تو کیا ؟
صبح تک ہی قیام کرنا تھا

◀◀ ● ▶▶

MASOOD MANZIL , SHALIMAR .SRINAGAR 190001
JAMMMU KASHMIR
MOBILE ; 07298 95 79 78

راشد طراز

آنکھوں میں اگر خوابِ پریشاں نہیں ہوتا
میں اتنا زمانے میں نمایاں نہیں ہوتا

انسانی محبت اگر آفاق میں ڈھلتی
آدم کا لہو اتنا پھر ارزاں نہیں ہوتا

اطرف و جوانب میں چراغاں جو نہ کرتے
گھر اپنا بھی دنیا میں فروزاں نہیں ہوتا

کچھ اس میں صلابت جو نہیں ہوتی بدن کی
زنجیر سے شوریدہ یہ زنداں نہیں ہوتا

گہوارۂ افسوس نہیں بنتا مرا دل
یادیں تری ہوتیں تو یہ ویراں نہیں ہوتا

خونِ دلِ بیتاب جو پاتیں نہ بہاریں
گردش میں کبھی رنگِ گلستاں نہیں ہوتا

راشدؔ بھی سناتا کبھی افسانۂ تکمیل
حاصل مگر اپنا اسے عرفاں نہیں ہوتا

◀◀ ● ▶▶

کہتے ہیں لوگ شہرِ ستمگر بھی آئے گا
حق ہے تو اس کی راہ میں لشکر بھی آئے گا

ہر شئے کو اس کی حد نے یہاں دی ہے آگہی
عرفانِ دشت ہے کہ سمندر بھی آئے گا

دنیا مری طرح بھلا دستِ تہی ہو کیوں
قاتل کے سامنے یہاں خنجر بھی آئے گا

ردِّ عمل کے ساتھ ہی چلتا ہے کاروبار
شیشے کا گھر بنے گا تو پتھر بھی آئے گا

پہلے کسی بہار کو ہم خونِ دل تو دیں
گلشن میں سرخروئی کا منظر بھی آئے گا

اپنے لئے بھی مانگیئے اقرارِ روشنی
سایہ کبھی تو قد کے برابر بھی آئے گا

راشد طرازؔ یاد رہے رنجِ خامشی
یوں ہی نہیں ابد لئے محشر بھی آئے گا

◀◀ ● ▶▶

راشد طراز

بنا کے عرش کے تاروں میں رہگذر میں نے
تمام کردیا خوابوں کو باروَر میں نے

شمار میں نہیں آتا تھا کوچۂ قاتل
لہو سے کردیا مقتل کو معتبر میں نے

اب اور کس کے لئے شمعِ انتظار جلے
تری امید بھی کر ڈالی مختصر میں نے

وگرنہ سخت تھیں تاریکیاں یہاں مجھ پر
ترے یقین پہ راتوں کو دی سحر میں نے

بس ایک دُھن تھی مجھے فرض کو نبھانے کی
قدم کو روکا نہیں دیکھ کر شجر میں نے

فنا نصیب بنانے کو ہے ہمیں غفلت
قبیلے والوں کو دے دی ہے یہ خبر میں نے

چلو طرازؔ کہیں شامِ بندگی ہے کھڑی
زوال دیکھا ہے کرتے ہوئے اثر میں نے

◀◀ ● ▶▶

Dilawarpur,
Munger 811201
Mob:+91 9934628955

وفا نقوی

میں تصور میں جنھیں سمجھا تھا گھر کی صورت
وہ در و بام تو اب بھی ہیں کھنڈر کی صورت

کون رکھتا ہے بھلا دل سے لگا کر اُس کو
عشق بِک جاتا ہے ردّی میں خبر کی صورت

اب کہاں فرصتیں حاصل ہیں جو سب سے ملئے
آج پہلی سی نہیں شام و سحر کی صورت

دیکھئے قدر کہاں کرتے ہیں دنیا والے
جی کے دیکھیں گے یہاں ہم بھی بشر کی صورت

سوچنے پر بھی میسر نہ ہوئی فکر کوئی
دائرے بنتے گئے مجھ میں صفر کی صورت

ایسا لگتا ہے کہ منزل سے پلٹ آئی ہے
مضمحل یوں ہی نہیں راہ گزر کی صورت

موسمِ گل میں تو آتے ہیں سبھی ملنے کو
دیکھنا چاہئے پت جھڑ میں شجر کی صورت

◀◀ ● ▶▶

Hilal House
4/114 Nagla Mallah
Civil line Aligarh 202002 UP
Mob:09219782014

اصغر علی بلوچ

یاں سے اُس پار اور وہاں سے پرے
مجھ کو جانا ہے آسماں سے پرے

تیر ٹوٹے ہوئے پڑے ہیں ابھی
میرے ترکش سے اور کماں سے پرے

میرے داتا بہت سے بھوکے ہیں
آپ کے سنگِ آستاں سے پرے

وہ رہا اُس کا گھر مسافر چل
اِس ٹھٹھرتے ہوئے مکاں سے پرے

کوئی کردار سانس لیتا ہے
نیم مردہ سے داستاں سے پرے

آیتیں بن کے وہ اُترتا ہے
وہم سے دور اور گماں سے پرے

اِک جہاں بے بدل بھی ہے اصغر
اس بدلتے ہوئے جہاں سے پرے

◀◀ ● ▶▶

ایک زندہ دلیل باقی ہے
روشنی کا قتیل باقی ہے
پار کرنا ہے شام سے پہلے
یہ جو دشتِ طویل باقی ہے
باوجودِ مقاطعۂ یاراں
یہ دلِ خود کفیل باقی ہے
آنگنوں میں نہیں رہے چوزے
اور ممٹی پہ چیل باقی ہے
میرے اعصاب تن گئے پھر بھی
ڈھیلی رسی کی ڈھیل باقی ہے
نہ وہ فرعوں نہ کشتیاں نہ کلیم
وقت کا رودِ نیل باقی ہے
فیصلے کب کے ہو چکے ہیں مگر
میرے لب پر اپیل باقی ہے
اپنے پہلو میں کاٹنے دے مجھے
یہ جو عمرِ قلیل باقی ہے
اُس کی آنکھیں ہی بجھ گئیں اصغر
جام باقی ہے جھیل باقی ہے

◀◀ ● ▶▶

Dept: of Urdu GC University
Faisalabad Pakistan
Mob : +92 3007908317

عمر فرحت

ذہن کا ’’ کینوس ‘‘ پھیلا کر
تو ، ہر اک مسئلے پہ سوچا کر

میرے کاندھے پہ آج اداسی پھر
سو گئی اپنے بال بکھرا کر

مجھ کو اندھا بنا گئیں یاروا
خواہشیں ، آئینوں کو چمکا کر

یوں بچھڑنا تو کوئی بات نہیں
خوب رویا تھا وہ بھی گھر جاکر

میری جلتی اداس آنکھوں پر
کبھی چپکے سے ہونٹ رکھا کر

آگے اک باغ کا جزیرہ ہے
پھول توڑیں گے ناؤ ٹھہرا کر

اپنے حالات سے نبٹ نہ سکا
خود کشی کر گیا وہ گھبرا کر

سب عقیدے ہی بے اساس ہوئے
آگئی اور شعور کو پا کر

◀◀ ● ▶▶

دھوپ نایاب ہوئی جاتی ہے
چھاؤں بے آب ہوتی جاتی ہے

پانی دریا میں نہیں ہے لیکن
بستی عرقاب ہوئی جاتی ہے

چھو لیا کس نے تن بدن میرا
روح سیراب ہوئی جاتی ہے

میں تھا جس موج کے تعاقب میں
اب وہ گرداب ہوئی جاتی ہے

برف ساری پگھل گئی اب کہ
ندی بے آب ہوئی جاتی ہے

◀◀ ● ▶▶

Opp: ITI Road, W-No. 4,
Rajouri-185131 (J&K)
Mob:+917298136987

مصداق اعظمی

آئینہ ساتھ میں چلتا تھا سکندر لے کر
آپ ہوتے تو نکلتے کوئی خاور لے کر

شعر فہمی کا یہ دعویٰ ترا منظور مگر
وہ بھی بیٹھا ہے پیالے میں سمندر لے کر

تم کہانی میں کوئی رنگ تو بھر سکتے ہو
میرے اُجڑے ہوئے سنسار کا منظر لے کر

حادثے چور لٹیروں کی طرح ہی اک دن
بھاگ جائیں گے تری سانس کا زیور لے کر

دیکھ اک آئینۂ دل کو شکستہ کرنے
شہر کا شہر اُمڑ آیا ہے پتھر لے کر

ہم تو آداب چمن سے بھی نہیں ہیں واقف
خوار ہو جائیں گے ہم پھول سا پیکر لے کر

تنگ اس شہر کی گلیاں نہ ہوئیں اور قاتل
گشت کرتا رہا نیزے پہ مرا سر لے کر

◀◀ ● ▶▶

فقیر غالب کو گا رہا ہے
غزل کی عزت بڑھا رہا ہے

زباں سے بڑھ کر ازل سے واعظ
ہمارے دل میں خدا رہا ہے

وہ ایک پاگل ہواؤں سے بھی
چراغ اپنے لڑا رہا ہے

نظر بھی آتا نہیں ہے مجھ کو
جو میری بگڑی بنا رہا ہے

وہ آڑ میں اب ہمارے فن کی
ہماری قیمت لگا رہا ہے

مجھے خیالوں کی وادیوں سے
کوئی تو ہے جو بلا رہا ہے

وہ شاید اتنا ہی نا سمجھ ہے
فریب ہنس کر جو کھا رہا ہے

◀◀ ● ▶▶

Vill: Jawma Po- Mejwan
Phulpur, Dist Azamgadh
(U.P) 276304
Mob: 9451431700

● تبرک

نور احمد ناز

کبھی ترتیب دیتا ہے کبھی مسمار کرتا ہے
وہ اپنی بے بسی کا اس طرح اظہار کرتا ہے

گمان و بے یقینی کب کسے تکمیل کرتے ہیں
جسے امید ہوتی ہے وہی اصرار کرتا ہے

کسی اک فیصلے کے منتظر ہیں لوگ مدت سے
اسے کافر کہیں گے سب، اگر انکار کرتا ہے

پڑاؤ کر چکا ہے کارواں ایسے علاقے میں
جہاں نہ ٹھہرنے پہ کُل جہاں اصرار کرتا ہے

کبھی تو راستے خود منزلوں سے دُور کرتے ہیں
کہیں پر خود جنوں بھی راستہ ہموار کرتا ہے

مجھے میرے ارادے ٹوٹنے سے روکتے ہیں ناز
مگر حالات کہتے ہیں سفر بے کار کرتا ہے

◀◀ ● ▶▶

کرچی کرچی ہو جاتے ہیں اکثر میرے خواب
مجھ سے پہلے سو جاتے ہیں اکثر میرے خواب

ذہن کو بنجر کر دیتی ہے سوچ کی سیم اور تھور
وحشت دل میں بو جاتے ہیں اکثر میرے خواب

بند آنکھوں سے دیکھوں کب تک میں تیری تصویر
یاد میں تیری کھو جاتے ہیں اکثر میرے خواب

دھیرے دھیرے مر جاتی ہے جب بھی ایک امنگ
آ کر مجھ پر رو جاتے ہیں اکثر میرے خواب

ناز کسی کو دیکھ کے جونہی دھڑکے میرا دل
آگے پیچھے ہو جاتے ہیں اکثر میرے خواب

◀◀ ● ▶▶

نور احمد ناز

ہے پسِ دیوار دھیمی روشنی
آتشیں یلغار دھیمی روشنی

ایک بھٹکی روح اور سونی سڑک
کس قدر بے زار دھیمی روشنی

چار سو تاریکیوں کے مرحلے
آہنی تلوار دھیمی روشنی

نوکِ نیزہ اور صحرا کی تپش
قافلہ سالار دھیمی روشنی

خوبصورت عالمی سٹیج پر
آخری کردار دھیمی روشنی

ریت دریا اور کوفے کا سفر
راستہ دشوار دھیمی روشنی

ناز سب کچھ یاد ہے اب بھی مجھے
بے وفا کا پیار دھیمی روشنی

◀◀ ● ▶▶

ناؤ جب وحشی سمندر کی اماں پر چھوڑ دی
اپنی قسمت کی کہانی بادباں پر چھوڑ دی

منزلوں کو دیکھتے ہی بے مروت شخص نے
راستے کی گرد پورے کارواں پر چھوڑ دی

بے مکاں ہوتے ہوئے اک مصلحت اندیش نے
اپنے دل کی ہر تمنا لامکاں پر چھوڑ دی

بادلوں کو بجلیوں سے مستیوں میں دیکھ کر
اک دعا محصور کر کے آسماں پر چھوڑ دی

لٹ گیا جب کارواں تو ناز پھر سالار نے
قافلے کی رہبری بھی ساربان پر چھوڑ دی

◀◀ ● ▶▶

بشکریہ: منیر احمد فردوس
خیبر پختون خواہ (پاکستان)

فاروق نازکی

ایک نظم

خواب میں کون بن رہا ہے مجھے
شعر میں کون سن رہا ہے مجھے
کس نے گاڑا مجھے خلاؤں میں
سنگ میں کون چن رہا ہے مجھے
دھوپ سے جسم ڈھانپ لیتا ہوں
آتش غم میں راکھ ہوتا ہوں
رات پھر ظلمتوں کے سائے میں
شمع کی طرح میں پگھلتا ہوں
موسم گل سے برف زاروں تک
سینکڑوں رنگ میں بدلتا ہوں
رات کے در پہ اک سوالی ہوں
صبح کی سلطنت کا والی ہوں

◀◀ ● ▶▶

398, shivpora, ward No. 03,
Ssrinagar 190001
Jammu kashmir
Mobile : 094190 12874

پرتپال سنگھ بیتاب

مر کے بھی

مر چکا ہوں
تابوت میں اتار دیا گیا ہوں
تابوت میں آخری کیلیں ٹھوکی جا رہی ہیں
پھر یہ احساس کی قوت کیوں نہیں مری
یہ سب دکھائی کیوں دے رہا ہے
یہ سب سنائی کیوں دے رہا ہے
موت میں سب ختم کیوں نہیں ہو جاتا
مکمل بے حسی کیوں نہیں ہو جاتی
یہ ایک ایک کیل کی چبھن
محسوس کیوں ہو رہی ہے
یہ درد کیوں ہو رہا ہے
موت میں یہ زندگی کا درد کیسا ؟

◀◀ ● ▶▶

101 - C , Sai Amit , Co-OP.
Housing Socity , Yaari Road
Varsova , Andheri (WEST)
MUMBAI 400061
MOBILE : 094191 80824

● نسیم سید

سمجھوتہ

سمجھوتے کے دالانوں کی/ ہر چیز سجل سی لگتی ہے
ہر طاق سجا سا ہوتا ہے/ اک فرض مسلسل کی دھن پر
دو پیر تھرکتے رہتے ہیں/ ہاتھوں کی لکیروں میں لکھے
''دو بول''/ چہکتے رہتے ہیں
ہمت کی چٹختی شاخوں سے/ کچے دن توڑے جاتے ہیں
اور پال لگائی جاتی ہے/ راتوں کے بان کے بستر پر
تہذیب کے گونگے جسموں کی
سنجاب بچھائی جاتی ہے
ہر چیز سجل لگتی ہے/ مگر/ اک ہرا بھرا شاداب بدن
دیکھے میں گھنیرا لگتا ہے/ اور اندر گلتا جاتا ہے
گردش میں لہو کی/ رتہ درتہ
اک ریت اترتی آتی ہے
اور سلوٹ سلوٹ سانسوں میں
بے رحم گھنے سناٹے کی/ اک کائی سے
جمتی جاتی ہے/ سمجھوتے کے
چکنے اجلے دالانوں میں/ اک جسم دھرا رہ جاتا ہے
اور/ اندر اندر اک دیمک
ساری رونق کھا جاتی ہے

◀◀ ● ▶▶

225 webb Drive، Mississauga ON
Canada L5B 4P2

● سیمیں درانی

رازِ ازل

کوئی نہ جانے
راز ازل کا
کہ،
دل جب ماتم کرتا ہے
وہ خوشی کا لبادہ اوڑھے
ہنسی کی جھنکار کی چلمن پیچھے
بال پھیلائے راکھ سجائے
دن رات،
آہ وزاری کرتا ہے
اس کے بین سن سن
گھائل روح
کلبلاتی پھرتی ہے
پھر خاموشی سے،
آنکھوں کے دریا پہ
اپنی پھونک سے
پل باندھنا شروع کر دیتی ہے
کہ اگر
ایک بھی ریلا باہر نکل پڑا
تو بھید ازل کا
کھل جائے گا

جسم کا خاکی
یہ تمام تماشا،
سہہ نہیں پاتا
دوا دارو پیتا ہے
مگر
کوئی دنیاوی شے
سکون نہیں دے سکتی
اور وہ
ہر وقت آہ اور چاہ کی آگ میں جلتا اور چٹختا رہتا ہے
کبھی سیاہ پڑتا ہے تو کبھی پیلا
ہم، طبیب ڈھونڈ ڈھونڈ ہار جاتے ہیں،
دوا تو خاکی کو میل کھائے
مگر، دل لاچار
خاموشی سے
اس کو آنسوں کے سمندر میں انڈیلتا رہتا ہے.....
اور ہم، افاقہ نہ ہونے کا شور مچا دیتے ہیں.....
روح خاموشی سے تماشا دیکھتی ہے،
اور کدال لیے
دل میں ہر ایک لمحے،
ایک قبر کھودتی ہے
اور کوئی نہ کوئی یاد
دفناتی جاتی ہے
ہمارا مالک ہمارا آقا
دماغ،
یادوں کے قبرستان کا داروغہ

مصروف سعی لاحاصل میں
کہ،
تمام مرقدوں کی
دیکھ بھال ہوتی رہے.....
تاکہ کسی یاد کی لاش سے
تعفن نہ اٹھے.....
یہ وہ قبرستان ہے،
جس میں،
کبھی بھی
جگہ کی قلت نہیں ہوتی.....
اور ہمارے دل کے ٹکرے مانند لوح
آویزاں ہوتے ہیں.....
اکثر، ہمیں جب،
کوئی یاد ستاتی ہے
تو،
لوح دل
سسک کے رسنے لگتی ہے.....
اور
ہماری روح کے اوراق پر وہ یاد،
خون قلم سے
راز ازل کو لکھتی ہے.....

◀◀ ● ▶▶

C/o Mr. Md. Ali Bhuttu
Bungalow: C-105, Block -15
Gulshan-e-Johar Karanchi
Pakistan

● ارشد جمیل

شمس الرحمٰن فاروقی: ایک مختصر جائزہ

گذشتہ نصف صدی سے شمس الرحمٰن فاروقی کا نام علم وادب میں محتاج تعارف نہیں ہے۔ وہ بیک وقت بلند پایہ ادیب جید ناقد، ممتاز ادبی صحافی، منفرد افسانہ نگار، باصلاحیت مترجم و باشعور مبصر ہیں۔ علمی تبحر، عمیق مطالعہ، ناقد، عروض داں ادیب وشاعر ہونے کے علاوہ اردو لفظیات پر عبور، تلفظات پر تحقیق نیز اردو، ہندی، فارسی، عربی، انگریزی، فرینچ زبانوں پر عبور رکھنے والے فاروقی صاحب آج ایک محقق اور صاحب طرز ادیب ہیں جنھوں نے اپنی علمی اور عملی زندگی کو خدمت ادب کے لیے وقف کر رکھا ہے۔

فاروقی صاحب اردو ماہنامہ ''شب خون'' الہ آباد کے بانی و مرتب ہیں۔ ''شب خون'' جیسے رجحان ساز وتاریخ ساز رسالے کی انفرادیت واہمیت کا ذکر دو چار جملے نہیں بلکہ ایک دفتر چاہتا ہے۔ فاروقی صاحب کی سرپرستی میں شائع ہونے والا رسالہ ''شب خون'' ان کے مضامین یعنی جدیدیت کی علمبرداری اور نئے ادبی مسائل پر بحث کے لیے تمام اردو دنیا میں مشہور ہے۔

اس رسالے نے اردو کے تمام جدید لکھنے والوں کو متاثر کیا اور جدید ادبی نظریات وتصورات کی ترویج واشاعت کی ہے۔ اس رسالے کی اہمیت وانفرادیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے بند ہو جانے کے قریب دس سال بعد بھی ادب کے سنجیدہ قاری وقلم کار ماتم کناں ہیں۔ فاروقی صاحب نے اس کے معیار ومزاج کی برقراری میں عمر عزیز کے چالیس سال لگا دیے اور اس کے وسیلے سے لکھنے والوں کو نئی فکر، نئے رجحان واحساس سے نہ صرف روشناس کروایا بلکہ ان کی فکری وتخلیقی تربیت بھی فرمائی۔ زندگی کی راہ میں نئے انداز اور اسرار ورموز کی طرف توجہ دلائی تاکہ ادب وتنقید کی یہ روشنی اردو ادب کو اوج ثریا تک لے جا سکے۔

فاروقی صاحب اپنے منفرد تنقیدی اور ادبی شعور ورجحان کی وجہ سے ایک نمایاں حیثیت کے حامل ہیں۔ فاروقی صاحب کا قابل قدر وصف ان کا انداز بیان ہے۔ ادبی مسائل پر ان کی رائے بہت صاف اور سوچی سمجھی ہے اس لئے وہ اپنی بات وضاحت اور اعتماد کے ساتھ کہتے ہیں۔ ان کا انداز استدلالی ہے۔ وہ اپنی رائے کو دلیلوں سے مضبوط بناتے ہیں اور اس رائے کے خلاف جتنی باتیں کہی جا سکتی ہیں وہ خود ایک ایک کر کے پیش کرتے ہیں۔ اپنی پر وقار علمیت، مدلل انداز تحریر اور منطقی مباحث کے ذریعہ اپنے قارئین و

سامعین کو اتنی شدت سے متاثر کرتے ہیں کہ ادیبوں اور شاعروں کا ایک بڑا حلقہ ان کے خیالات کی اشاعت وترجمانی میں شامل ہو گیا۔ محض نئی نسل سے تعلق رکھنے والے ہی نہیں بلکہ بہت سے بزرگ شاعر و ادیب اور نقاد بھی ان کے ہمنوا بن جاتے ہیں۔ انھوں نے مارکسی نظریات سے انحراف کر کے ایک جدید ادبی اور تنقیدی رجحان کی اشاعت کی طرف توجہ دی۔ اور شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان کی انفرادی وشعوری کوشش کے نتیجے میں ایک پوری تحریک ابھر کر سامنے آ گئی جسے جدیدیت کی اصطلاح سے شہرت ملی۔ فاروقی صاحب جدیدیت اور ادب کے مسئلے پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جدیدیت تمام فلسفوں اور نظریات حدود کے کے توڑنے کا نام ہے وابستگی ہی اس کی وہ خصوصیت ہے جو اسے پچھلے تمام ادبوں سے ممتاز کرتی ہے گذشتہ ادب سے اگر اس کا سلسلہ کہیں ملتا ہے تو وہ وہیں جہاں ادیب نظریے اور فلسفے سے بالاتر ہو گیا ہے۔'' (۱)

فاروقی صاحب کا تخلیقی ذہن جو نت نئے مباحث پیدا کرتا رہا اس کی وجہ سے آج بھی مختلف رد عمل سامنے آ رہے ہیں۔ غرض کہ فاروقی صاحب کے تنقیدی تصورات نے بحث کے اتنے پہلو پیدا کر دیے کہ اگر ان کے ہم خیالوں کا حلقہ بڑھا تو ان سے مخالفت کرنے والوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔

فاروقی صاحب کی تنقیدی بصیرت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ ہر شخص ان کے خیالات ونظریات سے سو فیصد متفق ہوں۔ فاروقی صاحب کی تحریروں کے متعلق پروفیسر شارب ردولوی ''جدید اردو تنقید اصول ونظریات'' میں لکھتے ہیں۔

''شمس الرحمٰن کی طول بیانی اور سوال در سوال پیدا کرنے کا انداز اکثر کسی نہ کسی نتیجے پر پہنچنے میں مانع ہوتا ہے۔ مضمون لکھتے وقت بعض وقت انھیں خود اس کا احساس ہوتا ہے کہ طوالت اور سوالات کی بہتات نے بات کو الجھا دیا ہے اور ایسی صورت میں قاری کی مدد کے لیے وہ تمام مباحث کو اختصار کے ساتھ نمبر دے کر دوبارہ قلم بند کرتے ہیں لیکن آگے جب بات شروع ہوتی ہے تو پھر وہ اسی طرح کی تفصیل اور سوالات کا شکار ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کی تحریریں ادب کے موجودہ مسائل پر گہری فکر اور توجہ کا نتیجہ ہیں۔'' (۲)

فاروقی صاحب کی تنقید کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ یہ اختلاف اور مکالمے پر اکساتی ہے۔ ان کے مضامین پڑھ کر اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ ادب کے ترقی پسند یا مارکسی نظریے کی تردید ان کے بنیادی مقاصد میں سے ایک ہے۔ یہ مخالفت بعض جگہ تقابلی بن گئی ہے۔ بعض جگہ تاثراتی، اور بعض جگہ توضیحی جس کی وجہ سے ان کے تنقیدی مضامین ذاتی پسند وناپسند کی الگ شکل معلوم ہوتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں ان کے یہاں اکثر تنقیص، نکتہ چینی اور رائے زنی کا پہلو پیدا ہو گیا ہے۔ بعض جگہ ان کا تجزیاتی انداز سائنٹفک ضرور معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جذباتی لب ولہجہ کی وجہ سے دور تک وہ اس کا ساتھ نہیں دے پاتے۔ جس کی طرف

اشارہ کرتے ہوئے پروفیسر عتیق اللہ صاحب اپنے مضمون ''تنقید در تنقید: در باب فاروقی'' میں لکھتے ہیں۔

''فاروقی جب بھی ایک کا تقابل کسی دوسرے کے ساتھ کرتے ہیں تو فاروقی کی تنقید کو دلچسپی سے پڑھنے والا طالب علم فوراً یہ سمجھ جاتا ہے کہ اب بجلی کس پر گرنے والی ہے۔ میر کے مطالعے کے دوران انھوں نے جتنے شعراء اور ان کے کلام کا حوالہ دیا ہے انھیں بڑے علمی اعتماد اور حسن وخوبی کے ساتھ میر کے سامنے چت کر دیا ہے۔ مثلاً فیض، فراق، مجاز یا افسانے کے بارے میں انہوں نے جو رائے قائم کی ہے اس نے بہتوں کو شدید صدمہ پہنچایا اور دراصل صدمہ پہنچانا ہی فاروقی کا مقصد بھی تھا۔ ممکن ہے فاروقی نے اپنی طرف متوجہ کرنے کی غرض سے یہ باتیں کہیں۔ بلاشبہ ان کا مقصد بعض چیزوں کو رد اور بعض چیزوں کو بحال بھی کرنا تھا۔ وہ جھوٹ جو بالغ ہو چکے تھے اور جن کی جڑیں گہری پیوست ہو گئیں تھیں انہیں اکھاڑ پھینکنا بھی ضروری تھا لہٰذا انھوں نے یقیناً بہت سے مغالطے رفع کیے ہیں۔'' (۳)

فاروقی صاحب کی تنقید نگاری کے بارے میں وارث علوی صاحب کو شکایت ہے کہ نہ صرف مختصر افسانہ بلکہ فراق اور منٹو کے بارے میں بھی انھیں فاروقی کے سخت بیانات سے تکلیف پہنچی ہے۔ اور یہ کہ فاروقی نے فراق اور منٹو وغیرہ کے تعلق سے رواداری سے کام نہیں لیا ہے۔ جب کہ فضیل جعفری ''کمان اور زخم'' میں لکھتے ہیں۔

''فاروقی نے فراق کے بارے میں یا پھر یگانہ کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ میرے لیے بھی اتنا ہی تکلیف دہ ہے جتنا وارث علوی کے لیے وجہ البتہ مختلف ہے۔ وارث علوی کو یہ غم ہے کہ ان کے محبوب فنکاروں کے ساتھ رواداری نہیں برتی گئی۔ مجھے کوئی غم ہے تو یہ کہ میرا محبوب نقاد جس نے بڑی محنت اور لگن سے تنقید کو خاصی حد تک سائنسی اور معروضی وقار بخشنے میں کامیابی حاصل کی تھی آخر کار خود کو اپنے تنقیدی اعتبار پر جذباتی انتہا پسندی کی کلہاڑی چلانے سے نہیں روک سکا۔'' (۴)

''فراق کے متعلق فاروقی کے ارشادات پر مزید تبصرے کی خاصی گنجائش ہے لیکن چونکہ یہ موضوع ایک علیحدہ مضمون کا متقاضی ہے۔ اس لیے فی الحال صرف اتنا کہہ دوں کہ اس قسم کے مضامین سے فاروقی کی تنقیدی ساکھ کو خاصا دھکہ پہنچا ہے۔ لوگ اب ان کی ایسی تحریروں کو پڑھ کر ہنستے نہیں تو مسکرانے ضرور لگے ہیں۔'' (۵)

اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ وہ زبردست عالم ہیں اور موجودہ عہد میں اردو کے دانشوروں میں سرفہرست ہیں۔ لیکن انھوں نے جب چاہا ادب کی کسی صنف، کسی تحریک، کسی تصور کو اپنے عین تصور کے مطابق بڑی ذہانت کے ساتھ الٹ پلٹ کر رکھ دیا اور جب چاہا اپنے ہی نظریے کی نفی کر کے پرانی بات دہرا دی یہ ذہانت کے کرشمے ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ انہوں نے فراق گورکھپوری کے تعلق سے جو مضامین قلم

بند کیے تھے اس پر تو بڑی لے دے ہوئی کہ فاروقی صاحب نے فراق کا موازنہ ناصر کاظمی اور احمد مشتاق سے کر ڈالا۔ لیکن آج تک اس کی رد میں کوئی ایسی تحریر سامنے نہ آسکی جو فاروقی صاحب کے معروضات کو دلائل اور حوالوں سے مسترد کر سکے۔ ان پر اب تک سوائے جذباتی اور تاثراتی بیانات کے کچھ بھی ایسا نظر نہیں آیا جو فاروقی صاحب کے دعوے کی تردید کرتا ہو۔

ہمارے یہاں اکثر نقادوں کے پاس ابھی تک تنقید کے طے شدہ فارمولے اور بنے بنائے سانچے ہیں جن میں صرف وہی نام فٹ آتے ہیں جو ان کے گروہی نظریات وافکار کے عین مطابق اور ذاتی مفادات وتعلقات کے دائرے میں آتے ہوں۔ شخصیت پرستی، گروہی عصبیت اور انتہائی جانب دارانہ توصیف یا تنقیص، ذاتی پسند اور ناپسند کی بنیاد پر ادبی فیصلے کرنے کا جو چلن ہے کیا اسے تنقید کا بحران کہا جائے؟ سچ تو یہ ہے کہ اس طرز عمل نے اردو ادب کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ بلاشبہ ان باتوں کا اطلاق تمام نقادوں اور ادیبوں پر نہیں ہوتا۔ ایسے وسیع المطالعہ، وسیع النظر اور صاحب علم نقاد بھی ہیں جو عصری وادبی تقاضوں کا مکمل ادراک وفہم رکھتے ہیں ان پر یہ ذمہ داری عاید ہوتی ہے کہ وہ فاروقی صاحب کی ذاتی زندگی سے قطع نظر ان کے ادبی کارناموں کا سنجیدگی سے مطالعہ کریں۔

فاروقی صاحب پر متفرق طور پر بہت کچھ لکھا گیا ہے کئی کتابیں بھی ہیں جس میں خود فاروقی صاحب کی بعض نادر تحریریں بھی شامل ہیں لیکن ان تمام تحریروں میں فاروقی صاحب کی زندگی ان کی شخصیت اور شخصیت کے ناپسندیدہ پہلوؤں پر ان کے ادبی کارناموں سے زیادہ لکھا گیا ہے۔ ہماری کم نصیبی کہ ہم نے فاروقی صاحب پر اس طرح توجہ نہیں دی جس کا بجا طور پر استحقاق رکھتے ہیں۔ ان کی شخصیت اور ذاتی زندگی کے بارے میں جھوٹی سچی کہانیاں تو زیر بحث آتی رہیں مگر ان کے ادبی کام پر سنجیدگی سے نہیں لکھا گیا۔ جب کہ مجھے آج تک ان کا کوئی ایسا مخالف نہیں ملا جو ان کی علمیت، انسانیت اور عالمانہ فضیلت کا معترف نہ ہو۔

انھوں نے گذشتہ پچاس برسوں میں تقریباً پچاس کتابیں لکھی ہیں جن میں خاص طور سے لفظ و معنی، شعر غیر شعر اور نثر، افسانے کی حمایت میں، تنقیدی افکار اور شعر شور انگیز وغیرہ ایسی کتابیں ہیں جن کے زریعہ اردو تنقید کا مزاج ورجحان بدل گیا۔

یہ ان کی غیر معمولی تخلیقی وتنقیدی صلاحیت کا اثر ہے کہ اثبات ونفی، اردو کا ابتدائی زمانہ وافسانوں کا مجموعہ ''سوار اور دوسرے افسانے'' شاعری کا مجموعہ سبز اندر سبز، گنج شوختہ، آسماں محراب وغیرہ نے اردو ادب میں ان کی شخصیت کو مزید مضبوط اور مستحکم بنا دیا ہے۔ اس کے بعد بھی ادب میں فاروقی صاحب کی متعدد فکر انگیز کتابیں منظر عام پر آئیں جن میں ایک مشہور ناول ''کئی چاند تھے سر آسماں'' بھی سرفہرست ہے۔ اور لکھنے پڑھنے کا یہ سلسلہ ہنوز بدستور جاری ہے۔

فاروقی صاحب ان خوش نصیب فنکاروں میں سے ہیں جو اپنی زندگی میں ہی شہرت ومقبولیت میں بام عروج پر پہنچ گئے۔ان کو دنیائے ادب کے ان سبھی قومی و بین الاقوامی اعزازات وانعامات سے نوازا گیا جو ادباء وشعراء کے لیے باعث عزت وافتخار سمجھا جاتا ہے۔

۱۹۹۶ء میں ''سرسوتی سمان'' جو برصغیر کا سب سے بڑا ادبی اعزاز ہے فاروقی صاحب کی شاہکار تصنیف ''شعر شور انگیز'' پر دیا گیا۔اردو ادب کے لیے یہ بڑے فخر کی بات ہے کہ اردو کے کلاسیکی شاعر میر تقی میر پر اتنا بڑا اسمان دیا گیا۔فاروقی صاحب نے اس کارنامے سے ثابت کر دیا کہ ہمارا کلاسیکی ادب دنیا کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے مقابلے کسی طرح کم نہیں ہے۔

۲۶ فروری ۲۰۰۲ء کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے اپنی ۵۳ ویں سالانہ جلسہء تقسیم اسناد میں فاروقی صاحب کی علمی وادبی خدمات کے اعتراف میں انھیں ''ڈی۔لٹ'' کی اعزازی ڈگری سے سرفراز کیا۔

اس کے علاوہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد نے بھی ۲۰۰۶ء میں انہیں ''ڈی۔لٹ'' کی اعزازی ڈگری سے نوازا۔۲۰۰۹ء میں حکومت ہند نے ہندوستانی ادب کے خدمات کے اعتراف میں ہندوستان کا چوتھا سب سے بڑا Civillian Award ''پدم شری'' فاروقی صاحب کو دیا گیا۔ان کی علمی اور ادبی شخصیت کا اعتراف کرتے ہوئے پاکستانی حکومت نے بھی پاکستان کے دوسرے سب سے بڑے Civillian Award ''ستارہ امتیاز'' سے نوازا۔

لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ فاروقی صاحب پر سستے اور سطحی تبرّے کے بجائے ان کا معروضی مطالعہ کیا جائے اور ان کے ادبی کارناموں کی روشنی میں ان کی قدر و قیمت اور اہمیت کو واضح کیا جائے۔

حوالہ جاتی کتب

۱۔جدیدیت اور ادب — مرتب آل احمد سرور — ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی

۲۔جدید اردو تنقید اصول ونظریات — پروفیسر شارب ردولوی — اتر پردیش اردو اکادمی ۲۰۰۲ء ص ۵۰۴

۳۔کاروان ادب (خصوصی شمارہ) — مرتبین کوثر صدیقی جاوید یزدانی ۲۰۰۳ء ص ۲۱۰

۴۔کمان اور زخم — فضیل جعفری قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی ۲۰۰۸ء ص ۲۷۳

۵۔کمان اور زخم — فضیل جعفری قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی ۲۰۰۸ء ص ۲۷۸

Research Scholar,
Allahabad University,Allahabad

● پروفیسر علی رفاد فتیحی

جانکی اور نسائی جنسیت کا شعور

منٹو کی کہانی جانکی میں ایک عام سی عورت کی عام سی زندگی کی تصویر اس طرح نقش ہوتی ہے کہ ایک خوبصورت کہانی تخلیق ہو جاتی ہے۔اور اس پر طرہ یہ کہ کہانی کا بظاہر کوئی خاص تانا بانا نظر نہیں آتا۔کوئی ایسا واقعہ نہیں کہ تجسس بنا رہے کہ آگے کیا ہوا۔مگر پھر بھی یہ ایک مضبوط کہانی اس لئے بن گئی کیوں کہ اس کے بیانیہ میں واقعات وحالات میں تبدیلی صاف طور پر نظر آتی ہے۔جہاں ایک بھی واقعہ ہوتا ہے، وہاں ایک کہانی ہوتی ہے اور ایک واقعہ سے دوسرے واقعہ میں منتقلی بیانیہ کو مضبوط بناتی ہے، اس پس منظر میں جب ہم جانکی پر نظر ڈالتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ اس افسانہ میں جانکی کا کردار عورتوں کی اس روائتی تصویر سے مختلف ہے۔ جانکی ایک آزاد وخود مختار وجود ہے اور اپنے ہر عمل کے فیصلے آزادانہ طور پر کرتی ہے اور اپنے ہر عمل میں پر خلوص نظر آتی ہے۔

لیکن جانکی پر کسی بھی گفتگو سے پہلے شاید یہ سمجھنا ضروری ہے کہ ہندوستان میں عورتوں نے کس طور پر نسائیت کے ارتقائی سفر اور نسائیت کی تبدیل شدہ شناخت کو کن تصورات سے ہم آہنگ کیا ہے۔یا پھر یہ کہ آج عورتیں کس طور پر اپنی انفرادی نسائی شناخت کو اظہار ذات کے بیانیہ میں تبدیل کر پاتی ہیں۔

بیسویں صدی کی پہلی دو دہائیوں میں یہ سوال اور بھی اہم ہو جاتے ہیں کیوں کہ اس دور میں نئے تصورات کا اظہار زمان ومکان کے تقاضے کے طور پر دیکھا جاتا رہا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس دور میں عورتوں پر لکھی گئی زیادہ تر کہانیوں میں نئے تصورات کو براہ راست نہیں پیش کیا گیا ہے بلکہ اس کے اظہار کے لیے نسائی جنسیت کے حوالے پیش کیے گئے ہیں جو نئے خیالات کے نسائی شناخت کا تصور پیش کرنے میں کارگر ثابت ہوتے ہیں۔نسائی جنسیت کا یہ نیا تصوّر نئے ہندوستان کی تصویر سے مکمل ہم آہنگی رکھتا ہے۔گو یہ حقیقت ہے کہ نسائی جنسیت کا تصوّر واحد ایسا وسیلہ نہیں ہے جس کے ذریعے تبدیل شدہ نسائی شناخت کی تصویر پیش کی جا سکے۔لیکن اس کے باوجود نسائی جنسیت کو جا بجا نئے تصورات کے اظہار کا وسیلہ بنایا گیا۔

اس پس منظر میں زیرِ نظر تجزیہ جانکی کے بیانیہ کو نسائی ڈسکورس کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ نسائیت اور نسائی شناخت کے ارتقائی سفر کو بخوبی سمجھا جا سکے۔ بیسویں صدی کی پہلی دہائی تک نسائی جنسیت کو ایک مغربی تصوّر سمجھا گیا۔ لیکن اس کا یہ قطعی مفہوم نہیں کہ مغربی ادب سے مکمل ہم آہنگی سے پہلے ہندوستانی ادب میں جسمانی یا ذہنی رشتوں، جنس یا نسائی جنسیت کے حوالے نہیں ملتے ہیں لیکن یہ بھی سچ ہے کہ مغربی ادب کے زیرِ اثر ہندوستانی ادب اور بالخصوص اردو ادب میں جنس کے روائتی تصوّر سے گریز کی صورت ملتی ہے۔ شائد یہی وجہ تھی کہ بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں ایسی کئی کہانیاں سامنے آئیں جنھوں نے نسائی جنسیت کے ایسے کئی پہلوؤں کو اجاگر کیا جو اب تک مخفی اور پوشیدہ تھے۔ اس تبدیلی کی بنیادی وجہ وہ فنی نسائی شناخت تھی جو بتدریج قبولیت کے مرحلے سے گزر رہی تھی۔ جدید کاری کے اثرات نہ صرف عوامی سوچ یا پبلک ڈومین (public domain) میں نظر آ رہے تھے بلکہ خواب گاہ بھی اس کے اثرات سے اچھوتے نہ تھے۔ جس کے زیرِ اثر نسائی جنسیت پر بھی اس کے اثرات نمایاں طور پر نظر آنے لگے۔

ہندوستان کے روائتی ادب پر مردانہ تعصب و تسلط (Male Chauvism) پر مبنی سوچ اور رویے کے اثرات واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ روائتی ادب میں عورتیں دوہرے، بلکہ تہرے جبر کا شکار نظر آتی ہیں۔ کام کرنے کی جگہ، معاشرے اور خاندان میں عورتوں کو نہ صرف متعصّبانہ رویوں کا نشانہ بنایا جاتا ہے بلکہ جنسی طور پر ہراساں کیا جاتا ہے۔

روائتی تجارتی سوچ کا المیہ یہ ہے کہ وہ عورت کو تجارتی مال (commodity) اور کاروباری تشہیر کے ایک ذریعے سے زیادہ خیال نہیں کرتی۔ اگر مذہبی سوچ عورت کو ذاتی ملکیت اور غلام تصور کرتی ہے تو آزاد خیال اشرافیہ اسے کاروبار کی تشہیر کے لئے ایک آلہ کار کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ اگر رجعتی ذہنیت رکھنے والوں کا عورتوں پر ظلم و جبر غیر انسانی فعل اور غلامی ہے تو عورتوں کے جسموں کو اشیاء بیچنے اور منافع کمانے کے لئے استعمال کرنا بھی ان کی نجات نہیں ہے

اس کے برعکس جانکی میں جانکی کا کردار روائتی نسائی شناخت سے مکمل انحراف ہے۔ اور ایک ایسی نسائی شناخت کی تصویر پیش کرتا ہے جو معاشرتی اور اخلاقی ضوابط سے بے نیاز ہے اور دورِ حاضر کے نیے تصوّرات سے مکمل ہم آہنگی رکھتا ہے۔ گویا جانکی کا کردار پیراڈائم شفٹ کا اعلانیہ ہے۔ جانکی کا بیانیہ نسائی جنسیت اور تصورِ نسائیت کے متعلق ہم عصر تصوّرات پیش کرتا ہے اور مردانہ تعصب و تسلط پر مبنی کی منفی سوچ اور رویے پر سوال اٹھاتا ہے۔ یقیناً ان female of trajectory normative development

انقلابی تصوّرات کی قبولیت مشکوک ہوتی ہے۔ شائد یہی وجہ ہے کہ جانکی کا کردار بھی اس طور پر نہیں دیکھا جا سکا جس کا وہ مستحق تھا۔ آج جانکی کا کردار نہ صرف ہمیں تصوّرِ نسائیت کے ارتقائی سفر کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوتا ہے بلکہ نسائیت اور نئے تصوّرات کے آپسی رشتے کو بھی سمجھنے میں اس سے مدد ملتی ہے۔ افسانوی ادب کے نسائی کردار سماجی رشتوں کو سمجھنے میں ہمیشہ کارگر ثابت ہوتے ہیں کیونکہ ان نسائی کرداروں کی شخصیت کی لچک انھیں کبھی پری موڈرن (Pre-modern) معصوم نوسٹلجک (Nostalgic) روائتی تصویر میں پیش کرتی ہے تو کبھی موڈرن (modern) عصری تصویر میں۔ میری نظر میں جانکی میں نیے تصورات کی نسائی شناخت شعوری یا "constructionist" ہے۔ کیونکہ نیے تصورات کے شعور کے اظہار کے لیے جانکی تین مردوں: عزیز، سعید اور نرائن سے محبت کرتی ہے۔ عزیز اور سعید سے بیک وقت اور نرائن سے اس وقت جب عزیز اور سعید اسے چھوڑ جاتے ہیں۔ افسانے میں جانکی کی پہلی دو محبتوں کی تفصیل ملتی ہے اور تیسری محبت کی محض قوی شہادت پیش کرنے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ جانکی کا بہ یک وقت دو مردوں سے محبت کرنا اور اور ان سے مایوس ہونے کے بعد پھر نرائن کی محبت میں مبتلا ہونا، سماج کی حاوی اخلاقی آئیڈیالوجی کی رو سے سخت معیوب ہے کیونکہ عورتوں کی طرف تعصب و تفریق پر مبنی رویے ان سماجی رشتوں سے برآمد ہوتے ہیں جو لالچ اور ہوس پر مبنی معیشت تخلیق کرتی ہے۔ لہٰذا یہ رویے جو سماجی نفسیات میں گہری سرایت کر چکے ہیں دراصل اس سماجی نظام کی پیداوار ہیں جو انہیں پروان چڑھاتا ہے۔ جانکی کا طرزِ عمل مشرقی عورت کے اس تصور سے بری طرح متصادم ہے، جس کے مطابق عورت زندگی میں فقط ایک مرتبہ محبت کرتی ہے اور پھر پوری عمر اس محبت کے استحکام یا اس کی یاد میں بہ خوشی بسر کر دیتی ہے۔ اس مشرقی روائتی نظام میں گھریلو کام کاج اور خواتین کی جانب سے کی جانے والی دوسری کئی طرح کی محنت و مشقت کا کوئی معاوضہ نہیں ہوتا۔ گھر بار اور اہلِ خاندان کا خیال رکھنا، بچوں کی پرورش اور تربیت اور اس طرح کے دوسرے بے شمار کام یہ نظام عورتوں سے بلا اجرت لیتے ہوئے ان کے سماجی رتبے اور معاشی حالات میں ابتری کا باعث بنتا ہے اردو کے روائتی افسانے عام طور پر عورت کے اسی تصوّر کو پیش کرتے ہیں۔

منٹو نے اس افسانے میں جانکی کے کردار کے ذریعے اس تصوّر کو بلند بانگ انداز میں ردّ کرنے کا بیانیہ پیش کیا ہے۔ نسائیت کے اس نیے تصوّر کے مطابق عورت ایک وقت میں ایک سے زائد مردوں سے محبت کر سکتی ہے اور اپنی ہر محبت میں ایک جیسی گرمیِ جذبات کا مظاہرہ کر سکتی ہے۔ جانکی جس اخلاص کے ساتھ عزیز کو خط لکھتی ہے، اسی اخلاص کے ساتھ سعید کو ٹیلی گرام پہ ٹیلی گرام بھیجتی ہے اور اسی گرمیِ جذبات کا مظاہرہ وہ نرائن کو بالآخر اپنانے کی صورت میں بھی کرتی ہے۔

اگر اس تھیم کو منٹو کے تصوّر نسائیت اور نسائی جنسیت کے بیانیے سے ہٹ کر دیکھیں تو جانکی ایک عیاش عورت کے طور پر سامنے آتی ہے، لیکن اگر اسے افسانے کے تصوّر نسائیت اور نسائی جنسیت کے بیانیاتی تناظر میں دیکھیں تو وہ محض ایک جوان عورت ہے جو اپنی ذات کا اثبات ایک مرد کے ساتھ پرخلوص رشتے کی صورت میں دیکھتی ہے۔ اس کے لیے اصل اہمیت ''پرخلوص رشتے'' کی ہے۔

جانکی کو نسائیت کے ساختیہ کے طور پر دیکھنے کی صورت میں محسوس ہوتا ہے کہ دور حاضر میں تصوّر نسائیت ایک ایسا تصوّر ہے جس کے سامنے مرد کا انفرادی وجود پرچھائیں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ جانکی کے نزدیک تینوں مردوں کی انفرادی شخصیتیں ایک لحاظ سے بے معنی ہیں۔ عزیز شادی شدہ ہے لیکن اس کے باوجود extra marital affair میں یقین رکھتا ہے۔ جانکی اس حقیقت سے واقف ہونے کے باوجود اپنے رشتے میں پرخلوص ہے کیونکہ وہ عزیز کی بیوی کو بدمزاج سمجھتی ہے۔ سعید عیاش اور بدمزاج ہے، اور اس کی بدمزاجی جانکی سے اس کے رشتے میں واضح طور پر نظر آتی ہے۔ جانکی کی نظر میں نرائن کی شخصیت بے معنی ہے۔ لیکن حقیقتاً وہ لاابالی لیکن caring ہے۔ افسانہ جانکی کے کرداروں کو اگر ذرا مزید گہرائی سے دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ خود جانکی کا کردار تصوّر نسائیت اور نسائی جنسیت کے تصوّر سے مستحکم ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے تصور نسائی جنسیت کو اپنے رشتوں میں آڑے آنے نہیں دیتی۔ جانکی کی نسائی جنسیت کا یہ تصوّر نسائی جنسیت کے متعلق روائتی سوچ کے خلاف ایک احتجاجی آواز ہے۔ جانکی کی یہ سوچ گنجلک نظر نہیں آتی بلکہ افسانے میں جا بجا اس سوچ کا اظہار کرتی ہے۔ افسانے میں جب وہ یہ کہتی ہے:

''بچّے پسند ہیں لیکن کون پالتا پھرے۔''

میں نے کہا: ''آپ کو معلوم ہے اس طرح بچّے ضائع کرنا جرم ہے۔''

وہ ایک دم سنجیدہ ہوگئی۔ ''سعادت صاحب میں پوچھتی ہوں، اس میں جرم کی کون سی بات ہے، اپنی ہی تو یہ چیز ہے اور قانون بنانے والوں کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ بچہ ضایع کرتے ہوئے تکلیف کتنی ہوتی ہے۔''

اس مکالمے میں وہ ایک مضبوط اور انحراف پسند شخصیت کے طور پر ابھر کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ جانکی کی نظر میں جنسی خواہش کی تکمیل کے جذبے کا مقصد حیاتی قطعی نہیں ہے۔ اس کی نظر میں اس خواہش کی کبھی کبھار تسکین ہوتی رہے تو کافی ہے۔ لیکن نفسانی خواہش کے حیاتی مقصد سے وہ واضح لفظوں میں انکار کرتی ہے۔ اس کے برعکس قدیم وحشی تہذیبوں میں جنسی تعلقات جانوروں کے سے تھے۔ قوت

شہوانی مرد کی امتیازی خصوصیت تھی اور عورت محض لذت کشی کا آلہ اور بچے جننے کی مشین تھی کیونکہ بوقت ضرورت اس خواہش کی تکمیل سے

انسانی نسل قائم رہتی ہے۔ یہ ایسے حقائق ہیں جن سے ہر کس و ناکس واقف ہے۔ اس طرح یہ حقیقت بھی سب پر آشکارا ہے کہ جنسی خواہش کی تکمیل سے بے حد مسرت حاصل ہوتی ہے اور انسان کا ذہن اس راحت کو اس قدر پرکیف اور گوناگوں بنا دیتا ہے کہ اسے بھوک اور پیاس سے تشبیہہ دینے لگتا ہے انسانی تہذیبوں کی تاریخ کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ قدیم مرد، جنس اور مذہب میں بہت قریبی رشتہ سمجھتا تھا۔ رومن مذہبی عقیدے کے مطابق محبت کی دیوی وینس (Venus) یا زہرہ، اناج کی دیوی سیریز (Ceres) وغیرہ کی آفرینش اور فرائض کا تعلق جنسیات سے تھا۔ اسی طرح ہندو مذہبی عقیدے میں کامدیو اور رتی کا تعلق جنسیات سے تھا۔ آج بھی اگر ہندوستان کی لوک مذہبی رسومات کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ زمین کی زرخیزی، سورج کی زندگی بخش روشنی اور دوسری مادی مظاہر فطرت کو پیچیدہ اور مسرت بخش نفسیاتی جذبات اور پراسرار جنسیت اور مادریت سے براہ راست وابستہ سمجھا جاتا ہے گویا جنسیت انسانی ذہن مین ایک نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اس افسانے میں جانکی کا کردار اپنے انقلابی اور آزادانہ جنسی رویّوں کے حوالے سے ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ افسانے میں بطور ایک Protagonist جانکی اپنی اس ''انحراف پسند شخصیت'' کو اپنے کردار پر حاوی نہیں ہونے دیتی یہی وجہ ہے کہ وہ عورت کی روایتی نسائی شناخت پر ضرب لگانے کے باوجود ہمارے دل میں اپنے لیے نفرت نہیں ابھارتی۔ افسانے کی قرات میں ہم اسے نظر انداز کرنے یا مسترد کرنے پر خود کو آمادہ نہیں کر پاتے۔ وہ اگر ہمارے دل میں اپنے لیے ہمدردی نہیں ابھارتی، تو حقارت کو بھی تحریک نہیں دیتی۔۔ جانکی کا کردار اپنے وجود کی خودمختاری کو منوانے سے عبارت ہے۔ وہ اپنے جسم اور وجود کو اپنی ملکیت سمجھتی ہے، اور اس ملکیت کے سلسلے میں وہ سماج اور اس کی اخلاقیات کی حاکمیت کو قبول کرنے سے انکار کرتی ہے۔ مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ بہ طور کردار اپنی خودمختاری پر اصرار کے بجائے اس کی قربانی دیتی ہے اور اسی بنا پر اپنے رشتوں کو نبھانے میں کامیاب ہوتی ہے۔ وہ عزیز، سعید اور نرائن سے تعلق میں کسی بھی وقت اپنے کو نہ تو مقابل لاتی ہے اور نہ اس کے استحکام کی کسی کوشش میں مصروف نظر آتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خود اپنی شخصیت کو پس پشت ڈالنے کا مطلب یہ باور کرانا ہے کہ مرد عورت کے رشتے میں شخصیت منہا ہو جاتی ہے۔ مردوں کی شخصیتوں کے متعلق اس کا رویّہ مثبت نظر آتا ہے۔

- عزیز صاحب ہمیشہ کہتے رہے جانکی کم کھایا کرو پر میں نے ان کی ایک نہ سنی۔

- ہر خط میں تاکید ہوتی تھی کہ عزیز اپنی صحت کا خیال رکھیں
- شروع شروع میں میرا خیال تھا کہ جانکی عزیز کے متعلق جو اتنی فکر مند رہتی ہے محض بکواس ہے،۔ بناوٹ ہے،۔لیکن آہستہ آہستہ میں نے اس کی بے تکلف باتوں سے محسوس کیا کہ اسے حقیقتاً عزیز کا خیال ہے۔

اس کی شخصیت کا یہ پہلو اس کے کردار کو پیچیدہ بنا دیتا ہے کیوں کہ ایک عام سی عورت کی عام سی زندگی کی تصویر جانکی اپنی اس ''انحراف پسند شخصیت'' کو اپنے کردار پر حاوی نہیں ہونے دیتی۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جانکی ایک ایسا کردار ہے جس کے اوصاف پیچیدہ اور ہماری عمومی فکر کے طرز کو چیلنج کرنے والے ہیں یہی وجہ ہے کہ ہم آسانی کے ساتھ جانکی کے کردار پر کوئی حکم نہیں لگا پاتے۔

اس افسانے میں زبان و بیان کی سطح پر منٹو نے کچھ ایسے لسانی تجربے کیے ہیں جو موضوع سے مطابقت رکھتے ہیں۔لفظوں، فقروں، اشاروں، کنایوں، تشبیہوں، استعاروں اور ساختیوں کے استعمال کا یہی مخصوص اور منفرد انداز منٹو کو دوسروں سے جدا کرتا ہے۔منٹو کے افسانوی فن کو اگر اسلوب اور اظہار کے ان وسائل کے نقطہ نظر سے پرکھنے اور جانچنے کی کوشش کی جائے تو سب سے پہلی چیز جو پڑھنے والے کو شدت کے ساتھ متاثر کرتی ہے، وہ منٹو کا اسلوب بیان ہے۔منٹو کے پاس معمولی سے معمولی بات کے اظہار کے لیے ایک غیر معمولی انداز موجود ہے۔

مثلاً اس افسانے میں دو بار ایک ایسی شلوار کا ذکر ہوتا ہے جو جسم سے آزاد ہے۔افسانے میں جسم سے آزاد یہ شلوار نسائی جنسیت کی بے باکی اور خودمختاری کا اعلانیہ بن کر سامنے آتی ہے۔ شلوار کا زیب تن نہ ہونا نسائی جنسیت اور تصور نسائیت کے متعلق ہم عصر تصّورات کا ساختیہ بن جاتا ہے۔اور افسانے کے بیان کنندہ کی پیش کی گئی تعبیر میں بیان ہو جاتا ہے جانکی میں یہ ساختیہ پورے افسانے میں ریزوں کی صورت بکھرا ہوا ہے اور اسے تنکا تنکا جمع کرنا پڑتا ہے، تاہم اس کی تائید افسانے کی مجموعی صورتِ حال سے ہوتی ہے۔

ہر ساختیہ ایک منفرد اور مخصوص زمانی و مکانی صورتِ حال میں پیش ہوتا ہے اور تشکیل پاتا ہے، اس لیے خاص ہوتا ہے مگر اس میں اپنے حدود کو پھلانگنے کے

'' ساختیاتی امکانات'' ہوتے ہیں۔اگر ایسا نہ ہو تو یہ ساختیہ نہیں ہے۔ دوسری طرف منٹو افسانے کے خاتمہ کو اس ساختیہ کی مدد سے افسانے کے منطقی ربط کی آخری کڑی بنا کر جو کہانی کی تمہید سے شروع ہو کر برابر زیادہ منظّم بنتا رہا تھا، افسانے کی فنی زنجیر کو مکمل کر لیتا ہے۔اس افسانے کے خاتمہ کی ایک نفسیاتی اور جذباتی حیثیت ہے اور دوسری فنی۔منٹو نے جذبات، نفسیات اور فن کے رشتے جوڑنے اور انہیں

مضبوط بنانے میں اس افسانے کے انجام سے اسلوبی اور منطقی کام لیا ہے۔ اس افسانہ کے انجام میں وہی تازگی و توانائی ہے جو اس کے آغاز میں تھی اور یہ نتیجہ ہے افسانہ نگار کی اس فنی توانائی کا جو ہر مرحلہ پر اور ہر منزل میں اس کی ہم عناں اور ہم سفر ہے۔جانکی اپنی آزادی کا شعور رکھتی، اس شعور کا اظہار کرتی اور اسے اپنے آزادانہ فیصلے کرنے میں بروے کار بھی لاتی ہے، مگر اس ردّعمل کو بھی اپنے شعور سے برابر متصادم دیکھتی ہے، جو اس کی آزادی کے ضمن میں سماج ظاہر کرتا ہے۔اسی تصادم کے جواب میں وہ ایک ایسی شلوار سے جو زیب تن نہیں ہے اپنی خودمختاری کا اعلان کرتی ہے۔

◀◀ ● ▶▶

"Lisan"
Road No. 5
Iqra Colny, New Sar Syed Nagar
Aligarh (U.P)

اقبال حسن آزاد
کی
نئی تنقیدی کتاب
نثری اصناف ادب اور طنز و مزاح کی روایت
شایع ہو چکی ہے۔
صفحات: ۱۵۲
قیمت: ۳۰۰/روپے
رابطہ: ثالث پبلیکیشنز، شاہ کالونی، شاہ زبیر روڈ، مونگیر۔۸۱۱۲۰۱

● سلیم خاں

پیغام آفاقی کا ناول ''پلیتہ''

پیغام دہلی کے اپنے مکان سے نکلے تو سیدھے انڈمان پہنچے۔ اس دور دراز کے سفر سے واپس آنے میں انہیں ۲۶ سال کا طویل عرصہ لگا۔ لیکن جب لوٹے تو ان کے بغل میں ''پلیتہ'' تھا جس کی بابت ناول کے ہیرو خالد سہیل کے حوالے سے وہ فرماتے ہیں۔

'' ایٹمی توانائی سے بھرپور ایک گولہ اس کتاب میں بند ہے جو اس کی میز پر پڑی تھی اور جو خالد کے ذہن کا مکمل عکس تھی۔''

پیغام آفاقی کے ذہن کا یہ عکس اس قدر دھماکہ خیز تھا کہ خالد سہیل خود بھی اس کی زد میں آ کر دار فانی سے کوچ کر گیا مگر اس کے باوجود اس کی تصنیف حیات جاودانی سے سرفراز ہوگئی۔ اردو ادب میں ان دھماکوں کا ارتعاش تادیر محسوس کیا جائے گا۔ اور ''مکان'' ہی کی طرح اس کے تراجم ہندی، انگریزی اور دیگر زبانوں میں دستیاب ہوں گے اس لئے کہ ہر لحاظ سے اس تصنیف کو اپنے پیش رو پر فوقیت حاصل ہے۔

''مکان'' عہد حاضر کا ناول ہے۔ اس میں زمانہ نہیں بدلتا۔ اس کے برعکس ''پلیتہ'' کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ماضی کی نمائندگی شیر علی کرتا ہے اور حال کا نمائندہ خالد سہیل ہے۔ اس کے علاوہ مستقبل کا ہیرو جیلانی بھی اس میں موجود ہے۔ ان تینوں زمانوں کا فرق ہی دراصل ان تینوں حصوں کے اسلوب بیان میں اختیار کیا گیا ہے۔ ماضی دراصل ٹھوس مادہ ہے جس میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ جو گزر گیا وہ وقت کے قرطاس پر ثبت ہوگیا۔ اب وہ ایک ایسی پتھر کی لکیر ہے جو حذف و اضافہ کی صلاحیت سے محروم ہے۔ پیغام آفاقی نے ماضی کے کالا پانی کی بنیاد ٹھوس تحقیق و تفتیش اور حوالہ جات پر جمائی ہے۔

حال ایک سیال مادے کی مانند ہوتا ہے جو اس قدر لچکیلا ہوتا ہے کہ بآسانی اپنے برتن کا روپ دھارن کر لیتا ہے۔ اس ندی کا ہر قطرہ ہر لمحہ اپنی جگہ بدل دیتا ہے۔ کالا پانی جانے سے قبل اور بعد ناول کے ہیرو خالد سہیل کے حالات زندگی میں غیر متوقع تبدیلیاں علامتی نوعیت کی ہیں۔ اس کا عم زاد بھائی جمشید بھی

عدالت کے اندر اسی طرح کی آزمائشوں کا شکار ہوجاتا ہے جس طرح کی مشکلات خالد کے پردادا امیر علی کو انڈمان جانے سے قبل پیش آئی تھیں۔ خالد کی ایک نوجوان شناسہ کے ساتھ بینک کے اہلکار وہی سلوک کرتے ہیں جو کالا پانی میں سنہری کے ساتھ کیا گیا تھا۔ وہ تمام خش و خاشاک کی مثل وقت کے تیز دھارے میں آگے ہی آگے بڑھتے جاتے ہیں۔ زندگی اپنے نت نئے روپ دکھلاتی جاتی ہے اور اس کے پہلو بہ پہلو سماج کے مختلف تلخ و شیریں گوشے اجاگر ہوتے چلے جاتے ہیں۔

زمانہ حال اور مستقبل کے اندر ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ حال اگر مائع کی مانند ہے تو مستقبل امادے کی تیسری ہیت گیس کی طرح لطیف اور محیط ہے جس کو محسوس تو کیا جاسکتا ہے لیکن دیکھنا ممکن نہیں ہے۔ انسان اپنی آنکھوں سے ہوا کو نہیں مگر اس سے اڑنے والے تنکوں کو دیکھ کر اس کی سمت کا اندازہ لگاتا ہے۔ پانی اور ہوا کے بہاؤ میں جہاں یہ مشترک ہے کہ وہ اپنی رفتار بدلتے ہیں وہیں یہ اختلاف بھی ہے کہ پانی یکسوئی کے ساتھ صرف ایک رخ میں بہتا ہے اور وقت کا دھارا لوٹ کر پیچھے نہیں جاسکتا جبکہ آوارہ ہوا کے جھونکے اپنی سمت بدلتے رہتے ہیں۔ اس لیے کسی انسان کے لئے ممکن نہیں ہے کہ وہ مستقبل کی بابت کوئی متعین پیش گوئی کر سکے۔ ناول نگار کو امروز سے فردا میں جانے کے لئے پرواز تخیل کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ خالد سہیل کی موت کے بعد ناول زمانہ حال سے نکل کر مستقبل میں قدم رنجہ فرماتا ہے۔ پیغام آفاقی نے اس حصے کو بیان کرنے کے لئے بجا طور پر شاعری کی مدد لی ہے اس لئے اس میں جہاں تہ دار گفتگو کی سہولت مہیا ہوگئی ہے، وہیں معنی و مفاہیم کے امکانات وسیع تر ہوگئے ہیں۔

خالد سہیل کی زندگی اور موت کا اگر دنیوی زندگی اور اخروی حیات سے موازنہ کیا جائے تو ایک دلچسپ مماثلت نظر آتی ہے۔ اول تو یہ کہ اس دنیا کی ہر شے بشمول عرصہ حیات محدود اور فانی ہے۔ ہر لمحہ ہماری زندگی کی ایک ساعت حال سے نکل کر ماضی کے تابوت میں بند ہوجاتی ہے اور جب یہ سلسلہ تھمتا ہے تو انسان کو تجہیز و تکفین کے بعد اسی تابوت میں لٹا کر قبر کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ مستقبل کا خزانہ خالی ہوگیا۔ خالد سہیل کی موت سے ناول کا ایک باب بند ہوجاتا ہے لیکن ناول ختم نہیں ہوتا اس لئے کہ زندگی کا تسلسل بھی انسان کی موت کے ساتھ ختم نہیں ہوتا بلکہ جاری و ساری رہتا ہے۔ یہ ابدی مستقبل بھی نظر نہیں آتا لیکن اسے محسوس کیا جاسکتا ہے۔

ماضی کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک ماضی قریب اور دوسرا ماضی بعید۔ قریب و بعید کی مدت پر قرۃ العین حیدر اور آج کے ناول نگار کے درمیان یقیناً اختلاف ہوگا اس لیے اسے زندہ اور مردہ کے دو خانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ زندہ ماضی سے مراد وہ زمانہ جس میں وہی سیاسی و معاشی نظام نافذ تھا جس

میں ہم جی رہے ہیں اس کے برعکس وہ زمانہ جس کا نظام داستان پارینہ بن گیا مردہ ماضی میں شمار ہوگا۔ مثلاً ملوکیت یا آمریت کا دور جو کم از کم ہندوستان کی حد تک ختم ہوگیا، ماضی کی لاش ہے اور جمہوریت کا زمانہ جو جاری وساری ہے زندہ تابندہ ہے۔ اس لحاظ سے کالا پانی کا زمانہ زندہ ماضی میں شمار ہوگا اس لئے کہ اسے جس برطانوی حکومت نے قائم کیا تھا وہ جمہوریت کی علمبردار تھی اور ہم لوگ آزادی کے بعد بھی اس کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ اس نقطہ نظر سے شیر علی، خالد سہیل اور جیلانی ایک ہی چکی میں پسنے والے مختلف دانے بن جاتے ہیں۔ ان کے مصائب وآلام مشترک ہوجاتے ہیں۔ خالد سہیل کے لئے شیر علی کے حالات کا انطباق مناسب حال معلوم ہوتا ہے۔ خالد کا اس کی مدد سے اپنے اردگرد رونما ہونے والے واقعات کا تجزیہ کرنا اور جیلانی اور اس کے میز وساتھی کا خالد کی رہنمائی میں مستقبل کی حکمت عملی مرتب کرنا ایک فطری تسلسل بن جاتا ہے۔

اگر ہم لوٹ کر ''مکان'' اور ''پلیتہ'' کا موازنہ کریں تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ انسان امن اور سکون کی خاطر اپنے مکان میں پناہ لیتا ہے لیکن جب کوئی فاسد نظام اس کو بے مکان کر کے کالا پانی پر روانہ کردے تو وہ وہاں سے بارود کا ذخیرہ اپنے ساتھ لاسکتا ہے تاکہ ظلم واستحصال کی علمبردار استبدادی قوتوں کو نیست ونابود کر کے عدل وانصاف قائم کرسکے۔ ''مکان'' کے اندر پیغام آفاقی نے اپنا زیادہ وقت کرداروں کے قلب وذہن کے تجزیئے پر صرف کیا لیکن ''پلیتہ'' میں وہ باہر کی دنیا میں نکل گئے اور معاشرے کے اندر کارفرما سیاسی عناصر کی حکمت عملی اور معاشی طرز فکر کی نیرنگیاں اجاگر کرنے میں مصروف عمل ہوگئے۔ اس طرح گویا پیغام آفاقی مکان سے نکل کر زماں میں آگئے۔ انسان بزعم خود زماں ومکاں کے حصار میں گرفتار رہتا ہے۔ حکیم الامت علامہ اقبال نے عقل وخرد کو زماں ومکاں کی زناری سے آزاد کرنے کے لئے ضرب لا الہ کا استعمال کیا اور فرمایا۔

خرد ہوئی ہے زماں و مکاں کی زناری　　نہ ہے زماں نہ مکاں لا الہ اللہ

پیغام آفاقی نے اس کام کے لئے دو ناول لکھے ''مکان'' اور ''پلیتہ''۔ یہ کام آسان نہیں ہے۔ قلب وذہن کے اندر موجود مضبوط صنم کدوں کو مسمار کرنے کے لئے براہیمی نظر کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس کی بابت علامہ فرماتے ہیں۔

براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے　　ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنالیتی ہے تصویریں

پیغام آفاقی جیسے مرد حق سے چونکہ یہ نکتہ پوشیدہ نہیں ہوتا کہ اس کی اولین یہی ذمہ داری حکم اذاں ہے۔ اس لئے وہ بے خطر آتش نمرود میں بھی کود پڑنے سے بھی پس وپیش نہیں کرتا۔ حضرت ابراہیم نے نمرود وقت کے ساتھ ساتھ رائج الوقت نظام سے بغاوت کا علم بلند کیا تھا اور عقائد سے لے کر سیاست تک تمام ہی

شعبہ ہائے حیات میں پائے جانے والے بتوں کو مصلحت کوشی کی سرحدوں کو عبور کر کے پاش پاش کردیا۔ اس لئے کہ وہ اپنے منصب ومقام سے واقف تھے۔ ''پلیتہ'' کا خالد سہیل اپنی ڈائری میں لکھتا ہے۔

''بہت سے لوگ پیدائشی طور پر ہی ایسے ہوتے ہیں۔ قدرت انہیں اسی ذمہ داری کے لئے پیدا کرتی ہے۔''

خالد سہیل پر جب اپنا فرض منصبی آشکارہ ہوجاتا ہے تو وہ اپنی کتاب کا آخری صفحہ اس طرح تحریر کرتا ہے۔

''لوگو، تمہارے یہ ظالم آقا آسمان سے نہیں آتے۔
یہ کوئی اور نہیں یہ تم خود ہو۔
یہ جو اونچے اونچے پیڑ تم دیکھتے ہو ان کا بیج تم خود ہو۔
یہ ویسے ہی ہیں جیسے تم خود ہو۔
اگر تم اندر سے بدلتے تو یہ بدل گئے ہوتے.....''

خالد سہیل اپنی کتاب میں آگے لکھتا ہے۔

''بتا کہ میری زندگی سنگین خطروں اور اندھیروں میں گھری ہوئی ہے اور میں اس کو بچانا چاہتا ہوں اور دشمن بڑا ہے اور میں اس کو ختم کرنا ہے اور یہ کام مجھ سے اکیلے نہیں ہوگا۔
بتا! رتا!! رتا!!!
تو خاموش کیوں ہے؟ رتو خاموش کیوں ہے؟؟؟
تو نہیں بتائے گا۔ رتو نہیں بتائے گا۔ رتو نہیں بتائے گا۔ رنہیں بتائے گا۔
نہیں!
تو بتائے گا۔ رتائے گا۔
بتاؤ۔ رنہیں بتائے گا۔
لا الہ اللہ

◀◀ ● ▶▶

C/o : Ashraf Khan
703 A Wing
Dheeraj Hertiage Residency - 1
Linking Road Extension, Santacruz
Mumbai - 54

● ڈاکٹر محمد زاھد الحق

شہناز نبی کی نظمیہ شاعری: ایک مطالعہ

اردو شاعری کی تاریخ پر ناقدانہ نگاہ ڈالیے تو یہ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ مختلف عہد میں ہمارے شعرائے کرام نے اپنا خون دل دے کر دنیائے شاعری کو سنوارنے اور سجانے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ غزل کو اردو شاعری کی تمام اصناف کے درمیان مرکزیت کے ساتھ ساتھ شہرت و مقبولیت بھی حاصل رہی۔ اس کے ہم پلہ صنف نظم نے بھی اچھی خاصی جگہ بنائی اور محبان علم وفن سے بھرپور پذیرائی بھی حاصل کی۔ جب ہم اردو کے ان شعرا کی فہرست تیار کرتے ہیں جنھوں نے نظم گوئی میں نمایاں مقام حاصل کیا ہے تو ان میں ہمیں چند خواتین بھی پورے آب تاب کے ساتھ نمایاں نظر آتی ہیں۔ اگر ہم اپنی گفتگو کو عصر حاضر کی چند نظم گو شاعرات کے حوالے سے پیش کریں تو پروین شاکر، ادا جعفری، شفیق فاطمہ شعریٰ، ساجدہ زیدی، زاہدہ زیدی، فہمیدہ ریاض، کشور ناہید، اشرف رفیع، زہرہ نگاہ، شہناز نبی، شبنم عشائی، پروین شیر، ترنم ریاض، صادقہ نواب سحر وغیرہ کے اسمائے گرامی سب سے پہلے ہمارے ذہن میں آتے ہیں۔ ان شاعرات نے ایک طرف سماج و معاشرے کی صحیح تصویر کشی کی ہے تو صنف نازک سے منسلک مسائل و موضوعات کو بھی اپنی نظموں میں پوری توانائی کے ساتھ پیش کرنے کی بے حد کامیاب کوششیں کی ہیں۔ اس مختصر سے مضمون میں راقم الحروف نے پوری توجہ عصر حاضر کی ممتاز و منفرد شاعرہ محترمہ پروفیسر شہناز نبی تک ہی محدود رکھی ہے۔ ان کی شاعری کے مجموعے ''پس دیوار گریہ'' اور ''شرار جستہ'' کے مطالعے سے معنیٰ و مفاہیم کی کئی نئی تہیں بھی کھلتی ہیں اور گنجینۂ معنی کے طلسم سے واقفیت بھی حاصل ہوتی ہے۔

ہم سب اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ جدیدیت کے بعد جب دائرہ شاعری چند پابندیوں سے آزاد ہوا تو ہماری شاعرات نے خواتین کے مخصوص مسائل و موضوعات کو اپنی شاعری میں پیش کیا۔ ان شاعرات نے اپنے سامنے فیمنزم کے تصور کو رکھا۔ نسائی حسیت کی انھوں نے بات کی اور عورتوں سے جڑے ہوئے موضوعات کو بھرپور انداز میں پیش کیا۔ کہیں کہیں پر ہماری شاعرات کا لب ولہجہ مرد مخالف بھی ہوا مگر

بیشتر شاعرات نے عورتوں کی بھلائی اور ترقی، مساوی حقوق اور عام انسانوں جیسے سلوک پر ہی اپنی توجہ مرکوز رکھی۔ محترمہ شہناز نبی ہمارے عہد کی ایک ایسی ہی شاعرہ ہیں جن کی شاعرانہ آواز نے ہر خاص و عام کو اپنی جانب متوجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ بھی شاید یہی رہی کہ انھوں نے خواتین کے حقوق کی بات کی مگر نعرہ بازی اور پروپیگنڈہ سے گریز کیا۔ انھوں نے خواتین کی حمایت کرنے کے لیے سماج کے دوسرے حصے کی دل آزاری نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی آواز کو بڑے انہماک سے لوگوں نے سنا اور اثر بھی قبول کیا۔ ان کی نظم ''مسافت اور ہم'' اس حوالے سے ملاحظہ فرمائیں:

ہم ایسے لوگ ہیں/جن کے سروں پر/دھوپ کا ٹکڑا نہیں چلتا
ہمارے واسطے شاخیں ہمیشہ سایہ بنتی ہیں/ہماری آنکھ میں عفریتِ تنہائی نہیں ہنستا
سفر کرتا ہے گھر بھی/جس گھڑی گھر سے نکلتے ہیں
سبھی کے آنسوؤں کو/قہقہوں کو صاف سنتے ہیں
اٹھا کر اِس طرف سے اس طرف/بس رکھا کرتی ہے
مسافت سے ڈریں کیا ہم/مسافت ہم سے ڈرتی ہے

ان کی شاعری بالخصوص نظموں میں تانیثیت اور نسائی حسیت کے عناصر جابجا موجود ہیں مگر جو بات ہمیں اپنی طرف سب سے پہلے اور پوری شدت کے ساتھ متوجہ کرتی ہے وہ یہ کہ شہناز نبی کی نظموں میں کہیں بھی feminism کا جارحانہ رخ دیکھنے کو نہیں ملتا ہے بلکہ عورت کو ایک عام انسان کی حیثیت سے سماج و معاشرے میں اس کا جائز مقام دلانے کی بہت سنجیدہ کوشش سامنے آتی ہے۔ مثال کے طور پر ان کی مختصر سی نظم ''منصوبہ'' پیش کی جاسکتی ہے:

چلو بھول جائیں/کہ کس کس نے دل پر/لگائے ہیں چرکے
کہاں کس نے تنہا کیا ہم کو کتنا/کہ دھوکے دیئے وقت نے کیسے کیسے
ملا کیا لٹا کیا/بنے دوست کتنے/ہوئے کون دشمن
یہ گنتی گنی جائے آخر کہاں تک/بھلا ہے اسی میں کہ سب بھول جائیں
یہ اک مٹھی جیون جو باقی بچا ہے/اسے ہم گذاریں گے خوش خوابیوں میں

ایسا نہیں ہے کہ شہناز نبی کی نظموں کے موضوعات صرف اور صرف عورتوں کے اردگرد گھومتے رہتے ہیں بلکہ انھوں نے بے حد غیر جانب دارانہ انداز میں آج کی دنیا میں ہو رہے واقعات کو سیاسی، تہذیبی اور مذہبی تناظر میں دیکھنے کی بہترین کوشش کی ہے۔ انھوں نے مسجدوں میں ہونے والے خون خرابے کو

موضوع بنایا ہے تو اسکولوں پر ہونے والے حملوں کو بھی۔ ان کے پیش نظر امن عالم کو تباہ و برباد کرنے کی منظّم سازشیں اور کوششیں بھی نظم کے موضوع کی شکل میں دست بستہ کھڑی ہیں تو مقامی، سیاسی، سماجی، ادبی اور تہذیبی موضوعات و مسائل کے ساتھ ساتھ اقدار کی شکست و ریخت سے بھی وہ ہم کلام ہوتی ہیں۔ مثال کے لیے ان کی نظموں ''جب میں مر جاؤں''، ''حسین تومی کو تھائے'' اور ''آمار سونار بانگلا'' کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ پہلی مثال نظم ''جب میں مر جاؤں سے ملاحظہ فرمائیں:

ہو سکے تو ایک جلوس نکالنا/جس میں شامل مرد عورت بچے بوڑھے کی زبان پر
بس ایک ہی سوال ہوگا/امنِ عالم کے نام پر اور کتنے ملکوں کی تلاشی لی جائے گی
اور کتنے تختۂ دار سجائے جائیں گے/اور کتنے جیل بھرے جائیں گے

دوسری مثال کے لیے نظم ''آمار سونار بانگلا'' کی یہ چند سطریں دیکھیے:

حسین شاہ کی سرزمین پر/شعر و ادب کی سوداگری جاری ہے
دانشوروں میں پھوٹ پڑ چکی ہے/امن و امان قائم کرنے کے نام پر
ہر دن بدامنی کا نیا منصوبہ تیار کیا جاتا ہے/دہشت کا نیا روڈ میپ تشکیل پاتا ہے
کبھی نندی گرام کبھی سینگور/کبھی نتائی گرام، پرولیا، ہروا
بدحال ماؤں کی سینہ کوبی سے گاؤں در گاؤں ماتم کدہ
رابندر سنگیت کی بلند آہنگی میں دب جاتی ہیں بچوں کی سسکیاں
نذرل کے انقلابی گیتوں میں دم توڑ دیتا ہے انقلاب
ابو نیندر لال ٹھاکر اور نندلال کے رنگ چھا جاتے ہیں
بہتے ہوئے لہو کی چھینٹوں پر/حیوانیت کو تہذیب اور ثقافت کا لباس پہنا کر
سجا دیا جاتا ہے بین الاقوامی مجلسوں میں
آمار سونار بانگلا/آمی تومائے بھالو باشی

نظم ''آمار سونار بانگلا'' طویل نظم ہے اور اس کا سنجیدگی سے مطالعہ کرنے پہ بالکل واضح ہوتا ہے کہ شاعرہ نے بدلتی ہوئی اقدار کو ماضی سے حال تک پورے تاریخی تناظر میں دیکھا اور سمجھا ہے۔ subaltern theory کو مانتے ہوئے انھوں نے بھی چھوٹے چھوٹے مراکز، تہذیبی جزیرے، سیاسی اور تنظیمی جماعتوں کو بھرپور طرح سے اپنے مشاہدے میں لایا ہے۔ انھوں نے تمام تاریخی تناظر کے ساتھ ساتھ اور سیاسی پس منظر کو بھی اپنے پیش نظر رکھا ہے۔ ایک مختصر سی مثال اسی نظم سے دیکھتے چلیں:

ساحل جوڑتے ہیں شہروں کو/اس کنارے سے اُس کنارے تک
بنگال-اڑیسہ-مالابار/تہذیبیں جوڑتی ہیں صوبوں کو
صوبے طے کرتے ہیں ملک کی سرحدوں کو
ادھر اُدھر سے توڑ کر/لسانی اور تہذیبی مماثلتوں کا واسطہ دے کر

یہ صحیح ہے کہ شہناز نبی نے اپنی نظموں میں Radical Feminism یا انتہا پسند تانیثیت سے گریز کیا ہے۔ مگر ان کی نظموں میں عورت پر ہونے والے مظالم اور عورتوں کے تئیں برتی جانے والی بے رخی اور بے بسی کا خوب ذکر ہے۔ وہ ''شولا متھ فائر اسٹون'' اور ''میری ڈیلی'' کی طرح انتہا پسند رویہ اختیار نہیں کرتی ہیں بلکہ ''کیٹ ملٹ'' اور ''مارلن فرنچ'' کی طرح اس بات کی قائل ہیں کہ مرد اور عورت کے بہترین خصائص کے تال میل سے ایک نئے سماج کی تشکیل کی جا سکتی ہے۔ نظم ''تُم، میں اور وہ'' سے ایک نمونہ ملاحظہ فرماتے چلیں:

میں وہ ساری جگہیں دیکھنا چاہتی ہوں/جنھیں تمہاری موجودگی نے مرتعش کر دیا
میں ان تمام راستوں سے گذرنا چاہتی ہوں/جن پر تمہارے قدموں نے منزلیں تراشیں
میں ان ہواؤں کو پینا چاہتی ہوں/جنھیں تمہاری خوشبو نے سیراب کیا
میں وہ ساری کتابیں پڑھنا چاہتی ہوں/جن کے حروف تمہارے مطالعے سے روشن ہیں
میں ان ساری چیزوں کو چھونا چاہتی ہوں/جنھیں تمہارے لمس نے جاوداں کر دیا
میں تمہیں بالواسطہ یا بلاواسطہ/ایک لمحے کو بھی پا سکوں
تو صدیاں اسے دان کر دوں/جس نے میرے اور تمہارے درمیان
یہ فاصلے رکھے ہیں

اسی طرح ان کی ایک نظم ''ابھی تک'' کا مطالعہ بھی اس ضمن میں بہتر ہوگا۔ اس نظم میں بچپن کی آزادی اور من میں بیدار ہونے والے تمام امنگ و ترنگ کا نقش بہت خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔ اسی نظم کے بار بار مطالعے سے جب ہم نفس مضمون تک رسائی پاتے ہیں تو پس پردہ بندھنوں میں زندگی کرنے والی عورت کی بے بسی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ اس نظم میں ناسٹلجیا کی بہترین عکاسی کی گئی ہے:

ابھی تک بارشوں میں بھیگنے کا شوق باقی ہے/کوئی اڑتا ہوا جگنو توجہ کھینچ سکتا ہے
ابھی تک سوندھی مٹی کی مہک/سانسوں میں بھرنے کی للک باقی ہے
ست رنگی دھنک کو اوڑھ لینے کی تمنا ہے

تعاقب میں ابھی تک تتلیوں کے/اک جنوں آمیز لذت ہے
کوئی کیا جانے/کب ان موسموں کا رمز کھو جائے
کوئی لمحہ نگاہوں پر کفن/احساس پر مٹی گرا کر یوں نکل جائے
کہ یہ دنیا ہماری پتلیوں پر/منعکس ہونے کی ہمت ہی نہ کر پائے
جہاں جو بھی حسیں ہے/وہ ہماری آنکھ میں گم ہے
خوشا بچپن/کہ جس نے حیرتی رکھا ہے اب تک آئینہ اتنا

ایسی ہی ایک نظم ''ایک کھاٹ کی کہانی'' اور ''آزادی اپنی شرطوں پر'' ہے۔ بظاہر یہ ایک معمولی سی نظم معلوم ہوتی ہے جس میں کھاٹ کو علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے، مگر پوری توجہ سے نظم پڑھیے تو عورتوں کی چہار دیواری میں قید کی زندگی گزارنے کی پوری بے بسی اس میں نظر آتی ہے۔ اس نظم میں مستعمل الفاظ بھی اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ عورتوں کو محض جنسی اور جذباتی استحصال کے لیے اس طرح کی زندگی گزارنی پڑتی ہے۔ ان کے جذبات کو سمجھنے والا کوئی نہیں اور نا ہی کوئی زخم پہ مرحم رکھنے والا ہے۔ مثال کے لیے نظم ''ایک کھاٹ کی کہانی'' سنیے:

ہر رات کھاٹ استعمال ہوتی ہے/اور صبح دیوار سے لگا دی جاتی ہے
کہتے ہیں دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں
لیکن دیواریں کھاٹ کی سسکیاں کہاں سُن پاتی ہیں
کھاٹ کا بند بند ڈھیلا ہو چکا ہے/وہ رات گئے چرمراتی ہے
اور دن بھر سسکیاں بھرتی ہے/مٹی کا چولہا اس کی سسکیاں سنتا ہے
اپلوں کی ڈھیری اس کی آہیں محسوس کرتی ہے
برتن باسن، کنویں کا ڈول، چکی کے پاٹ اس کے آنسو گنتے ہیں
لکڑی جل بھئے کوئلہ، کوئلہ جل بھئے راکھ/لیکن وہ تو ایک کھاٹ ہے
اس کے پایوں میں دیمک لگ چکی ہے
اس کے پٹرے بے رس/رسیاں چھدری
لیکن سونے والے کو اس کی چرمراہٹ کا پتہ نہیں

دوسری مثال نظم ''آزادی اپنی شرطوں پر'' سے پیش کی جا سکتی ہے۔ اس میں بھی عورت اپنے آپ کو بندھنوں سے آزاد کرنا چاہتی ہے۔ نظم کا ایک حصہ ملاحظہ فرمائیں:

میں نے اتنی آزادی حاصل کر لی ہے/کہ بلا اجازت گھر سے باہر نکل سکوں
آنکھوں میں سرمہ، تیز خوشبو، چھنکتی ہوئی پائل/بال کھلے ہوں تو کیا
میں نے اتنی آزادی حاصل کر لی ہے/کہ جنس مخالف آرائش کو آزمائش نہ سمجھے
میں نے اتنی آزادی حاصل کر لی ہے/کہ محفل میں زور سے قہقہہ لگا سکوں
بے تکان گفتگو کر سکوں/جواب دیتے رہنے کے بجائے سوال کر سکوں
جوابوں کے غلط ہونے پہ ٹوک سکوں

اب تک شہناز نبی کی نظموں کے حوالے سے جتنے نکات پیش کیے گئے ہیں وہ سب بہت اہم ہیں۔ شہناز نبی کی نظموں میں جا بجا ترقی پسند حسیت کے علاوہ وسیع المشربی کے نمونے بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ان کی نظم ''پاپ'' کا مطالعہ کرنے سے ہمیں مذہبی ہم آہنگی اور رواداری کا درس حاصل ہوتا ہے۔ وہ اس نظم کے حوالے سے اپنا واضح نظریہ قارئین کے سامنے رکھتی ہیں۔ آپ بھی نظم ملاحظہ کریں:

برانہ مانو/نمازیں اب بھی یہیں پڑی ہیں
پہ سجدہ گاہیں اٹھا کے جانے کدھر چلے تھے
وہ صبح تم کو بھی یاد ہوگی/الگ تھے گھر اور علیٰحدہ چولہے
تمہارے پرچم کا رنگ الگ تھا/وطن تمہارا نیا نیا تھا
سبھی تو بانٹا تھا آدھا آدھا/مگر پڑی ہیں وہاں پہ اب تک
ہماری رادھا کی ایک پائل/ہمارے کرشنا کی ایک بنسی
پہ ہیر کیسے اٹھا کے دے دیں/کہاں سے لائیں تمہارا رانجھا
کہ ہم سے پاگل/حساب رکھتے نہیں دنوں کا
ہمیں تو یہ بھی پتہ نہیں ہے/کہ آریائی سے بابری ہم بنے تو کیسے
ہمیں تو شنکھ اور اذاں ہے یکساں/ہماری تاریخ کے کتنے صفحے
چرائے تم نے؟/کہاں کہاں سے نشاں ہمارے
مٹائے تم نے؟/ہماری ہولی تمہارے بن ہے اداس کتنی
تمہیں پتہ کیا/ہماری عیدوں کو تم سے ملنے کی پیاس کتنی
کہاں چلے تھے اٹھا کے منبر/کہاں سجائی دکان تم نے
کہاں پہ بیچے ہیں مال کتنے/کہو منافع کمایا کتنا

ہمارے جیسے رتمہارے جیسے رخدا کے بندے
جو اپنے حصے کا پانی رکھو دیں کنواں تو پائیں
جو اپنے تن کو دھواں بنائیں تو روٹی کھائیں
ہمیں لکیروں کے کھیل سے کیا رہمیں تجارت سے واسطہ کب
جنہیں تھا سود و زیاں سے مطلب روہ کاروبارِ جہاں سے رخصت
یہ آگ اب بھی بھڑک رہی ہے رچلو بزرگوں کا پاپ دھوئیں
ہمارے مندر سنبھالو تم سب رتمہاری مسجد کے ہم نگہباں

آخر میں اپنی بات مکمل کرنے سے قبل راقم یہ عرض کرنا چاہتا ہے کہ شہناز نبی کی نظموں کا یہ سرسری مطالعہ اگر آپ کو مزید مطالعے کے لیے راغب کرے تو میرے لیے یہ سعادت کی بات ہوگی۔ اردو نظم گوئی میں پروین شاکر، شفیق فاطمہ شعریٰ، زاہدہ زیدی، فہمیدہ ریاض، کشور ناہید، زہرہ نگاہ وغیرہ جیسی اہم شاعرات نے منفرد لب و لہجے کی بنیاد پر ہی اپنی الگ شناخت بنائی اور اپنے فن سے ہر خاص و عام کو اپنا گرویدہ بھی بنایا۔ اسی طرح شہناز نبی کی شاعری میں بھی ہمیں وہی چمک دمک، رنگ و نور اور حسن و جمال نظر آتا ہے جو ان کو اردو کی بڑی نظم گو شاعرات کی صف میں خصوصی اور مجموعی طور پر اردو شاعری کے مستند نظم گو شاعروں میں شمار کروانے کے لیے یقیناً کافی ہے۔ شہناز نبی کی نظمیہ شاعری کو ذہن میں رکھتے ہوئے راقم الحروف کسی طرح کے بڑے دعوے تو نہیں کرنا چاہتا مگر یہ ضرور عرض کرنا چاہتا ہے کہ شہناز نبی کی نظموں کے بغیر عصر حاضر کی شاعری بالخصوص نظمیہ شاعری کی تاریخ مرتب نہیں کی جا سکتی۔ اس ضمن میں خاکسار حضرت محشر بدایونی کے اس شعر پر ہی اکتفا کرتے ہوئے اپنی بات ختم کرنا چاہتا ہے کہ:

اب ہوائیں ہی کریں گی روشنی کا فیصلہ
جس دیے میں جان ہوگی وہ دیا رہ جائے گا

◀◀ ● ▶▶

Dept. of Urdu
University of Hyderabad
Hyderabad-500046(A.P)

● فیضان احمد ملک

میراجی کے شعری رویے

ہر شاعر کے کلام میں چاہے وہ ادنیٰ درجے کا ہی کیوں نہ ہو، کسی نہ کسی نوع کی تخلیقی اور نظریاتی انفرادیت ضرور موجود ہوتی ہے۔ لیکن ایسے فنکار خال خال ہی ہوتے ہیں، جن کے کلام میں نہ صرف پوری آب و تاب کے ساتھ انفرادی رنگ جھلکتا ہے بلکہ جو اپنی خلاقانہ صلاحیتوں سے کام لے کر موضوع اور اسلوب کی سطح پر ایسی مثبت تبدیلیاں پیدا کرتے ہیں کہ ان کا فن ایک نئی روایت کا سنگ میل بن جاتا ہے۔ اس اعتبار سے میراجی یقیناً اردو نظم کے باب میں ایک نئی روایت کے بنیاد گزار ٹھہرتے ہیں۔ میرا جی نے نہ صرف یہ کہ اردو نظم کو مروجہ سانچوں کی قید سے آزاد کر کے اسے موضوع اور اسلوب کی سطح پر نئی جہات اور وسعتوں سے ہمکنار کیا بلکہ اپنی تنقیدی تحریروں اور دیگر نثری نگارشات کے ذریعے نظم کی فکری اور فنی بنیادیں بھی استوار کیں۔

میراجی کے فن کی عظمت کا اعتراف اگرچہ بعض اشخاص کی جانب سے ان کی زندگی میں ہی کیا جانے لگا تھا لیکن جس دور میں ان کی ادبی زندگی اپنے عروج پر تھی اس وقت پورے اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کا طوطی بول رہا تھا۔ میراجی کی شعری کائنات چونکہ ترقی پسندوں کے طے شدہ موضوعات سے کوسوں دور تھی اور ترقی پسندوں کو بھی چونکہ ان کے یہاں اپنے نظریے کے مطابق زیادہ کچھ نہ مل سکا لہذا میراجی کو اپنے معاصرین میں وہ رتبہ نہ مل سکا جس کے وہ مستحق تھے۔ لیکن ترقی پسند تحریک کے زوال اور جدیدیت کے ابتدائی دنوں میں ان کی طرف خصوصی توجہ دی گئی خاص طور پر جدید شعرا نے ان کی تقلید کو اپنے لیے باعثِ فخر سمجھا۔ اردو کے معروف افسانہ نگار اور نقاد انتظار حسین نے اس سلسلے میں درست لکھا ہے کہ:

''ویسے تو میراجی بھی اتنے ہی توجہ کے مستحق ہیں جتنی توجہ کے مستحق فیض اور راشد سمجھے گئے تھے..... ترقی پسندوں نے جو میراجی کی مذمت کر رکھی ہے کہ وہ ذہنی طور پر بیمار شاعر ہے، ذات کی الجھنوں میں پھنسا رہتا ہے، مریضانہ داخلیت پسندی کا شکار ہے۔ اس پر مت جایئے۔ فیض صاحب کی ترقی پسندی

اپنی جگہ مگر جدیدیت کے تصور نے تین شاعروں فیض، راشد اور میرا جی کو ایک رسی میں باندھ رکھا ہے یا کہہ لیجئے کہ ایک رشتہ میں پرو رکھا ہے اور وہ جو اردو میں جدید شاعری کی روایت قائم ہوئی اس میں ان تین کی حیثیت اس روایت کے بڑوں کی تھی اور اب بھی ہے..... جدیدیت کے تصور سے متاثر نئے ذہنوں نے زیادہ اثر میرا جی سے قبول کیا۔ یہ تینوں لاہور میں موجود تھے مگر نئی شاعری کے رسیا نوجوان میرا جی کے گرد اکٹھے ہوئے۔ میرا جی ان کے گرو بن گئے۔ مختار صدیقی، یوسف ظفر، قیوم نظر، مبارک احمد، ضیا جالندھری گویا میرا جی کے زیر اثر ایک پورا مکتبہ شاعری وجود میں آ گیا۔''

میرا جی نظم کے میدان میں ایک منفرد تخلیق کار کی شناخت لے کر داخل ہوئے۔ ان کا شعری تجربہ بھی ایک رجحان ساز فنکار کے فنی تجربے کی طرح قبل از وقت تھا۔ جس طرح اردو میں غالبؔ کا شعری تجربہ اپنے عہد کے مروجہ اقدار و روایات سے آگے کی چیز تھی اور جس بنا پر غالب کو جیتے جی وہ مقام نہ مل سکا جس کے وہ مستحق تھے اور جو ان کے معاصر ذوقؔ کو نصیب ہوا۔ لیکن آج ادب کا ہر قاری اس بات کا معترف ہے کہ غالب ہر اعتبار سے ذوق سے بڑا شاعر ہے۔ ذوقؔ کی شاعری چونکہ عام ذہنی سطح کی شاعری تھی، اس میں معاشرے کی مروجہ شعری اقدار و روایات سے ماورا کوئی عنصر موجود نہ تھا لہٰذا ان کی شاعری عوام میں پسند کی گئی۔ غالب کی شاعری میں چونکہ مروجہ اقدار و روایات سے قطع نئے عہد کا شعور موجزن تھا جس سے لوگ آگاہ نہ تھے اسی لیے وہ اپنے دور میں معتوب ٹھہرے۔ غالبؔ کی طرح چونکہ میرا جی بھی ایک نئی طرز کے موجد تھے۔ اسی لیے وہ بھی اپنے دور میں نظر انداز کیے گئے۔ ان کی شاعری کو یہ کہہ کر رد کیا گیا کہ اس میں خود پرستی، جنس پرستی، ابہام پرستی اور گریز و فرار کے عناصر اس قدر موجود ہیں کہ اس میں کسی صحت مند چیز کے ملنے کی کاوش فضول ہے لیکن مرورِ ایام کے ساتھ میرا جی کے فن کی خاصی پذیرائی ہونے لگی۔ آج کا ناقد جب ان پر قلم اٹھاتا ہے تو انہیں جنس پرست اور ابہام پرست قرار نہیں دیتا بلکہ انہیں ایک نابغۂ روزگار اور رجحان ساز شاعر کے طور پر قبول کرتا ہے۔ جمیل جالبی نے بہت پہلے اس حقیقت کی جانب اشارہ کیا تھا لکھتے ہیں۔

''میرا جی کی شاعری میں خیر و شر، نیکی و بدی، ابدی کرب اور احساسِ تنہائی کے ایسے نئے زاویے سامنے آتے ہیں کہ ہمارا شعور نئے امکانات سے روشناس ہو جاتا ہے اور چونکہ ہر نئی چیز اور زندگی کا نیا پہلو مبہم ہوتا ہے اسی لیے میرا جی کی شاعری بھی صحیح ہے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ یہ ابہام از خود دور ہوتا جائے گا اور ان کی شاعری عام اور عام فہم ہوتی جائے گی۔ میرا جی تو مر گئے لیکن ان کی شاعری کی اصل زندگی اب شروع ہوئی ہے۔ آج یہ شاعری سب کے لیے نہیں ہے لیکن کل یہ سب کے لیے ہوگی''۔

میرا جی کا مطالعہ و مشاہدہ کافی وسیع تھا وہ ایک طرف مشرقی ادبی روایات سے پورے طور پر

واقف تھے تو دوسری جانب انہوں نے مغرب کی ادبی روایات سے بھی اخذ نور کیا تھا۔ انہوں نے نہ صرف اردو، ہندی، سنسکرت اور برصغیر پاک و ہند کی بعض دوسری زبانوں کے نامور شعراء سے استفادہ کیا بلکہ مغرب کے بودلیئر اور میلارمے جیسے شعراء کا بھی اثر قبول کیا اور ان سب اثرات کو باہم آمیز کر کے اپنے مخصوص و منفرد لہجے اور آہنگ کی تشکیل کی۔

میرا جی صحیح معنوں میں ایک ایسے شاعر ہیں جن کی شاعری میں سرزمین وطن کی روح نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری زمین سے وابستگی کی بہترین مثال ہے۔ میرا جی سے قبل زمین سے وابستگی کی مثالیں اردو شاعری میں ملتی تو ہیں لیکن میرا جی کے برعکس دوسرے شعراء کے فن پاروں میں زمین سے وابستگی کا اظہار زیادہ تر سطحی نوعیت کا ہی معاملہ ہے۔ جب کہ میرا جی کی شاعری زمین سے وابستگی کا کورا خارجی اظہار یہ نہیں ہے وہ اپنی شاعری میں سرزمینِ وطن کی روح سے مکمل طور پر ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔ ان کے فن پاروں میں قدیم ہند کے پُر فریب اور دلکش دیومالائی تہذیب و تمدن کے ساتھ حد درجہ لگاؤ کا تاثر ملتا ہے۔ اسی باعث ان کا شعری اسلوب بھی متاثر ہوتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے دور کی فارسی آمیز اردو کی بجائے ہندی کے نرم ملائم استعاروں، تمثالوں، پیکروں اور علامتوں کو اپنی نظموں میں سمو کر ایک ایسے حسین و جمیل شعری اسلوب کی تشکیل و ترویج کا کام سرانجام دیا، جو بعد میں جدید نظم کے ایک ممتاز اور مقبول اسلوب کی صورت میں سامنے آیا۔ چند مثالیں ملاحظہ کیجئے ؎

چندر کانت سے من میں آئے شانتی
کملا میری، بملا میری اور میری ہے کانتی
پر میں جانوں
اور یہ سمجھوں
چندر کانت سے من میں آئے شانتی

شیاؔما میری..... جس کے لمبے بال، من پنچھی کو جال
رادھا میری..... جس کی موہنی چال، من کو کرے نڈھال
یہ بالوں میں لہروں کا سماں ہے کس کے لیے کہو کس کے لیے
گالوں پر جو سرخی ہے عیاں ہے کس کے لیے کہو کس کے لیے
یہ ماتھے پر بندی کا نشاں ہے کس کے لیے کہو کس کے لیے
یہ آنکھوں میں اک اور جہاں ہے کس کے لیے کہو کس کے لیے

لہروں کا سماں اک اور جہاں سرخی بندی سب دھوکا ہے
تم دیکھ کے گر للچاتے ہو تو تم کو کس نے روکا ہے
دکھ درد سے چھٹکارا ہے کہاں ہے کس کے لیے کہو کس کے لیے
یہ بالوں میں لہروں کا سماں ہے کس کے لیے کہو کس کے لیے
کشتی کا باقی رہا جو نشان ہے کس کے لیے کہو کس کے لیے
اب چھوڑو نہیں اب کہہ دو ہاں ہے کس کے لیے کہو کس کے لیے
یہ ہاں یہ نہیں یہ نہیں یہ ہاں یہ دونوں باتیں دھوکا ہیں
ان دونوں میں ہے سفر پنہاں یہ دونوں باتیں دھوکا ہیں
میں بیٹھی ہوئی ہوں

دوپٹہ میرے سر سے ڈھلکا ہوا ہے
مجھے دھیان آتا نہیں ہے، مرے گیسوؤں کو کوئی دیکھ لے گا
مسرت کا گھیرا سمٹتا چلا جا رہا ہے
میں اب اور کوئی نئی چیز میرے مسرت کے گھیرے میں آنے نہ پائے
ہم تو تمہیں دانا سمجھتے تھے بھید کی بات بتا ہی دی
اس دن کو ہم کہتے تھے کیا فائدہ ایسے پینے میں
کوٹھا اٹاری منزل بھاری حوصلے جی کے نکالیں گے
سامنا ان سے اچانک ہو جائے جو کسی دن زینے میں

اردو کے جن قد آور ناقدین نے میرا جی کی عمدہ تفہیم و تعبیر کی ہے وہ اس حقیقت کو بلا شک و شبہ تسلیم کرتے ہیں کہ میرا جی نے اردو نظم کو جن منفرد اور اعلیٰ تخلیقی تجربات سے آشنا کیا، ان کی اہمیت اور انفرادیت ہمیشہ برقرار رہے گی۔ مثال کے طور پر میرا جی کی شاعری کی انفرادیت اور ندرت کو تسلیم کرتے ہوئے سلیم احمد اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں۔

''یہ شاعری جیسی بھی ہے اور آپ اس کو جو مقام دیں، لیکن ایک ایسی شاعری جس کا مقابلہ ایسے مسائل سے تھا جس سے اردو زبان کی شاعری کو کسی دور میں بھی سابقہ نہیں پڑا۔ ان مسائل کو ان کی پوری شکل میں نمایاں کرنے کے لیے اس شاعری نے ایک نئی ہیئت اختیار کی' میرا جی کی شاعری کی اولیت ان سے نہیں چھین سکتے۔''

میرا جی نے اردو شاعری کو بعض نئے موضوعات سے آشنا کرایا جن پر پہلے پہل لکھنا مستحسن نہیں سمجھا جاتا تھا۔ جنس ایک ایسا ہی موضوع ہے جس پر میرا جی سے قبل بہت کم فنکاروں نے قلم اٹھایا ہے۔ میرا جی کی شعری کائنات میں جنس کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ اردو شاعری میں جنس کے نام پر زیادہ تر گل و بلبل کی داستانیں پیش کی گئیں ہیں۔ لیکن میرا جی نے جس فنّی شائستگی اور بیباکی کے ساتھ جنس کے موضوع پر قلم اٹھایا، ویسا طرز بیان اور حسن ادا اردو شاعری کی روایت میں ملنا ناممکن ہے۔ بہرصورت ان کی نظموں اور گیتوں میں جنس ہر رنگ میں دیکھا جا سکتا ہے لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ ان کی شاعری ساری کی ساری جنس کے گرد ہی گھومتی ہو اور دیگر موضوعات کی طرف انہوں نے بالکل توجہ نہ دی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی بعض نظموں میں سماج اور فرد کے مسائل کا باریک بینی سے مشاہدہ بھی ہوا ہے لیکن انہیں ترقی پسندوں کی طرح ادب کو سماجی آلہ کار کے طور پر استعمال کرنا منظور نہ تھا تاہم اس حقیقت کو فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے کہ جنس میرا جی کی شاعری کا ایک بنیادی موضوع بھی ہے اور محرک بھی۔ ڈاکٹر رشید امجد جنس کے بارے میں میرا جی کے نظریے کی وضاحت یوں کرتے ہیں۔

''میرا جی کے ہاں عورت ایک جیتی جاگتی حقیقت ہے اور جنس کے بارے میں ان کا رویہ صحت مندانہ ہے..... میرا جی جنسی عمل کو غیر اخلاقی قرار دینے کی بجائے اسے انسانی محبت کے لیے ایک مثبت عمل سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ یہ عمل انسان کو ایک روحانی مسرت سے ہم آہنگ کرتا ہے۔ چنانچہ وہ جنس کو ایک قبیح فعل سمجھنے کی بجائے حسن کے گرد جمع اس تہذیبی آلودگی کو صاف کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو مروج اخلاق کی پیداوار ہے جنس کے ساتھ میرا جی کا تعلق سطحی یا اکتسابی نہیں بلکہ ذہنی اور روحانی ہے کیونکہ وہ اسے زندگی اور تخلیق کا ایک لازمی عنصر سمجھتے ہیں۔''

میرا جی نے جنس کو جس فنّی شائستگی کے ساتھ پیش کیا ہے اس کی بدولت آج اردو شاعری میں جسم، روح اور جنس کا تذکرہ عام ہے اور ان کی تفہیم و تحسین کوئی شرمندگی کی بات تصور نہیں کی جاتی۔ ''جسم کے اس پار''، ''رتجگا''، ''دوسری عورت سے''، ''اجنبی انجان عورت رات کی''، ''پژمردگی''، ''اے ریاکارو''، ''میں جنسی کھیل کو صرف تن آسانی سمجھتا ہوں''، ''جنسی عکس خیالوں کا''، ''سنگ آستان''، ''اونچا مکان''، ''سرگوشیاں''، ''خود لذتی''، ''دور نزدیک''، ''عدم کا خلاء''، ''ایک نظم''، ''دور کنارا''، ''عورت'' وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جن میں میرا جی نے جنس کو بنیادی اہمیت دی ہے اور جنسی ناآسودگی کے سبب پیدا ہونے والی مختلف نفسیاتی اور دیگر پیچیدہ' ذہنی اور جسمانی الجھنوں کا تذکرہ کیا ہے۔ میرا جی جنس کے حوالے سے اپنے نظریے کی وضاحت خود اس طرح کرتے ہیں۔

''بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ زندگی کا محض جنسی پہلو ہی میری توجہ کا واحد مرکز رہا ہے۔لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے جنسی فعل اور اس کے متعلقات کو قدرت کی بڑی نعمت اور زندگی کی سب سے بڑی راحت اور برکت سمجھتا ہوں۔جنس کے گرد جو آلودگی تہذیب و تمدن نے جمع کر رکھی ہے۔وہ مجھے ناگوار گزرتی ہے۔اس لیے ردعمل کے طور پر میں دنیا کی ہر بات کو جنس کے تصور کے آئینہ میں دیکھتا ہوں، جو فطرت کے عین مطابق ہے اور میرا آدرش ہے۔''

فن کار کے نزدیک موضوع دراصل ایک ذریعہ ہے جس کی وساطت سے وہ اپنے فن کا مظاہرہ کرتا ہے کسی بھی فن پارے میں موضوع یا مواد سے زیادہ اہمیت اسلوب یا انداز بیان کی ہوتی ہے۔شاعری میں بھی بنیادی طور پر اس بات کی زیادہ اہمیت نہیں ہے کہ کیا کہا گیا ہے بلکہ اس بات کی اہمیت ہے کہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ کیسے کہا گیا ہے۔محض موضوع کی بناء پر کوئی شاعری اعلیٰ معیار کی شاعری قرار نہیں دی جاسکتی ہے۔اقبالؔ، غالبؔ اور میرؔ کو اس بنا پر اردو شاعری کی عظیم تثلیث قرار نہیں دیا جاتا ہے کہ ان کی شاعری میں اعلیٰ معیار کے موضوعات ملتے ہیں بلکہ ان شعرا کی عظمت کا راز اس بات میں پوشیدہ ہے کہ انہوں نے دوسرے شعراء کی بہ نسبت زیادہ دلکش اسلوب میں اپنے مافی الضمیر کا اظہار ہے۔جدید تنقیدی تھیوریز سے بھی یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ کسی بھی فن پارے میں موضوع سے زیادہ اہمیت طرزِ ادا کی ہی ہے۔اب اگر میراجی کی شاعری کا بنیادی موضوع جنس ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم انہیں جنس پرست قرار دے کر رد کر دیں ان کی تخلیقات میں جنس محض سطحی جذبات کی تسکین کی خاطر استعمال نہیں ہوا ہے بلکہ وہ جس فنکارانہ مہارت سے اس موضوع کو برتتے ہیں اس میں واقعی ان کی عظمت کی دلیل پوشیدہ ہے مثال کے طور پر ان کی ایک نظم ''سرگوشیاں'' کا موضوع جنس ہے لیکن ذرا دیکھئے کہ ان کی یہ نظم کس طرح کی فنی اور جمالیاتی خوبصورتی کا احساس دلاتی ہے۔ ؎

آج رات
میرا دل
چاہتا ہے تو بھی میرے پاس ہو
اور سوئیں ساتھ ساتھ
تیرے پیراہن مجھے
یاد آتے ہیں بہت
آسماں بھی صاف ہے

اور ستارے اور چاند
بے خود و سرمست ہیں
تازگی
ہے عیاں
ذرے ذرے سے زمیں کے، آہ لیکن بے بس،
اور تنہائی مری
آج تُو آجا، مری ہمراز بن،
آ بھی جا، دیکھ لے گھٹائیں آرہی ہیں بے نشاں رفتار سے
اور ان کالی گھٹاؤں میں ہے سرمستی، خمار،
اور پانی کے ہیں تار،
تو بھی آ
مل کے ہم
آج رات
گا ہی لیں چاہت کے گیت؟
جسم بھی تیرا مجھے مرغوب ہے
اور تیری ہر ادا
اور یہ چہرا ترا
محبوب ہے
تیری یہ پیاری جوانی اک اچھوتی سی کلی
اور صورت سادی سادی سانولی
اور تیرے بالوں میں یہ چمپا کے پھول
اور نازک ہاتھ پر لپٹا ہوا گجرا ترا
اور گلے کے ہار میں ایک ہار
آہ تیرے سب سنگار
کھینچتے ہیں دل کے تار

اوراک ہلکی سی گونج
اس فضا کی وسعتوں میں کھوگئی،
آمری ننھی پری!
آمری من موہنی!
آج رات
چاہتا ہوں تو بھی میرے پاس ہو

میراجی نے اپنی تخلیقات میں ابہام کو ایک اہم شعری عنصر کی حیثیت سے استعمال کیا ہے لیکن بعض لوگ اسی بنا پر میراجی کے شاکی بھی ہیں، حالانکہ شاعری کے لیے ابہام عیب نہیں ہنر ہے اور شعر کی معنوی تہہ داری اور معنی خیزی کو بڑھاتا ہے۔ میں نے یہ بات کہیں پہلے بھی کہی ہے کہ میراجی کی شاعری عام ذہنی سطح کی شاعری نہیں ہے جو لوگ بیانیہ شاعری پڑھنے کے عادی ہیں۔ وہ میراجی کی شاعری کو کیا سمجھ پائیں گے۔ میراجی کی شاعری کے فہم وادراک کا حصول قاری کو غور وفکر پر مجبور کرتا ہے، لیکن تن آسان طبیعتیں اپنی کمزوریوں کو چھپانے کے لیے میراجی کو ابہام پرست قرار دینے میں ہی اپنی عافیت سمجھتے ہیں۔ لیکن ان کا یہ دعویٰ اس وقت باطل ٹھہرتا ہے جب میراجی کی حد درجہ مبہم نظموں کی عمدہ تعبیریں سامنے آتی ہیں۔

میراجی کی شاعری سے اس بات کا بخوبی احساس ہوتا ہے کہ وہ جدید شہری زندگی سے حد درجہ خائف تھے۔ اگرچہ انہوں نے اس کا کہیں کھل کر اظہار نہیں کیا ہے لیکن ان کی تخلیقات سے یہ تاثر ملتا ہے کہ وہ جدید سے زیادہ سرزمینِ وطن کی قدیم تہذیبی اقدار وروایات اور رسوم ورواج کے ہی عاشق تھے۔ قدیم اقدار وروایات سے حد درجہ لگاؤ انہیں گیت کی حسین فضا کی طرف ملتفت کرتا ہے۔ گیت محبت وخلوص کی علامت ہے اور انسان کے فطری جذبات کا معصومانہ اظہار ہے۔ میراجی نے ایک ایسے وقت میں گیت کو دوبارہ زندہ کیا جب یہ صدیوں پہلے فارسی شاعری کی تقلید کے نتیجے میں از کار رفتہ ہو چکا تھا۔ میراجی گیت کو اپنے فطری جذبات، خیالات اور احساسات کے اظہار کے لیے ہی استعمال کرتے ہیں۔

دکھ بھی سکھ ہے، کوئی جو بولے
سن لے، اکیلا بیٹھ کے رو لے
چاہے سنبھلے، چاہے ڈولے
دل کو دے یہ گیان
جب ڈھب آن پڑی، سکھ جان

پہلا دھندلکا دور ہوا ہے
جھنجھٹ کل کا دور ہوا ہے
آنسو ڈھلکا، دور ہوا ہے
دو پل کا مہمان
جس ڈھب آن پڑی، سکھ جان

میراجی نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بھرپور انداز میں بروئے کار لانے کے لیے اپنے آپ کو ہر طرح کی سماجی بندش سے آزاد کیا تھا انہوں نے اپنے عہد کے انسان کی پیروڈی بننا پسند نہیں کیا۔ اگر وہ بھی سماج کے اصولوں اور آدرشوں کے مطابق زندگی گزارتے تو شاید اس بات کا امکان ہوتا کہ انہیں کسی حد تک اپنے فن کا خون کرنا پڑتا، انہوں نے بلاوجہ ایک جوگی یا سادھو کا روپ دھارن نہیں کیا تھا بلکہ وہ اپنے فن کو سجانے او رسنوارنے میں اس قدر محو تھے کہ انہیں زندگی کی دوسری ضروریات کی طرف توجہ کرنے کا موقعہ ہی نہ ملا۔ ویسے بھی میراجی کا عجیب وغریب حُلیہ ان کی فنی قدر وقیمت طے کرنے میں حائل نہیں آنا چاہیے۔ بحیثیت مجموعی میراجی نے جس موضوع پر بھی لکھا ہر جگہ انہوں نے اپنی انفرادیت کے نقوش چھوڑے ہیں۔ اگر وہ جدید نظم کے سب سے زیادہ منفرد اور بلند قامت شاعر ہیں تو اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے ایک بالکل منفرد زبان کی تخلیق کی۔ انہوں نے جس طرح کی علامتوں، استعاروں، مثیلوں اور تراکیب کا استعمال کیا ہے وہ یقیناً جدید نظم کے باب میں ان کا ہی حصہ ہے۔

◀◀ ● ▶▶

Batta Pura,
Shopian,Kashmir

ڈاکٹر منظر اعجاز کی کتابیں

نام کتاب: متن سے مکالمہ صنف: تنقید سن اشاعت: ۲۰۱۵ صفحات: ۲۰۸ قیمت: ۱۱۹ روپے	نام کتاب: تجزیاتی مطالعے صنف: تنقید سن اشاعت: ۲۰۱۵ صفحات: ۲۰۸ قیمت: ۳۵۰ روپے	نام کتاب: نئی غزل میں تلمیح کی معنویت صنف: تنقید سن اشاعت: ۲۰۱۵ صفحات: ۲۴۰ قیمت: ۳۹۰ روپے
پتہ: صدر شعبۂ اردو وفارسی، اے این کالج، پٹنہ		

● محمد فرحان دیوان

نظیر اکبرآبادی کی شاعری میں مشترکہ تہذیب کی عکاسی

نظیر اکبرآبادی اردو ادب کے چند ایسے شاعروں میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے اردو شاعری کی عام روش سے الگ ہٹ کر ایک منفرد پیرائے بیان اختیار کیا اور شاعری کو عاشق و معشوق، گل و بلبل کی بندشوں سے آزاد کراتے ہوئے انسانی زندگی کی تلخ حقیقتوں سے روشناس کرایا۔ ہندوستانی عوام کی غربت، متوسط طبقوں کی لاچاری، ان کی رنگارنگ زندگی اور ان سے جڑے ہر طرح کے مسائل کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔

نظیر اکبرآبادی اردو نظم کے معمارِ اول تسلیم کیے جاتے ہیں۔ اردو شاعری میں زندگی اور خارجی دنیا کی صحیح نمائندگی کا آغاز نظیر ہی کی شاعری سے ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں ہندوستانی تہذیب و ثقافت کا بیان اتنی کثرت سے کیا ہے کہ یہی تہذیبی اقدار کا حوالہ ان کی بنیادی شناخت بن گئی اور ان کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے قاری اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ ہندوستان میں بسنے والے مختلف مذاہب کے لوگ گویا ایک ہی کڑی میں پروئے ہوئے نظر آتے ہیں۔ انھوں نے دنیا کو بہت قریب سے دیکھا اور برتا ہے اسی وجہ سے انھیں یہ دنیا تمام تر خرابیوں کے باوجود عزیز ہے۔ لہٰذا نظیر کے متعلق اتنا کہنا ہی کافی ہوگا کہ وہ ہندوستان کے ذرے ذرے میں محسوس کیے جاتے ہیں۔ بقول مجنوں گورکھپوری۔

''نظیر خالص ہندوستانی شاعر تھے۔ ہندوستان کی زندگی اور ہندوستان کے رسوم و روایات ان کی شاعری کے لازمی عناصر ہیں۔ وہ اپنی گردوپیش کی زندگی کے عام سے عام واقعات کے ساتھ سچی موانست رکھتے ہیں اور انھیں سے اپنی شاعری کے لیے مواد حاصل کرتے ہیں۔ نظیر اردو کے پہلے شاعر ہیں جن کا کلام پڑھ کر ہندوستان کے حالات اور عام معاشرت اور یہاں کے رسم و رواج کے متعلق معلومات حاصل کیے جاسکتے ہیں''۔[1]

یہ اس زمانے کی بات ہے جب ہندوستانی شعرا اپنی شناخت کو کھوتے ہوئے ایرانی شاعری کی پیروی کر رہے تھے۔ ان کا انداز بیان، بحریں اور مضمون بھی تقریباً وہی تھا۔ جس کی وجہ سے اردو شاعری پر نقالی کا بھی اعتراض کیا گیا۔ کہنے والوں نے تو اسے ایرانی شاعری کا ترجمہ تک قرار دے دیا لیکن یہ پورے

طور پر درست نہیں تھا کیوں کہ میرؔ اور سوداؔ جیسے عظیم شاعروں کے علاوہ بہت سے ایسے شاعر گزرے ہیں جنھوں نے بکثرت ایسے اشعار کہے جو اپنے مضمون، تخیل اور انداز بیان کے لحاظ سے خالص ہندوستانی تھے۔ اسی کڑی کے سب سے عظیم شاعر نظیر اکبرآبادی ہیں جنھوں نے شاعری کی عام روش کو ہی بدل دیا۔ انھوں نے اپنے کلام میں مقامی زندگی کی رنگارنگی، موسموں کا بیان، پھلوں کا تذکرہ، تیوہاروں کا دلکش منظر اور اخلاق و تصوف کو جگہ دی۔

نظیر اکبرآبادی نے عوام سے قریب رہ کر شاعری کی۔ اسی لیے ان کی شاعری میں مقامی رنگ صاف نظر آتا ہے جن میں مختلف تیوہاروں کا ذکر، تقریبوں اور میلوں ٹھیلوں کی رنگارنگی دیکھنے کو ملتی ہے۔ ہولی، دوالی، راکھی، جنم کنھیا جی، بلدیو جی کا میلا، درگا جی کے درشن، کبوتر بازی، پتنگ بازی، تیراکی کا میلا، عرس حضرت سلیم چشتی وغیرہ کے ساتھ ساتھ عید اور شب برات جیسے تیوہار ان کی شاعری کا اہم موضوع ہیں۔

بیسوی صدی کے شاعروں میں نظیر ہی ایک ایسے شاعر گزرے ہیں جنھوں نے انسانی زندگی کے پیچیدہ معاملات و مسائل کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا، زندگی کے رنج و غم، مسرت و انبساط، طبقاتی کشمکش، سماجی تصادم اور عدم مساوات کو شاعری کے ذریعے اجاگر کرنے کی کوشش کی اور ادب کو انسانی زندگی سے قریب تر لا کھڑا کیا۔ انھوں نے اپنے زمانے کے عام رجحان سے الگ ہٹ کر ایسا طرز انداز اختیار کیا جسے انہوں نے خود ایجاد کیا اور خود ہی پروان چڑھایا۔ بقول مخمور اکبرآبادی۔

''کیا یہ طریقۂ کار انسان پر احسان نہیں کہ نظیر نے شعر کی دولت سوسائٹی کے اس طبقے تک پہنچا دی، جو اب تک ہر اعتبار سے نااہل سمجھا جاتا تھا اور اس میں سمجھنے اور غور کرنے کی صلاحیت پیدا کر دی۔ فیضِ سخن ایک بڑی مشہور بات ہے لیکن جس سخن سے صحیح معنی میں فیض پہنچا وہ نظیر ہی کا سخن ہے''۔[2]

نظیر اکبرآبادی نے شاعری میں جس صنف کو اپنی سخن کا موضوع بنایا وہ نظم ہے۔ ناقدین نے بھی نظیر کی نظموں کو ہی ان کی شاعری کا اصل کارنامہ قرار دیا اور یہی صنف انھیں اردو شاعری میں ایک مستقل دور کا بانی قرار دیتی ہے۔

حالیؔ اور آزادؔ جو جدید اردو نظم کے معمار ہیں وہ بھی نظیر کی شاعری سے اثر قبول کیے بغیر نہیں رہ سکے اگر نظیر ریچھ کا بچہ، کوراہرتن، تندرستی نامہ، اوس، موسم زمستان، برسات کی بہاریں، بنجارہ نامہ، ہنس نامہ، مفلسی نامہ جیسی نظمیں نہیں لکھتے تو حالی کی برکھارت، مناجات بیوہ، شکوہ ہند جیسی لافانی نظمیں کیسے وجود میں آتیں۔ اسی وجہ سے نظیر کی شخصیت کا زور اور بھرپور اظہار خیال ان کی نظموں میں ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ انھوں نے شاعری کو مذہب یا دھرم کی عینک سے نہیں بلکہ انسانیت کی آنکھوں سے دیکھا۔ ہولی ہو یا دیوالی، عید کا تیوہار ہو یا شب برات، سکھوں کا تیوہار ہو یا پارسیوں کا نورس وہ ہر جگہ اپنے قلم کا زور دکھاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ آج بھی ان کی نظموں کے ذریعے میل محبت اور

اتحاد کا درس ملتا ہے۔نظیر نے شری کرشن پر جو نظمیں لکھیں ان میں جگہ جگہ مقامی رنگ و آہنگ رونماں ہے۔کرشن کے بچپن کا وہ منظر جس میں وہ دودھ، ماکھن اور ملائی کھاتے تھے اسے نظیر نے کتنے دلکش انداز میں بیان کیا ہے:

تھے جو گوالنوں کے لگے گھر سے جا بجا — جس گھر کو خالی دیکھا اسی گھر میں جا پھرا
ماکھن، ملائی، دودھ جو پایا سو کھا لیا — کچھ کھایا کچھ خراب کیا کچھ گرا دیا
ایسا تھا بانسری کے بجیا کا بالپن — کیا کیا کہوں میں کشن کنہیا کا بالپن ۳؎

دوسری طرف وہ ''بابا نانک شاہ گرو'' اور ''حضرت سلیم چشتی'' پر دل و جان سے نثار نظر آتے ہیں عقیدت کے پھولوں سے پورا سماں مہکا دیتے ہیں۔حضرت سلیم چشتی کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے ان کی شان میں وہ یہ اشعار پڑھتے ہیں:

ہیں دو جہاں کے سلطاں حضرت سلیم چشتی — عالم کے دین و ایماں حضرت سلیم چشتی
سر دفترِ مسلماں حضرت سلیم چشتی — مقبول خاص یزداں حضرت سلیم چشتی
سردار ملک و عرفاں حضرت سلیم چشتی ۴؎

نظیر نے اپنی نظموں میں فقط رنگ و آہنگ کا ذکر نہیں کیا بلکہ ہندوستان کے مخصوص موسموں اور ان کی کیفیات برسات، جاڑا، بسنت اور اومس وغیرہ پر دلکش نظمیں لکھ کر رُت کی سچی علامتوں اور موسمی کیفیات کا گہرا شعور اپنی نظموں میں پیش کیا۔نظم ''جاڑا'' میں وہ موسم کی حالت پر مختلف زاویوں سے نظر ڈالتے ہوئے اس کی ہو بہو تصویر اتارتے ہیں:

جب ماہِ اگھن کا ڈھلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی — اور ہنس ہنس پوس سنبھلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی
دن جلدی جلدی چلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی — پالا بھی، برف پگھلتا ہو، تب دیکھ بہاریں جاڑے کی
چلا خم ٹھوک اچھلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

نظیر کا کمال صرف یہ نہیں کہ انھوں نے سب سے پہلے ان موضوعات پر قلم اٹھایا بلکہ یہ ہے کہ انھوں نے خیالی دنیا کے برخلاف حقیقت کا بیان کیا۔انسانی جذبات و احساسات کی ترجمانی کی، رنگ و نسل، مذہب و ملت کے اختلافات کو خاطر میں نہیں لائے۔ان کی نظر میں قابل احترام چیز انسانی ہمدردی اور بے تعصبی ہے۔ جسے انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے عام کیا۔دوسرے مذاہب کے پیشواؤں اور تیوہاروں کے متعلق ان کی نظموں سے ایک بات تو واضح ہوجاتی ہے کہ ان تیوہاروں، تقریبوں، میلوں، ٹھیلوں کا صرف انھوں نے بیان نہیں کیا بلکہ اس میں پوری دلچسپی کے ساتھ شامل بھی ہوئے۔نظیر نے ہندوؤں کے تقریباً سبھی تیوہاروں پر نظمیں لکھیں لیکن جس کثرت سے ہولی پر نظمیں لکھیں شاید ہی کسی ہندو

شاعر نے اتنی کثیر تعداد میں نظمیں لکھی ہوں۔

نظیر اکبرآبادی ایک ایسے شاعر ہیں جنھیں صحیح معنوں میں ہندوستان کا عوامی شاعر کہا جا سکتا ہے ان کی شاعری میں وطن کی محبت، یہاں کے رسم و رواج، مذہبی عقائد، تیوہار، تقریبات، موسم، کوہ و دریا، صحرا و چمن خاص طور پر شامل ہیں۔انھوں نے اپنی شاعری سے عام و خواص کے دلوں میں جگہ بنائی، معاشرت، سماج اور ماحول کی ترجمانی کر کے انسانیت کے احترام کا جذبہ بیدار کیا۔کلیم الدین اردو کے پہلے ناقد ہیں جنھوں نے باضابطہ طور پر نظیر اکبرآبادی کی شاعری کا تفصیلی محاکمہ کیا اور ادب نواز قارئین میں یہ توجہ مبذول کرائی کہ ہمارے اردو میں بھی ایسا شاعر گزر چکا ہے جس نے حقیقت نگاری کو اپنا وسیلۂ اظہار بنایا۔کلیم الدین احمد لکھتے ہیں:

''نظیر حقیقت طراز شاعر ہیں۔جو چیزیں وہ گرد و پیش میں دیکھتے ہیں، ان کی جیتی جاگتی تصویریں اتارتے ہیں۔اور یہ سب چیزیں خاص ہندوستان کی فضا میں سانس لیتی ہیں۔'' ۶؎

نظیر اکبرآبادی کی شاعری بے تعصبی، رواداری، انسان دوستی اور مساوات کا اعلیٰ نمونہ ہے۔غرض یہ کہ نظیر کی شاعری کا بڑا حصہ اتحاد و یگانگت، انسانی ہمدردی اور بھائی چارگی کی ترجمان ہے۔ان کی ہمیشہ یہی خواہش رہی کہ ہندوستان کے ہندو اور مسلمان آپس میں مل جل کر رہیں اور ایک دوسرے کے دکھ درد میں برابر کے شریک رہیں۔نظیر اپنی شاعری میں یہی درس دیتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ ''مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا'' اور اسی مفہوم کو سرسید احمد خاں اپنے ایک مضمون میں کتنی خوبصورتی سے بیان کرتے ہیں:

''ہندوستان ایک خوبصورت دلہن ہے اور ہندو اور مسلمان اس کی دو آنکھیں اس کی خوبصورتی اس میں ہے کہ اس کی دونوں آنکھیں سلامت و برابر رہیں۔اگر ان میں سے ایک برابر نہ رہی تو وہ بھینگی ہو جائے گی اور اگر ایک آنکھ جاتی رہی تو کانی ہو جائے گی۔'' ۷؎

غرض یہ کہ نظیر کا اول سے آخر تک پورا کلام پڑھ جایئے، کہیں تعصب کی بو تک محسوس نہیں ہوگی۔نظیر کہیں میلوں ٹھیلوں، باغ بغیچوں کی سیر کر رہے ہیں تو کہیں محبوب سے نوک جھونک، کہیں ہولی کھیل رہے ہیں تو کہیں غور و فکر میں ڈوب گئے ہیں کہیں ذکر رسول تو کہیں یاد علی میں گم ہیں، تو کہیں درگا جی کے درشن، کرشن کنہیا کی بھکتی میں لین ہیں۔ان کی شاعری سے محسوس ہوتا ہے کہ ان کے جزبات ابلے چلے آرہے ہیں۔نظیر کا دل بہت وسیع ہے انھوں نے مختلف مذاہب کے ماننے والوں میں فرق نہیں کیا۔

اس طرح نظیر کی شاعری کا مطالعہ کرنے سے یہ بات پورے طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ نظیر نے زندگی آنکھیں کھول کر گزاری تھی ان کی آنکھ کبھی جھپکی ہی نہیں۔اس لیے انھوں نے اپنے بس بھر زندگی کو اچھی

طرح سمجھنے کی کوشش کی ،انھوں نے زندگی کے اونچ نیچ ،بھید بھاؤ،نیکی بدی،امیری غریبی،شرافت زذالت غرض ہر پہلو پر غور فکر کیا اور جس چیز کو جیسا پایا ویسا ہی ہو بہو پیش کر دیا لیکن انسانی ہمدردی ہر جگہ ان کے پیش نظر رہی انسان کی عظمت پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں کہ وہ قدرت کا بیش قیمتی نگینہ بن جاتا ہے بند ملاحظہ ہو:

لے آئینے کو ہاتھ میں اور بار بار دیکھ — صورت میں اپنی قدرت پرور دگار دیکھ
خال سیاہ اور خط مشک بار دیکھ — زلف دراز طرۂ زنار دیکھ
ہر لحظ اپنی چشم کے نقش و نگار دیکھ — اے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ[۸]

اس طرح اردو شاعری میں نظیر کی عظمت اور حیثیت کا تعین ان کی نظموں سے ہی ہوتا ہے۔غزل کے اجمال کے مقابلے میں نظم کی تفصیل اور اس کے اشارے کے مقابلے میں نظم کی یہ وضاحت نظیر کی شاعری کے تمام گوشوں پر حاوی ہے۔ان کی بھرپور شخصیت پوری طرح نظموں میں ہی اجاگر ہوتی ہے انھوں نے اپنی نظموں میں زندگی کے ہر پہلو کو بے نقاب کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔نظیر نے شعر کو زندگی سے اتنا قریب کر دیا ہے کہ زندگی کے تمام پہلوؤں کا عکس ان کی شاعری میں نظر آتا ہے۔ان کے کلام میں محاوروں کا استعمال بھی کثرت سے ملتا ہے۔نظیر کے علاوہ یہ خصوصیت صرف انیسؔ کے کلام میں نظر آتی ہے۔محاوروں کے استعمال سے نظیر کی شاعری کا لطف دوبالا ہو گیا ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

عشّاق جانثاروں میں، میں تو امام ہوں — یہ کہہ کے میں جو اس کے گلے سے لپٹ گیا
کتنا ہی اس نے تن کو چھڑایا جھڑک جھڑک — پر میں بھی قینچی باندھ کے ایسا چمٹ گیا
یہہ کش مکش ہوئی تو گریباں مرا ادھر — ٹکڑے ہوا اور اس کا ڈوپٹہ بھی پھٹ گیا
آخر اسی بہانے ملا یار سے نظیرؔ — کپڑے بلا سے پھٹ گئے سودا تو پٹ گیا[۹]

ان اشعار میں ''قینچی باندھنا'' اور ''سودا پٹنا'' وغیرہ قابل غور ہیں اور یہی نظیر کی زبان و بیان پر عبور کی دلیل ہے کیوں کہ شاعری میں محاوروں کا اتنا خوبصورت استعمال کرنا آسان نہیں جسے نظیر نے کر دکھایا۔چونکہ ان کی شاری کا زیادہ تر حصہ عوامی زندگی پر منحصر ہے اس لیے انھوں نے اپنی شاعری میں عوامی زبان کا ہی استعمال کیا ہے۔نظیر نے شاعری کو عاشق و معشوق،گل و بلبل کی قید سے آزاد کراتے ہوئے حقیقی دنیا میں لا کھڑا کیا اور اردو کی روش کو بدلنے میں کامیابی حاصل کی۔

۱: نظیر اکبرآبادی کے کلام کا تنقیدی مطالعہ،ڈاکٹر سید طلعت حسین نقوی،ص ۳۱۶،۳۱۷
۲: نظیر اکبرآبادی کے کلام کا تنقیدی مطالعہ،ڈاکٹر سید طلعت حسین نقوی،ص ۳۳۳
۳: نظیر اکبرآبادی کے کلام کا تنقیدی مطالعہ،ڈاکٹر سید طلعت حسین نقوی،ص ۳۱۹

۴: نظیر اکبرآبادی کے کلام کا تنقیدی مطالعہ،ڈاکٹر سید طلعت حسین نقوی،ص ۳۱۸
۵: نظیر اکبرآبادی کے کلام کا تنقیدی مطالعہ،ڈاکٹر سید طلعت حسین نقوی،ص ۳۲۷
۶: نظیر اکبرآبادی کے کلام کا تنقیدی مطالعہ،ڈاکٹر سید طلعت حسین نقوی،ص ۳۴۷
۷: نظیر اکبرآبادی کے کلام کا تنقیدی مطالعہ،ڈاکٹر سید طلعت حسین نقوی،ص ۳۵۸/۵۹
۸: نظیر اکبرآبادی کے کلام کا تنقیدی مطالعہ،ڈاکٹر سید طلعت حسین نقوی،ص ۴۵۵،۴۵۴
۹: نظیر اکبرآبادی کے کلام کا تنقیدی مطالعہ،ڈاکٹر سید طلعت حسین نقوی،ص ۴۸۸

Research Scholar,
Dept.of Urdu,A.M.U.202002

اقبال حسن آزاد
کا
تیسرا افسانوی مجموعہ
پورٹریٹ
زیر ترتیب
ثالث پبلیکیشنز ،شاہ کالونی شاہ زبیر روڈ مونگیر

● ارشاد آفاقی

طنز ومزاح کے مابین رشتہ

طنز و مزاح ایک مشکل، نازک اور خطرناک فن ہے۔ اس میں معمولی سی لغزش ابتذال اور پھکڑ پن کا باعث بنتی ہے اور ذرا سی بے اعتدالی اور ناپختگی فن کو مجروح کرتی ہے۔ اور یہ فن طعن وتشنیع سے گزر کر سب وشتم اور دشنام طرازی میں داخل ہو جاتا ہے۔ اور دشمن کے بجائے خود عامل اس کا شکار ہو جاتا ہے اس لئے پھر وہ اپنے چہرے کو دوسروں سے مضمر ہی رکھنا چاہتا ہے کیونکہ بقول رشید احمد صدیقی:۔

''غم وغصّہ میں مقررہ حدود سے تجاوز کر جائے تو لوگ معاف کر دیتے ہیں۔ علالت تک معاف کر دیتی ہے! لیکن ظرافت میں ذرا چوک ہو جائے تو کوئی نہیں بخشتا اور اس لئے نہیں بخشتا کہ بخشنے والا خود منہ دکھلانے کے قابل نہیں رہتا۔'' [1]

لہذا طنز ومزاح نگار کے لیے لازمی ہے کہ وہ اپنے فن پاروں میں ایسے منفرد اسالیب اور آزمودہ حربوں سے کام لے۔ جن کی بدولت وہ اپنے فن کو رکیک اور پست جذبوں سے بچانے کے علاوہ طعن وتشنیع، ابتذال اور فحاش سے پاک رکھیں۔ کیونکہ یہ فن بال سے باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز ہے۔ اس لئے یہاں ذرا قدم ڈگمگانے سے اپنے ہی ہاتھ پیر لہولہان ہو جاتے ہیں۔ نہ یہاں زیادہ شوخی دکھانے کی آزادی ہے اور نہ زیادہ احتیاط سے کام لینے کی گنجائش ہے۔ زیادہ شوخی دکھائی تو پھکڑ پن اور ابتذال کا الزام عائد ہو جاتا ہے اور ذرا احتیاط سے کام لیا جائے تو مضمون سپاٹ اور بے مزہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس لئے دوسرے فنون کے مقابلے میں طنز ومزاح زیادہ دقیق اور نازک فن ہے۔ جہاں لکھنے والے کو بڑی احتیاط، اعتدال اور توازن سے کام لینا پڑتا ہے۔

جہاں تک طنز اور مزاح کے مابین رشتہ اور قرابت کا تعلق ہے۔ یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے میں اسطرح مدغم اور پیوست ہیں جیسے زندگی اور سانس۔ بقول ڈاکٹر روف پاریکھ:۔

''اردو ادب میں طنز اور مزاح اس طرح گھلے ملے اور یک جان ہوتے ہیں کہ ان کی الگ الگ سرحدوں کی نشاندہی بے حد دشوار بلکہ تقریباً ناممکن ہوتی ہے۔'' [2]

[1] طنز خطرناک مشغلہ ہے، رشید احمد صدیقی، ص:۱۹، ماہنامہ شاہراہ دہلی (طنز ومزاح نمبر) شمارہ نمبر:۷، جلد:۷

[2] بحوالہ: اکیسویں صدی: مزاح اور طنز کی صدی ہے، عابد معز، ص:۳، ماہنامہ کتاب نما دہلی، شمارہ نمبر: ۳ جلد نمبر:۴۵

مزاح زندگی، ماحول، سماج اور فرد کی ناہمواریوں اور کمزوریوں کے ہمدردانہ شعور کا نام ہے لیکن طنز حیات، حالات، معاشرے کی بدنظمی اور کجرویوں کا بے رحمانہ اظہار ہے۔ مزاح سماج اور زندگی سے ہمدردی، لگاؤ، انس اور مفاہمت کی پیداوار ہے اس کے برعکس طنز زندگی اور ماحول سے برہمی اور بیزاری کے نتیجے میں رونما ہوتا ہے۔ مزاح نگار کے یہاں تفریحی اور دلگی کا جذبہ ہوتا ہے اور طنز نگار کے یہاں اصلاحی جذبہ، مزاح میں ہمدردی اور مفاہمت اور طنز میں نشتریت اور نفرت کا عنصر غالب رہتا ہے۔ ایک کسی بُرائی، بدی، کمزوری یا کسی چیز پر ہنسنے کے بعد اس سے محبت کرتا ہے اور دوسرا ان پر ہنسنے کے بعد اس سے نفرت کرتا ہے گویا طنز ٹوٹے ہوئے تانے بانے کو بکھیرتا دیتا ہے اور مزاح اسکو جوڑنے کی سعی وتدبیر کرتا ہے۔ رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں

''طنز حربہ ہے، ظرافت طاقت، طنز بغاوت ہے، ظرافت انقلاب۔'' [1]

یہی وجہ ہے کہ اکثر وبیشتر ادباء، محقق اور نقاد طنز کے ساتھ مزاح کا ہونا لازمی اور اہم سمجھتے ہیں جبکہ بعض کا خیال ہے کہ مزاح کے لیے طنز کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ اس سلسلے میں آل احمد سرور رقمطراز ہیں:۔

''طنز اور مزاح میں گہرا تعلق ہے۔ طنز کا ایک مقصد ہوتا ہے۔ یہ زخم لگا کر اصلاح کرنا جانتی ہے۔ مزاح صرف تضادات عجائبات قول وفعل کے فرق ہموار کرنا سکھاتا ہے مزاح میں طنز کی لے ضروری نہیں مگر طنز میں ادبیت اور دلکشی مزاح کی چاشنی سے آتی ہے۔'' [2]

بعض لوگ طنز کو مزاح پر فوقیت اور اہمیت دیتے ہیں اور طنز کو مزاح کے مقابلے میں مقدم سمجھتے ہیں۔ لیکن وزیر آغا کے نزدیک دونوں کی اہمیت، معنویت اور ضرورت یکساں ہے۔ بقول ان کے:۔

''بعض لوگوں کے نزدیک طنز کو اپنی افادیت کے باعث مزاح پر نمایاں فوقیت حاصل ہے۔ ان کا خیال ہے کہ جہاں مزاح ایک قومی کارنامہ ہے۔ وہاں طنز ایک بین الاقوامی حیثیت رکھتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ایسے لوگ مزاح برائے مزاح کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے۔ ان کی دانست میں طنز ہی ادب میں مستقل اقدام کی حامل ہے لیکن درحقیقت یہ نظریہ محض غلط فہمی پر مبنی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ طنز سماج اور انسان کے رستے ہوئے زخموں کی طرف ہمیں متوجہ کر کے بہت بڑی انسانی خدمت سرانجام دیتی ہے لیکن

دوسری طرف خالص مزاح بھی تو ہماری بجھی ہوئی پھیکی اور بدمزہ زندگیوں کو منور کرتا اور ہمیں مسرت بہم پہنچاتا ہے۔ فی الواقع افادیت کے نقطۂ نظر سے دونوں ہمارے رفیق اور غم گسار ہیں اور ہم ایک کو دوسرے پر فوقیت دینے سے قاصر۔'' ۳

۱ طنز خطرناک مشغلہ ہے، رشید احمد صدیقی، ص:۱۹، ماہنامہ شاہراہ دہلی (طنز و مزاح نمبر) شمارہ نمبر: ۷، جلد نمبر: ۷

۲ بحوالہ: مشتاق احمد یوسفی کی ادبی خدمات، ڈاکٹر محمد طاہر، ص:۴۴

۳ اردو ادب میں طنز و مزاح، وزیر آغا، ص:۴۹۔۵۰

دراصل طنز و مزاح ایک ہی سکے کے دو رُخ ہیں کیونکہ جسطرح ایک سکے کے دو پہلوؤں میں کبھی ایک پہلو اوپر اور دوسرا نیچے اور کبھی دوسرا عیاں اور پہلا پوشیدہ رہتا ہے اسی طرح کسی فن پارے میں کبھی طنز زیادہ ہوتا ہے اور مزاح کم اور کبھی مزاح غالب رہتا ہے اور طنز کم اس لئے عموماً خالص مزاح نگار اور خالص طنز نگار معدودے چند ہی ہیں جبکہ طنز و مزاح نگاروں کی تعداد بہت ہیں۔ اصل میں طنز کرتے کرتے مزاح کی ضرورت پڑتی ہے اور مزاح کے ساتھ طنز کی۔

کیونکہ طنز کی آمیزش سے مزاح میں جان پڑ جاتی ہے اور مزاح کی آمیزش سے طنز کی تلخی اور ترشی کم ہو جاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر طنز میں مزاح موجود نہ ہو تو وہ طعن اور دشنام بن کے رہ جاتا ہے اور اگر مزاح میں طنز نہ ہو وہ کبھی کبھی بے مزہ اور پھکڑ بن جاتا ہے۔ بقول شمس الرحمٰن فاروقی:۔

''مزاح میں گہرائی طنز کے بغیر نہیں آسکتی اور طنز کی پہلی شرط غصہ نہیں بلکہ فکر ہے۔'' ۱

فاروقی کی رائے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مزاح تب تک کارگر اور موثر نہیں ہوتا ہے۔ جب تک نہ اس میں طنز کی حلاوت ہو، اور طنز کے لیے گہرا غور فکر، غیر معمول فہم و ادراک، وسیع مشاہدہ و مطالعہ، عرفانِ ذات اور معاشرے کا شعور ہونا لازمی ہے۔ گویا مزاح کی چاشنی اور پیرائے بیان کی لطافت اور مٹھاس کے بغیر طنز استہزاء اور لعن طعن بن جاتا ہے اور طنز کے میل ملاپ کے بغیر مزاح میں گہرائی پیدا نہیں ہوسکتی ہے۔ طنز اور مزاح کے قریبی ارتباط کا ذکر کرتے ہوئے سلیمان اطہر جاوید رقمطراز ہیں:۔

''طنز اور مزاح کی جداگانہ اہمیت کے باوجود وہ باہم دگر مربوط ہوتے ہیں۔ ایک طنز نگار اس وقت تک کامیاب طنز نگار کہلایا نہیں جاسکتا آنکہ اس نے مزاح سے اپنے فن کو تب و تاب نہ دی ہو۔ اسی طرح طنز کے سہارے کے بغیر مزاح کی چاشنی برقرار نہیں رہ سکتی۔ طنز محض گالی بن جاتا ہے اور صرف مزاح پھکڑ پن۔ کیفیت و کمیت میں فرق ہوتا ہے لیکن ایسے فنکار بہت کم ہونگے جنہوں نے محض طنز یا محض مزاح

سے کام لیا ہو اور اگر ایسے ہوں بھی تو ادبی اور معاشرتی اعتبار سے ایسے فنکاروں کو وجود اور عدم موجودگی مساوی ہے۔'' ۲

اس بات کی مزید وضاحت وصراحت کرتے ہوئے ڈاکٹر خالد محمود لکھتے ہیں:۔

''اردو کے بیشتر طنز نگاروں نے پرانے حکیموں کی طرح طنز کی کڑوی کسیلی دوائیں مزاح کی مٹھائی میں لپیٹ کر کھلانے کی کوشش کی ہے۔ اسی لیے خالص طنز اور خالص مزاح کے پہلو بہ پہلو طنز و مزاح کے مشترک نمونوں کی مقدار زیادہ ہے۔'' ۳

۱ مجتبیٰ حسین اور طنز و مزاح نگاری، شمس الرحمان فاروقی، ص:۴۰، ماہنامہ شگوفہ حیدرآباد (مجتبیٰ حسین نمبر) جلد:۲۰

۲ بحوالہ: مشتاق احمد یوسفی کی ادبی خدمات، ڈاکٹر محمد طاہر، ص:۴۸

۳ اردو ادب میں طنز و مزاح کی روایت، مرتب: ڈاکٹر خالد محمود، ص:۱۲

مندرجہ بالا تمام آراء سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ طنز اور مزاح ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم اور ضروری ہے۔ اور ان دونوں کے مابین چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جس کا اعتراف سہیل انور نے ان لفظوں میں کیا ہے:۔

''جب بھی طنز کا چرچہ ہوتا ہے حسِ مزاح کا شعوری و غیر شعوری طور پر در آنا ضروری ہے۔ اسی طرح جب بھی مزاح کی بابت باتیں ہوتی ہیں تو طنز کا عنصر کسی نہ کسی صورت میں اس میں شامل ہوتا ہے۔ لہذا دونوں صورتیں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔'' ۱

ڈاکٹر خان محمد عاطف نے طنز و مزاح پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

''طنز ہی دراصل مزاح ہے اور لطافت کا دوسرا نام مزاح ہے۔'' ۲

حالانکہ اگر تجزیاتی نقطہ نظر اپنایا جائے تو دونوں جدا جدا ہے لیکن دونوں میں چولی دامن کا ساتھ بھی ہے۔ ان دونوں کے درمیان گہرا رشتہ اور قریبی ارتباط ہے مگر طنز کو مزاح سمجھنا اور مزاح کو طنز سمجھنا ٹھیک نہیں۔ البتہ دونوں کے میل میلاپ اور ربط و ضبط سے ایسی گہری مفاہمت پیدا ہوگئی کہ یہ دونوں یک جان ہوگئے۔ اسلوب احمد انصاری لکھتے ہیں:۔

''مزاح زندگی کے غیر متناسب اور بے جوڑ مظاہر کو نمایاں کرنے سے پیدا ہوتا ہے اور طنز کی ہلکی ہلکی آمیزش اُسے جاندار، تابناک اور دیرپا بنا دیتی ہے۔'' ۳

مختصراً یہی کہا جاسکتا ہے کہ طنز مزاح میں اور مزاح طنز میں اس طرح مدغم اور پیوست ہوگئے کہ بعض

اوقات ان دونوں کی علٰحیدہ علٰحیدہ سرحدوں کی تشخیص کرنا نہ صرف محال بلکہ تقریباً ناممکن ہو جاتی ہے۔اوراس کے لیے یہ دلیل ہی کیا کم ہے کہ اردو ادب میں ان دونوں صفات اور خوبیوں کو ایک ساتھ استعمال کیا جاتا ہے اور دونوں کی موجودگی کا احساس ایک ہی فن پارے میں بیک وقت ہوتا ہے۔اس لیے اُردو ادب میں خالص طنز نگاروں یا مزاح نگاروں کا وجود اور عدم موجودگی یکساں ہے جبکہ طنز و مزاح نگاروں کی تعداد ان گنت ہے۔

◄◄ ● ►►

Lecturer in Urdu,Dept.of Education,Kashmir
Rampura,Bandipura,Kashmir-193502
9622746499، 08803522834

۱۔ مرزا فرحت اللہ بیگ بحیثیت مزاح نگار (طنز و مزاح کے فرق کے تناظر میں) ص:۲۱، ماہنامہ آجکل نئی دہلی، شمارہ نمبر:۲، جلد نمبر:۶۲

۲۔ فارسی شاعری میں طنز و مزاح، ڈاکٹر خالد محمد عاطف، ص:۶

۳۔ رشید احمد صدیقی بحیثیت مزاح نگار، اسلوب احمد انصاری، مشمولہ رشید احمد صدیقی۔ کردار، افکار، گفتار، مرتب: مالک رام، ص:۱۱۳

قطرہ قطرہ احساس کے بعد

اقبال حسن آزاد

کا

دوسرا افسانوی مجموعہ

مردم گزیدہ

شایع ہو چکا ہے

صفحات : ۱۶۰

قیمت : ۲۵۰/روپے

ملنے کا پتہ: ثالث پبلیکیشنز، شاہ کالونی، شاہ زبیر روڈ، مونگیر

- **یاد رفتگاں**
- **مصطفیٰ کریم**

پیارے بھائی! سید ارتضیٰ کریم کی یاد میں

تم ۷ جولائی ۲۰۱۴ء اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔افسوس آخری دنوں میں، میں تمہارے پاس نہیں تھا اور نہ ہی تمہیں مدفون کرتے وقت خدا حافظ کہہ سکا۔تم سے پانچ ہزار میل کی دوری اور میری اپنی طبعی مجبوریوں نے مجھے بے بس کر رکھا تھا۔تم ہمارے والد کی وفات (۱۹۳۴ء) کے دو مہینہ بعد پیدا ہوئے تھے۔ مجھے شہر آرہ کی وہ صبح یاد ہے جب تمہیں نہلا دھلا کر سفید سلفچی میں لٹا دیا گیا تھا۔تم رو رہے تھے شاید ابا کو اب کبھی نہ دیکھنے کا تمہیں غم تھا۔تمہیں دیکھ کر میں حیرت میں ڈوبا ہوا تھا۔''یہ اجنبی کون ہے؟ اس سے میرا کیا رشتہ ہوگا؟'' چار سال کی عمر میں ممکن ہے یہ سوالات میرے ذہن میں آئے ہوں۔اور پھر کچھ دنوں بعد سردی کی ایک دوپہر میں والدہ تمہارے ساتھ لیٹی ہوئی تھیں اور میں پاس کی پلنگ پر پاؤں کی موچ سے آزردہ آرام کر رہا تھا۔اچانک گھن گرج کی آواز بلند ہوئی، چھت ہلنے لگی اور زلزلہ، زلزلہ پکارنے کی سہمی ہوئی آوازیں آنے لگیں۔اماں تیزی سے اٹھیں، تمہیں گود میں سمیٹا اور دوسرے ہاتھ سے مجھے پکڑ کر بالا منزل سے نیچے اترنے کے لیے بھاگیں۔وہ سماں مجھے اب تک یاد ہے۔سیڑھیاں اور تڑختی دیواریں ہل رہی تھیں۔اماں کوئی آئت پڑھتی ہوئی ہم دونوں کو لپٹائے نیچے جا رہی تھیں۔پھر وقت خشک ریت کی طرح بند مٹھی کے ماہ و سال سے پھسلتا گذر گیا۔ہم اپنے نانا قاضی علیم الدین کے سایۂ عافیت میں زندگی گذارتے رہے۔

چند سال بعد تم جب چار سال کے تھے نانا ابا کا گھر مہمانوں سے بھرا تھا۔ہم تم مخمل کی شیروانی، کامدار مغلیہ جوتی اور ٹوپی میں ملبوس خوش و خرم کرسیوں پر بیٹھے تھے۔تمہارے چہرے پر جو معصومانہ مسکراہٹ تھی اسے میں کبھی فراموش نہیں کر سکا۔لیکن جلد ہی ہماری خوشی خاک میں مل گئی۔نائی کسی قاتل کی طرح اپنے خون آلودہ استرے کو صاف کر رہا تھا۔تم مارے اذیت کے روتے ہوئے تسلی کے لیے مجھے پکار رہے تھے۔ابا مرحوم تو تھے نہیں جو تمہیں چمکارتے اور دلاسہ دیتے۔ان کی جگہ مجھے ہونا چاہئے تھا۔لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔اسوقت نہیں اور بعد میں بھی نہیں۔باپ وہ ستون ہوتا ہے جس سے کسی مقناطیسی ڈور سے بندھی

اولادیں گردش کرتی رہتی ہیں۔کبھی کبھی اور اکثر وہ ڈور کھینچتا ہے۔اولاد اس سے لپٹ جاتی ہے اور ایک دوسرے کی توانا قربت محسوس کرتی ہے۔ ہماری زندگی میں وہ ستون ٹوٹ چکا تھا اور ایک عجیب سی بیگانگی اور ساتھ ہی غیریت کا احساس ہماری زندگیوں سے عبارت ہو چکا تھا۔

کچھ عرصہ بعد تمہارا ایک نیا وصف نمایاں ہوا۔تمہاری پوشاک اور رہائش میں اعلیٰ درجہ کی نفاست آ گئی۔تم جو لباس بھی پہنتے اس میں سلیقہ اور صفائی ہوتی۔اور گو تمہارے کمرے میں کوئی شے قیمتی نہیں ہوتی لیکن ان سب کی تنظیم اور ترتیب میں جو جمالیاتی زیبائش تھی وہ ہم سبھوں کو حیرت زدہ کر دیتی تھی۔ جسے ہم یہاں معاون خانہ کہتے ہیں اور جو ترقی پذیر ملکوں میں نوکر یا نوکرانی کے نام سے بلائے جاتے ہیں انکے کام کا آغاز تمہارے کمرے سے شروع ہوتا تھا۔نانا ابا مرحوم کو جانور اور پرند پالنے کا شوق تھا۔چوں کہ وہ پولس میں نوکری کر چکے تھے اس لیے گھر کے اصطبل میں ایک گھوڑا بھی موجود ہوتا تھا۔تمہیں گھڑ سواری کسی نے نہیں سکھائی لیکن گھوڑے پر چڑھنے اور اسے بھگانے کی خداداد صلاحیت تم میں تھی۔افسوس میں اس ہنر سے بیگانہ رہا۔

میں نے میٹرک کس طرح پاس کر لیا وہ معمہ تھا۔سچ تو یہ ہے کہ جسے تعلیم حاصل کرنا کہتے ہیں وہ ۹۴ء سے شروع ہوا۔اس سے دو سال پہلے مجھے کتابوں سے کوئی شغف نہیں تھا۔آوارہ گردی اور فضولیات میرا شیوہ تھا۔پتہ نہیں کیسے اچھے ناولوں اور افسانوں کی کتابوں میں مجھے غیر معمولی دلچسپی ہوگئی اور جواب تک قائم ہے۔اسی دلچسپی نے مجھے حصول تعلیم میں آخر سنجیدہ بنا دیا۔اسی سنجیدگی نے مجھے وہ بنایا جو میں اب ہوں۔ جب تم اسکول کے آخری سالوں میں تھے تو تمہیں اور میری دو بہنوں کو ایک ماسٹر صاحب پڑھانے کے لیے آتے تھے۔انھوں نے فیصلہ سنا دیا تھا کہ تم ہم سب میں سب سے زیادہ ذہین ہو۔اس ذہانت کے ساتھ تمہاری دلچسپی ٹینس میں بھی ہوگئی۔سر پر گھنگریالے بال،خوش پوشاک اور خوش شکل بھی جو تمہاری چپٹی ناک کو نمایاں نہیں ہونے دیتی۔ ہمارے معاشرے کی جہالت کی وجہ سے عیب کو شخصیت کی کمزوری بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی جاتی۔تمہارے ساتھ بھی یہی زیادتی ہونے لگی۔لیکن تم نے کوئی پروا نہیں کی اپنی راہ پر چلتے رہے۔میٹرک تم نے امتیازی درجہ میں پاس کیا اور مزید تعلیم کے لیے علیگڈھ چلے گئے۔اس اثنا میں تمہارے گلے میں غدود کا آپریشن کسی پرائیوٹ ہسپتال میں ہوا جہاں نانا ابا اپنی ضعیفی کے باوجود تمہاری تیمارداری کے لیے تمہارے بستر کے قریب زمین پر سویا کرتے تھے۔آپریشن کامیاب ہوا اور تمہاری چپٹی ناک سیدھی ہونے لگی۔شاید ان ہی دنوں کی بات ہے کہ میں تعلیم کے سلسلے میں الہ آباد چلا گیا تھا اور میری سائیکل جو میری آوارہ گردی کے لیے مخصوص تھی وہ تمہارے استعمال میں آنے لگی۔تم اس کی دیکھ بھال اس طرح کرتے تھے کہ ہمیشہ نئی لگتی۔سائیکل ایک دن چوری ہوگئی جس کا ملال مجھے اس قدر ہوا کہ میں نے تم

سے بولنا چالنا بند کر دیا۔جس کا قلق تمھیں بہت ہوا۔لیکن وقت کے ساتھ ہماری باہمی خلش کم ہوگئی۔اسی زمانے میں عزیز احمد کا ناول گریز شائع ہوا تھا۔جس میں جنسی محرکات کو مصنف نے بڑی بیباکی سے پیش کیا تھا۔اس بیباکی میں منٹو جیسی فنکاری نہیں تھی۔ ذہنی تلذذ حاصل کرنے کا ذریعہ اس کتاب میں تھا۔میری بلوغت کا آغاز ہو چکا تھا۔میں اس کتاب سے وہ جمالیاتی تسکین نہیں حاصل کر سکا تھا جو مجھے کرشن چندر کے ناول شکست سے حاصل ہوئی تھی۔گو بعد میں مجھے احساس ہوا کہ یہ محض رومانی داستان ہے اور ناول کی سطح پر کامیاب نہیں ہے۔میرے پاس صف اول کے ہر مصنف کی تخلیات موجود تھیں اور مشہور ادبی جرائد بھی تھے لیکن ان میں تم نے کبھی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ایک دن میں نے تمہیں گریز پڑھتے دیکھا تو میں اچانک تمہارا گارجین بن بیٹھا اور تمہیں اس قسم کی کتابوں کو پڑھنے سے سخت الفاظ میں منع کیا۔ یہ میری زیادتی تھی اور تمہیں اچھے ادب سے روشناس کرانے کا موقعہ میں نے گنوا دیا۔تم مسلم یونیورسیٹی علیگڈھ سے ایک ممتاز انجیرینگ کالج میں چلے گئے اور میں اس سے چند سال پہلے ڈھاکہ میڈیکل کالج چلا گیا۔ پاکستان قیام میں آ چکا تھا۔تم نانا ابا اور اماں کی خاطر ہندوستان میں رہ گئے تھے اور میں پاکستان میں تھا۔ہم دونوں کے درمیان ایک ناعبور طبعی دوری آ چکی تھی۔ یہ دوری باہمی خط و کتابت کے ذریعہ نہ صرف دور ہو جاتی بلکہ ایک دوسرے کو کچھ زیادہ ہی قریب لے آتی۔خطوط اگر بغیر کسی جھجک کے لکھے جائیں تو انسان ان میں وہ کچھ لکھ سکتا ہے جس کا اظہار زبانی نہیں کر سکتا۔خطوط کی افادیت بہت سی باتوں کی طرح میری سمجھ میں اس وقت نہیں آئی تھی۔میری خیریت جاننے کے لیے اماں اور نانا ابا مرحوم کے منت بھرے خطوط آتے اور میں ایک دو لفظ لکھ کر ٹال دیتا۔خط و کتابت تمھیں بھی پسند نہیں تھی۔میں ایم بی بی ایس کرنے کے بعد فوج میں کمیشنڈ افسر بن گیا۔اور تم چند سال بعد انجینئر بن گئے۔تمہیں ملازمت نہ صرف انجینیرنگ کی ڈگری بلکہ تمہاری غیر معمولی اسمارٹنس کی وجہ سے بھی ملی تھی۔شہر کلکتہ میں تم ایک مشہور کمپنی سے منسلک تھے۔رہائش کسی ہاسٹل میں تھی جہاں بیرے تمہاری دیکھ بھال کرتے تھے۔شام کے وقت تم ٹینس کلب کھیلنے کے لیے جاتے تھے۔ہاسٹل میں عمدہ خورد و نوش کا انتظام تھا۔ ملنے جلنے والوں میں حسین بنگالی عورتیں بھی تھیں۔الغرض تمہیں رفیقۂ حیات کی ضرورت نہیں محسوس ہوئی۔اماں اور نانا ابا کے اصرار کے باوجود تم شادی کے لیے رضامند نہیں ہوئے۔ان ہی دنوں تمہارا وجود میرے لیے باعث تسکین ہو گیا اور ایک عجیب سی پراسرار طاقت بھی مجھے محسوس ہونے لگی۔

ملازمت تمہیں پونہ اور بعد میں بمبئی لے آئی جہاں تم سمندر سے قریب ایک عمدہ فلیٹ میں رہتے تھے۔بمبے جمخانہ جس کا رکن بننا آسان نہیں ہوتا اس کی رکنیت بہ آسانی تمھیں مل گئی۔اس بڑے شہر میں تمہاری

زندگی جسے بہ قول تمہارے Good Life کہا جاتا ہے وہ تمہیں بہ آسانی میسر آ گئی۔ اماں کبھی کبھی تمہارے پاس جاتی تھیں لیکن تمہاری غیر موجودگی میں انہیں کرب ناک تنہائی محسوس ہوتی۔ اس لیے ان کا بمبئی میں رہنا ہمیشہ عارضی رہا۔ بمبے جم خانہ میں تمہاری دوستی چند غیر مسلم حسین سندھی عورتوں سے بھی ہوگئی۔ ان میں سے کسی ایک کے ساتھ تم نے شادی کیوں نہیں کی میرے لیے معمہ رہا۔ میں جن دنوں مری سی۔ ایم۔ ایچ میں اسٹاف کیپٹین تھا میری شادی حیدرآباد میں ہوگئی۔ یہ شادی بڑی خوشی کا موقعہ نہیں تھا۔ چوں کہ مجھے نوکری راس نہیں آ رہی تھی اور میں مزید تعلیم کے لیے انگلینڈ جانا چاہتا تھا۔ اس لیے ایک الجھن سی مجھے برابر رہتی تھی۔

میری شادی میں تم بھی اماں اور نانا ابا کے ساتھ شریک ہوئے۔ اور شادی کے بعد میرے ساتھ اماں کے علاوہ تم بھی آ گئے۔ مری میں تم نے اپنے نو بیاہتا بھائی اور بھاوج کی خلاقانہ تصویریں کھینچیں۔ ان میں ایک جو سب سے حسین تھی وہ میرے اور میری بیوی کے درمیان شدید جھگڑے کا باعث بنی۔ میں اسے لاؤنج میں ٹانگنا چاہتا تھا۔ تصویر میں بیگم کے چہرے پر مسے کے جو داغ تھے وہ کچھ نمایاں سے تھے اور اس لیے وہ تصویر بیگم کو ناپسند تھی اور وہ اسے ایسی جگہ نہیں دیکھنا نہیں چاہتی تھیں جہاں سب کی نگاہ اس پر پڑے۔ اس جھگڑے کا سایہ ہماری شادی شدہ زندگی پر ہمیشہ ہی رہا۔ شکر ہے یہ واقعہ تمہارے اور والدہ کے واپس جانے کے بعد ہوا۔ میں کچھ عرصہ کے بعد انگلینڈ مزید سرجیکل ہنر سیکھنے اور ایف آر سی ایس کرنے آ گیا۔ ہجرت کے بعد سبھی دشواریاں برداشت کرتے ہیں۔ لیکن میری زندگی میں وہ دور آیا کہ مجھے محسوس ہونے لگا کہ میرا سایہ بھی مجھ سے جدا ہو گیا ہے۔ ایک وقت وہ بھی آیا جب مجھ پر ہارٹ اٹیک ہوا جس کے بعد اس ملک میں مستقلاً رہ جانے کا فیصلہ میں نے کر لیا۔ دائمی جدائی کا غم تم اور اماں نے کسی طرح سہہ لیا۔ جب میرا بیٹا ناصر کریم پیدا ہوا تو اس کی شکل تم سے بہت ملتی تھی اور اس کے سر پر بھی تمہاری طرح گھنگریالے بال تھے۔ جب وہ بڑا ہوا تو اسے بھی ٹینس میں غیر معمولی دلچسپی ہوگئی۔ اماں کچھ دنوں کے لیے میرے ساتھ آ کر رہی تھیں لیکن ساس بہو کے جھگڑے اور بیگانگی نے دونوں کی مسرت کو خاک میں ملا دیا تھا۔ جس کا ملال ہم دونوں کو ہمیشہ رہا۔ جدائی کی دوری نے ہم دونوں میں ایک ایسی قربت پیدا کر دی تھی جسے الفاظ بیان نہیں کر سکتے۔ میرا ممبئی جانا کئی بار ہوا۔ ہر بار تمہاری نفاست کی خوشبو سے بسے گھر میں اپنے گھر سے زیادہ سکون اور راحت کا احساس ہوا۔ تم بھی کئی بار انگلینڈ آئے اور میرے ساتھ آ کر رہے۔ تم جس کمرے میں سوتے تھے وہاں میز پر وہ گول نشان اب بھی موجود ہے جہاں تم گرم چائے کا پیالہ رکھتے تھے۔ ہر صبح میں چائے لے کر بالا منزل منزل پر تمھیں جگا کر چائے دیتا تھا اور اس کے بعد دیر تک ہم باتیں کرتے۔ میرے پاس عظیم موسیقاروں کے وہ تین ریکارڈ اب بھی موجود ہیں جسے تم نے مجھے دیا تھا۔ میری ادبی تخلیق میں تمہیں دلچسپی نہیں تھی۔ یہاں تک کے

ناولٹ، ڈاکٹر بینرجی کی سیاسی تباہی، جسے میں نے تمہارے نام معنون کیا تھا، اسے تمہارے پاس سے کوئی لے گیا اور کبھی واپس نہیں کیا، لیکن تم نے اسے اس شخص سے طلب نہیں کیا۔ مجھے اس بے قدری کا افسوس برابر رہا۔

اور اب کیا لکھوں سوائے اس کے کہ ہم تم اس منزل پر مدت ہوئی آ گئے تھے جہاں اپنی اداسیوں اور خوشیوں میں گھرے ہم عمر کے احساس سے ماورا ہو جاتے ہیں اور اچانک موت ایک جھٹکے کے ساتھ آ جاتی ہے۔ لیکن پیارے بھائی تم اس جہان سے کیا گئے اپنے بھائی کی ایک کائنات بھی ساتھ لے گئے۔ تم نے اپنی زندگی میں کسی کو آزردہ نہیں کیا۔ ستم کیا تو خود پر۔ دائمی تنہائی کو رفیق زندگی پر ترجیح دیا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد ممبئی میں اپنے دوستوں، عزیزوں اور جمخانہ کو چھوڑ کر پونہ میں بس جانے کا فیصلہ کر لیا۔ جہاں تمہارے خوبصورت فلیٹ میں، جس کی بالکونی سے نیچے ننھا باغ نظر آتا تھا، وہاں سرطان، دل کی شدید بیماری اور تنہائی کی عطا کردہ ذہنی ہیجان تمہارے ساتھی بنے۔ چند ہفتہ پہلے تم کسی وجہ سے رات کو اٹھے اور میز سے ٹکرا کر گر گئے۔ تمہارے کولھے کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ دوسرے دن اسی بے بسی کے عالم میں تمہاری معاون خانہ نے تمہیں زمین پر پڑا پایا۔ اس نے کسی طرح تمہیں اٹھا کر صوفے پر بٹھایا۔ کسی قسم کی امداد طلب کرنے سے تم نے اسے منع کر دیا۔ دوسرے دن جب وہ تمہارے فلیٹ میں آئی تو تم اسی طرح بے بس اور بیکس صوفہ پر بیٹھے تھے۔ تمھیں ہسپتال لے جایا گیا جہاں تم بارہ دنوں کے بعد اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ بغیر کسی شکوے کے۔ بغیر کسی فریاد کے ..... فلسطین کے حریت پسندوں کو چھوٹی سی امداد دے کر میں نے سرزمین فلسطین پر اماں، نانا ابا، ابا اور تمہارے نام پر زیتون کا درخت لگوایا ہے۔ سنتے ہیں زیتون کا درخت ہزاروں سال تک شجر دار رہتا ہے۔ اس درخت کے پتوں میں جب ہوا سرسرائیگی تو اس سرسراہٹ میں تمہاری روح بھی نغمہ خواں ہوگی۔ اور اس درخت کے پھل سے دلیر فلسطینیوں کو تمہاری ذات کی توانائی ملے گی۔

◀◀ ● ▶▶

غضنفر کی کتابیں

نام کتاب: روئے خوش رنگ	نام کتاب: آنکھ میں لکنت
صنف: خاکہ	صنف: شاعری
سن اشاعت: ۲۰۱۴ء	سن اشاعت: ۲۰۱۵
صفحات: ۲۰۰	صفحات: ۲۵۶
قیمت: ۲۵۰/روپے	قیمت: ۳۰۰/روپے

پتہ: اکادمی آف پروفیشنل ڈیولپمنٹ آف اردو میڈیئم ٹیچر، نوم چومسکی کمپلکس، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

- **خاکہ**
- **غضنفر**

سیانا مجذوب

کچھ نوجوان اساتذہ مجھ سے ملنے میرے گھر آئے تو دورانِ گفتگو اُن سے میں یہ سوال بھی پوچھ بیٹھا۔

''لیکچرز کیسے لگ رہے ہیں؟''

''زیادہ تر تو پھسپھسے، بے مغز اور بے مصرف۔ بیشتر خطبوں میں وہی چربائی عملی کارفرما ہوتا ہے جس سے آج کل کے مقالے تیار کیے جاتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ وہاں گوند سے چربوں کو صحیح جگہ پر چسپاں کر دیا جاتا ہے اور یہاں گوند نہ ہونے کی وجہ سے چربے اِدھر اُدھر ہو جاتے ہیں اور خیال کا تانا بانا چرمرا جاتا ہے۔ کوئی کوئی تو رسورس پرسن ایسا بھی آتا ہے جس کے موادی غُبّارے کی ہوا پچیس تیس منٹ کے اندر ہی نکل جاتی ہے اور غُبّارے کے ساتھ ساتھ غُبّارہ اُڑانے والا بھی لجلجا ہو کر ایک طرف کو پڑ جاتا ہے۔''

ان میں سے ایک نوجوان کے اس جواب پر چونک کر میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ پھر سے بول پڑا۔

''مگر آپ کا لیکچر ہمیں پسند آیا۔ اس لیے کہ وہ لیک سے ہٹ کر تھا اور آپ کے پڑھانے کا انداز بھی خاصا موثر تھا۔''

''یہ تو منہ دیکھے کی بات ہوئی۔'' میں نے اپنا ردّعمل ظاہر کیا تو اس نے نہایت ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

''نہیں، یہ منہ دیکھے کی بات نہیں ہے بلکہ دل سے محسوس کیا ہوا سچ ہے۔ ہم منہ آگے اور پیٹھ پیچھے دونوں جگہ وہی کہتے ہیں جو محسوس کرتے ہیں۔ اگر آپ کا لیکچر پسند نہیں آیا ہوتا تو ہم اس کا بھی تیا پانچا کر ڈالتے جیسا کہ اکثر کلاس روم میں کرتے رہتے ہیں۔''

اس کی بے باکی مجھے اچھی بھی لگی اور بری بھی۔ اچھی اس لیے کہ سچ بولنے کی اس میں ہمت تھی اور اس کا یہ بے لاگ تقابلی تبصرہ بلا کسی مصلحت کے سچ کو سامنے لا رہا تھا اور بری اس لیے کہ میری تربیت جس طرح کے ماحول میں ہوئی تھی اور میری شخصیت جس نہج پر پروان چڑھی تھی اس کا تقاضا تھا کہ اس نوع کی بے باکی میری سماعت پر گراں گزرے اور مجھے ناگوار محسوس ہو۔ میں جس معاشرے سے آتا ہوں وہاں

بے باکیاں دل و دماغ میں تو پنپ سکتی ہیں، زبان پر نہیں آسکتیں۔

جاتے وقت وہ مجھے اپنی ایک تازہ ترین کتاب بھی دے گیا۔ میں نے وہ کتاب کھولی تو اس بے باک لیکچرار کا تحریری منہ بھی کھلتا چلا گیا اور میرے اندر بار بار اقبال کے ایک شعر کے دونوں مصرعے الگ الگ ابھرتے رہے کبھی ع

چپ رہ نہ سکا حضرتِ یزداں میں بھی اقبالؔ

اور کبھی ع

کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا منہ بند

اس نوجوان لیکچرار سے میری دوسری ملاقات اس کے شہر میں ہوئی۔ وہاں میرا ایک دفتری پروگرام چل رہا تھا جس میں وہ بھی شریک تھا۔ ایک دن اسے معلوم ہوا کہ میری طبیعت خراب ہوگئی ہے تو وہ میرے پاس آیا اور ضد کر کے مجھے ہوٹل سے نکال کر اپنے گھر لے گیا۔ وہاں اس کی بیوی نے بھی میرا کافی خیال رکھا۔ بار بار میرے لیے پانی گرم کیا۔ صبح شام جو شاندہ ابالا۔ پرہیزی کھانوں کا اہتمام کیا اور میرا درد اور تنہائی بانٹنے کے لیے اپنے معمولات کو تج کر میرے پاس بیٹھی۔ مجھ سے باتیں کیں۔ ہلکے پھلکے قصّے سنائے ادبی سیاست پر تبادلۂ خیال کیا اور وقفے وقفے سے گرم گرم چائے بھی پیش کرتی رہی۔ میاں بیوی دونوں نے وہ اپنائیت دکھائی کہ مجھے ذرا بھی محسوس نہیں ہوا کہ میں گھر سے باہر ہوں۔ ہر وقت یہ لگتا رہا کہ میں اپنے چھوٹے بھائی بہن کے درمیان ہوں۔ اس کے گھر پر قیام کے دوران میں نے خود سے اس کا موازنہ کیا تو اس معاملے میں خود کو چھوٹا پایا۔ شاید میں وہ نہیں کر سکتا تھا جو اس نے کیا تھا۔ کسی پرائے مرد کو مہمان بنانا اور اپنی غیر موجودگی میں اسے اپنی بیوی کے پاس گھنٹوں اکیلا چھوڑ دینا کوئی آسان کام نہیں مگر اس نے یہ مشکل کام آسانی سے کیا اور مجھے یہ نکتہ بھی سمجھا گیا کہ ذہن کشادہ ہو اور دل میں تنگی نہ ہو تو کوئی بھی کام مشکل نہیں ہے اور بنا بولے یہ بول بھی دل میں اُتار گیا کہ بھروسا اعتبار کو جنم دیتا ہے اور اعتبار سے بہاریں ملتی ہیں، کھوتی نہیں۔ تقریباً پانچ چھ دنوں کا یہ قیام میرے لیے برسوں کا تجربہ گاہ ثابت ہوا۔ گھر بیٹھے بیٹھے مجھ پر زندگی کے اسرار منکشف ہوتے رہے۔ ایک دن اس نوجوان لیکچرار کی بیوی ناشتے کے دوران مجھ سے بولی۔

''غضنفر صاحب! آپ بالکل صوفی لگتے ہیں۔'' اس کے اس ریمارک پر میں چونکا تو اس نے وضاحت کی۔

''آپ کی نگاہیں ہمہ وقت مراقبے میں رہتی ہیں جبکہ عام طور پر مردوں کی نظریں بھٹکتی رہتی ہیں اور دور رہ کر بھی قریب سے چبھتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ میرے شوہر کے دوسرے دوست بھی آتے رہتے

ہیں اور قیام بھی کرتے ہیں مگر ان میں سے کسی کے ساتھ بھی میرا ایسا مشاہدہ نہیں رہا جیسا کہ آپ کے سلسلے میں ہوا۔ مجھے یہ مشاہدہ یونیک بھی لگا اور اچھا بھی۔''

اس کے اس مشاہدے سے مجھے اپنی شرافت کا پتا تو چلا ہی یہ علم بھی ہوا کہ بعض آنکھیں اپنوں کے گھر کو بھی نہیں بخشتیں جبکہ ڈائن بھی سات گھر چھوڑ کر شکار کرتی ہے اور یہ بھی کہ عورت کتنی آسانی سے نگاہِ نیک و بد کو تاڑ لیتی ہے اور یہ نکتہ بھی سامنے آیا کہ اعلا ظرف کم ظرفوں اور کم ظرفیوں کو سمجھنے کے باوجود اپنے ظرف کو تنگ نہیں کرتا۔

اس پروگرام کے بعد وہ میرے کئی اور پروگراموں میں بھی شریک ہوا۔ اپنے شہر میں بھی اور شہر کے باہر بھی۔ ہر جگہ وہ میرے پروگرام میں دل، دماغ، آنکھ، کان، زبان سب کے ہمراہ شامل ہوا۔ کبھی اس نے یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ وہ اپنا دماغ گھر پر چھوڑ آیا ہے یا دل کہیں اور رکھ آیا ہے۔ اپنی آنکھیں کہیں اور جما دی ہیں یا اپنے کان کہیں اور لگا دیے ہیں یا آنکھیں تو کاغذ پر ہیں مگر زبان کسی اور کے کان میں پڑی ہوئی ہے۔ اس کے مکمل انہماک کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ہمارے نتائج بہتر نکل آتے اور کم تگ و دو میں بھی میری سرخ روئی بڑھ جاتی۔ سرکاری پروگراموں میں فنانسیل دباؤ بہت ہوتا ہے اور یہ دباؤ کبھی کبھی تو اتنا بھاری ہو جاتا ہے کہ دل و دماغ دب کر رہ جاتے ہیں۔ نسیں اینٹھ سی جاتی ہیں۔ اعصاب چرمرا جاتے ہیں۔ اس کی موجودگی میں اس دباؤ سے بہت حد تک مجھے نجات مل جاتی۔

ایک مرتبہ میرے ایک دوست نے مجھ سے شکایت کی کہ میں ایک ہی آدمی کو بار بار پروگرام کیوں سونپتا ہوں، جواب میں میں نے صرف اتنا کہا:

''اب سے یہ پروگرام میں آپ کو سونپتا ہوں۔ کل نو بجے سے پہلے پہلے میرے ہوٹل آ جایئے۔ آتے وقت دو چار گلدستے بھی لیتے آیئے گا اور کچھ ریزگاری بھی۔ باقی کیا کرنا ہے یہ کل صبح میں آپ کو سمجھا دوں گا اور ہاں، اس تیاری کے ساتھ آیئے گا کہ شام کے سات آٹھ بجے سے پہلے آپ کو فرصت نہیں مل پائے گی اور یہ سلسلہ کم سے کم ہفتہ بھر تو ضرور چلے گا۔'' میری بات سن کر وہ بے دلی سے بولا۔

''باقی سب تو ٹھیک ہے مگر یہ وقت والا مسئلہ بڑا ٹیڑھا ہے۔ اتنا وقت میں چاہوں بھی تو نہیں دے سکتا۔'' اپنے اس دوست کی اس بات پر میں نے اس سے کہا۔

''مگر اتنا وقت وہ شخص مجھے دیتا ہے بلکہ اکثر اس سے زیادہ بھی دیتا ہے۔ صبح جلسہ گاہ کی نشستوں کے انتظام سے لے کر اخبارات کے لیے رپورٹ تیار کرنے تک میرے ساتھ رہتا ہے اور اکثر مجھے رات کا کھانا کھلا کر رخصت ہوتا ہے۔''

''کیا وہ سچ مچ ایسا کرتا ہے؟'' اس نے چونکتے ہوئے سوال کیا۔

''آپ کو یقین نہیں آ رہا ہے تو کل صبح ساڑھے آٹھ بجے آپ میرے ہوٹل آ جایئے اور رات میں بھی ایک چکّر لگا جایئے آپ کی حیرت کا جواب آپ کو مل جائے گا۔''

''تب تو تم نے صحیح آدمی کا انتخاب کیا ہے، میں اپنی شکایت واپس لیتا ہوں۔''

ایک بار اس کے کسی قریبی دوست نے میری بیوی سے جو ایک پروگرام میں میرے ساتھ تھیں کہا کہ یہ غضنفر بھی عجیب ہیں۔ اکاؤنٹ کا کام بھی اسے سونپ دیا۔'' میری بیوی نے ان سے پوچھا کہ کوئی خاص بات ہے کیا؟'' اس پر وہ صاحب ہکلاتے ہوئے بولے۔

''نہیں نہیں، کوئی خاص بات نہیں ہے۔ یوں ہی یہ جملہ میرے منہ سے نکل گیا۔ دراصل اس کام میں نزاکتیں بہت ہوتی ہیں نا شاید اس لیے.....''

وجہ خواہ جو بھی رہی ہو میری بیوی کو ان صاحب کا یہ جملہ کچھ اٹ پٹا سا لگا اور جب میں نے سنا تو مجھے بھی کچھ عجیب سا لگا اور نہ چاہتے ہوئے بھی میری نگاہیں اس پروگرام کے اکاؤنٹ میں جا الجھیں مگر حساب کتاب میں کوئی بھی عدد مجھے ادھر سے اُدھر نظر نہیں آیا۔ لیکھا جوکھا، جوڑ، گھٹاؤ، ضرب، تقسیم کسی میں کوئی الجھاؤ نہیں تھا۔ سب کچھ صاف صاف اور واضح تھا۔ جب میں نے یہ واقعہ اسی شہر کے اپنے کسی اور دوست کو تفصیل سے سنایا تو وہ بولا۔

''ممکن ہے ان صاحب کا کوئی مشاہدہ رہا ہو اور آپ کے معاملے میں ڈائن کے سات گھروں والا مثل حائل رہا ہو اس پر میں نے دوبارہ اپنے آس پاس سے ذرا ہٹ کر غور کیا تو یہ ڈائن مجھے دور دور تک کہیں نظر نہیں آئی۔ میں نے تو یہ دیکھا کہ جتنا اُسے اس کے کاموں کا معاوضہ ملتا تھا اس سے کہیں زیادہ وہ مجھ پر اور دوسرے مہمانوں پر خرچ کر دیتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ پروگرام کی تصویریں جو فرداً فرداً لوگوں کو بھیجتا تھا ان کے اخراجات بھی وہ خود ہی برداشت کرتا تھا۔ مجھے دُکھ بھی ہوا کہ اندیشے کا ڈنک مجھ میں پیوست ہوا مگر اس سے زیادہ خوشی بھی ہوئی کہ وہ ڈنک رگ و ریشے میں زہر اُتارے بنا ہی باہر نکل گیا اور میرے استاد کے اس جملے نے ٹھنڈک کا کام کیا کہ اپنی اہمیت بڑھانے اور دوسرے کی وقعت گھٹانے کے لیے بھی کچھ شوشے چھوڑے جاتے ہیں۔ اس میں کسی بدنیتی کا دخل نہیں ہوتا۔

میرے پروگراموں کے دوران اس کی انتظامی صلاحیتوں کا سکّہ تو چمکا ہی اس کے علمی استعداد کا جوہر بھی خوب دمکا، اور اس کی شخصیت کا ایک ایسا پہلو بھی ابھر کر سامنے آیا جس پر مجھے تو حیرت ہے ہی خود اسے بھی تعجب ہوتا ہوگا۔ نجی نشستوں میں اس کی گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی اردو میں بھوجپوری اپنی

ٹانگ پھنساتی رہتی ہے اور علاقائیت قدم قدم پر اسے لنگڑی مارتی رہتی ہے اور اس مار سے کبھی فعل مجروح ہوتا ہے، کبھی مفعول پر ضرب لگتی ہے اور کبھی فاعل لڑکھڑا پڑتا ہے اور کبھی کبھی تو حرفِ جار یا حرفِ ربط کی ٹانگیں بھی ٹوٹ جاتی ہیں اور جملہ بیٹھنے لگتا ہے مگر وہ شخص جیسے ہی کسی ادبی یا علمی محفل میں بولنے کھڑا ہوتا ہے تو اس کی اردو ایسی رفتار پکڑتی ہے جیسے وہ بھوجپور کی کسی پگڈنڈی پر نہیں بلکہ لکھنؤ یا پرانی دلّی کی کسی شاہ راہ پر دوڑ رہی ہو۔ جملے ایسے موزوں، مربوط اور معنی خیز نکلتے ہیں جیسے اسٹیج پر کوئی انسان نہیں بلکہ کمپیوٹر کھڑا ہو اور اس کے اندر موضوع سے متعلق مواد کسی اچھے زبان داں یا بہتر انشا پرداز نے فیڈ کیا ہو۔

اس شخص کی علمی گفتگو اور اس کی تحریروں میں بھی وکیلانہ وصف نظر آتا ہے۔ یہ وصف اس کے علمی دعوے کی ڈور کو دیر اور دور تک تھامے رہتا ہے۔ اسے کسی بھی موڑ پر کٹنے نہیں دیتا۔ وہ اپنی علمی یا انتقادی پتنگ کے لیے ایک ایسا وسیع آسمان تلاش کرتا ہے اور اپنی ڈور کو مواد و مآخذ اور دلائل و شواہد کے مانجھے سے اس قدر مانجھتا ہے کہ اس کی پتنگ اونچی اڑان تو بھرتی ہی ہے آس پاس کی نئی پرانی پتنگوں کو کاٹتی بھی جاتی ہے۔

کبھی کبھی وہ اپنے اس وصف کو اتنا دھار دار اور جارحانہ بنا دیتا ہے کہ وہ ضرر رساں بھی بن جاتا ہے اور نیّت نہ ہونے کے باوجود کسی کے ذہن و دل کو چھلنی کر دیتا ہے۔ اس کی تحریر کے اس تیور کے اسباب پر میں نے غور کیا تو مجھے یہ نہیں لگا کہ یہ تیور کسی خفگی، رنجش اور عداوت کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے بلکہ مجھے یہ اس ردعمل کا نتیجہ معلوم ہوا جو کسی آئیڈیل کے بکھرنے یا اس آئیڈیل کے نظر نہ آنے کے سبب ظہور میں آتا ہے اور کبھی سچ بولنے کی بیماری کا بخار لگا جو چڑھتا ہے تو شدّتِ تپ سے دوسروں کو بھی تپا دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے اس بے باکانہ اور جارحانہ تیور کو دکھانے میں وہ یہ بھول جاتا ہے کہ زد میں آنے اور زدوکوب ہونے والا اس کی راہ میں کبھی زرفشانی بھی کرتا رہا ہے۔

اسے کتابیں جمع کرنے کا جنون ہے۔ وہ جس شہر میں بھی جاتا ہے بوریاں بھر کر وہاں سے کتابیں لاتا ہے اور اس انہماک سے کتابوں کی بوریاں ڈھوتا ہے جیسے وہ نوٹوں کے بنڈل ہوں جبکہ ہم میں سے زیادہ تر لوگوں کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ ہمیں اگر دو چار سے زیادہ کتابیں تحفے میں مل جاتی ہیں تو ہم پریشان ہو اُٹھتے ہیں اور حتی المکان ان سے بچنے کی سعی کرتے ہیں۔ جیسے ہمارے تھیلے میں کتابیں نہیں چوہے یا بچھو گھُس گئے ہوں۔ اگر ہم پر اخلاقی دباؤ نہ ہو تو ہم انھیں وہیں کہیں کسی کونے میں چھوڑ آئیں۔

اس کا یہ جنون کتابیں جمع کرنے اور اپنی لائبریری کو ثروت مند بنانے تک محدود نہیں ہے بلکہ کتابوں کے کھولنے اور انہیں گھنٹوں کھولے رکھنے میں بھی نظر آتا ہے۔ اس کی یہی دیوانگی اسے فرزانگی عطا کرتی ہے اور اسی کے سبب اس کی تحریریں ایک ایک کی مرکزِ توجہ بنتی ہیں۔

اس کی تحریریں بتاتی ہیں کہ وہ کسی موضوع کو ہلکے میں نہیں لیتا بلکہ ہر موضوع کو وہ بھاری سمجھتا ہے اور اُسے بارِ عشق کی طرح اپنے ذہن و دل پر اُٹھاتا ہے۔ اس کا قلم جب اُٹھتا ہے تو کسی ایک موڑ تک جا کر نہیں رکتا بلکہ ہر گلی کوچے سے گزرتا ہے اور موضوع کے تمام نشیب و فراز تک پہنچتا ہے۔ ضرورت پڑنے پر سرسید کی طرح چھینکوں پر چڑھنے اور رسیوں کے سہارے بلندیوں تک جانے کا جوکھم بھی اُٹھاتا ہے۔ شاید اسی لیے اس کی تحریریں بعض ذہنوں پر گراں بھی گزرتی ہیں اور ان کے دلوں کو بھاری کر دیتی ہیں۔

وہ جو بھی لکھتا ہے نہایت محنت و مشقت سے لکھتا ہے۔ اس کے لیے مشق و مزاولت سے کام لیتا ہے۔ لکھنے سے پہلے بہت کچھ پڑھتا ہے اور ایک بار نہیں بلکہ بار بار پڑھتا ہے۔ پڑھتے وقت اس کی نگاہیں ہمیشہ اس نکتہ کی تلاش میں رہتی ہیں۔ جسے اُسے پانا ہوتا ہے۔ راہ کی ادبی و فنی پرفریبیاں بھی اسے روک نہیں پاتیں۔ وہ وہیں جا کر دم لیتا ہے جہاں اس کا آخری پڑاؤ ہوتا ہے۔ ارجن کی طرح ہر وقت اس کی نگاہ بھی مچھلی کی آنکھ پر ٹکی رہتی ہے اسی لیے اس کا نشانہ کبھی خطا نہیں ہوتا۔

وہ سیریس سے سیریس سچوئیشن میں بھی اپنا آپا نہیں کھوتا۔ گرد بادی فضا میں بھی ثابت قدم رہتا ہے۔ نامساعد حالات کا نہایت اطمینان سے مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے اور بادِ مخالف سے آخری دم تک جوجھتا رہتا ہے۔ اپنی جیت سے نہ زیادہ خوش ہوتا اور نہ اپنی ہار سے بہت زیادہ رنجیدہ۔ اس کی شخصیت کا یہ متوازن پہلو اسے ٹوٹنے نہیں دیتا۔ پسپائی میں بھی اسے جوڑے رکھتا۔

اس کی تحریریں اس لیے بھی باوزن محسوس ہوتی ہیں کہ ان کا مال و متاع صرف اردو تک محدود نہیں رہتا بلکہ ان میں ہندی اور انگریزی ادب کے گنجہائے گرامایہ کا سرمایہ بھی شامل ہوتا ہے اور یہ سرمایہ وہ کسی کنجیکا کے سہارے حاصل نہیں کرتا بلکہ اپنی اس کلیدِ زبان سے خزانے کو کھول کر نکالتا ہے جس میں اردو کے ساتھ ساتھ ہندی اور انگریزی کے ابجد بھی اچھی طرح کھُد گئے ہیں۔

وہ ایسا لیکچرار ہے جس کے گھر پر بھی شاگردوں کا ہجوم لگا رہتا ہے۔ وہ اپنے شاگردوں کو صرف شکشا ہی نہیں دیتا بلکہ ان کے ہاتھوں میں ایسے استر شستر بھی تھما دیتا ہے جن سے وہ زندگی کے مختلف سمتوں میں میدان مارتے چلے جاتے ہیں۔ لوگوں کا یہ مشاہدہ ہے کہ وہ اپنے شاگردوں کو درون آچاریہ کی طرح شکشا دیتا ہے مگر بعض لوگوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ وہ اکلویہ کی طرح انگوٹھا بھی کٹوا لیتا ہے۔ کتنے انگوٹھے کٹے یہ منظر تو کبھی دکھائی نہیں دیا البتہ اس کے آس پاس کچھ ہاتھ انگوٹھا دکھاتے ہوئے ضرور دکھائی پڑے۔

وہ شاگردوں کے ساتھ ساتھ اپنے متعلقین کے لیے بھی فکرمند رہتا ہے۔ اس نے تقرری کے سلسلے میں ایک شخص کی مجھ سے پرزور سفارش کی جو ہر طرح کی مضبوطی کے باوجود برسوں سے

لڑکھڑاتا پھر رہا تھا۔ اس سفارش کے پیچھے اس کی غرض صرف اتنی تھی کہ شاید وہ اس آدمی کو لڑکھڑاتا اور ٹھوکریں کھاتا ہوا نہیں دیکھ سکتا جو چلنے بلکہ دوڑنے کی اہلیت رکھتا ہو۔

وہ محبوباؤں کی طرح روٹھتا ہے اور عاشقوں کی طرح گھٹتا ہے۔ خفگی میں اس کے لب تو بند ہو جاتے ہیں مگر دوستوں کے لیے اس کے دل کے دروازے کھلے رہتے ہیں۔ ناراضگی کے عالم میں بھی وہ اپنے دوستوں کے سارے کام خاموشی سے انجام دیتا رہتا ہے۔ اس کے ان کاموں کی روداد بھی کسی نہ کسی طرح مشتہر ہوتی رہتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کے اپنے لب نہیں کھلتے۔ اس معاملے میں وہ واقعی محبوب بن جاتا ہے۔ اس کے کچھ دوست تو اُسے منا لیتے ہیں جو محبوب کی فطرت اور نفسیات سے واقف ہوتے ہیں۔ مگر کچھ اُسے یوں ہی چھوڑ دیتے ہیں یا وہ خود بھی اسی کی طرح محبوب بن جاتے ہیں۔ ایسے میں اُسے عاشق بننا ہی پڑتا ہے۔ یہ عمل اس کے لیے خاصا جبریہ ثابت ہوتا ہے مگر اس سے اس کی دوستی کا ثبوت بھی فراہم ہوتا ہے۔

اس شخص کی بے باکانہ محویت کے منظر یوں تو آئے دن دکھائی دیتے رہتے ہیں مگر حالیہ دنوں میں حیدرآباد کے ایک سفر کے دوران ایک ایسا مشاہدہ بھی ہوا کہ آنکھیں حیرت زدہ ہو کر رہ گئیں۔ اس منظر میں دریائے گنگا کا شناور بحرِ ہند کے موتی چننے میں اس طرح غرق ہے کہ پہلے سے جمع لولو و مرجان سے بھی بے نیاز ہو گیا ہے۔ ارجن کی طرح اس کی نظریں مچھلی کی آنکھ پر اس طرح مرکوز ہو گئی ہیں کہ آس پاس کا ماحول تو کیا خود مچھلی بھی اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی ہے۔ میں جب جب اسے قریب سے دیکھتا ہوں تو وحید اختر کا یہ شعر ؎

ٹھہری ہے تو اک چہرے پہ ٹھہری رہی برسوں　　بھٹکی ہے تو پھر آنکھ بھٹکتی ہی رہی ہے

سر سید احمد خاں کو ٹیڑھی نظر سے دیکھنے، اپنے محسن پروفیسر وہاب اشرفی کو نہ بخشنے اور دیگر کئی مضبوط صفوں میں گھس کر توڑ پھوڑ مچانے اور کچھ نئی پرانی کتابوں کی سیاہی کو روشن کرنے والا صفدری وصف سے مملو یہ ارجن کوئی اور نہیں، خاندانِ قادریہ کا وہ سیانا مجذوب ہے جسے نہ ستائش کی تمنا ہے، نہ صلے کی پرواہ اور نہ ہی اپنے ٹوٹنے بکھرنے کا کوئی خوف۔ کیا اب بھی یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ صفدری صفات رکھنے اور راہِ پُر خطر پر مستانہ وار چلنے والا یہ امام کون ہو سکتا ہے؟

◀◀ ● ▶▶

Academy of Professional Development of Urdu Medium Teacher
Nomchomski Complex,Jamia Millia Islamia,New Delhi-110025
Mob:09990237388

● علی اکبر ناطق

سیاہ ٹھپہ

جیل کی چار دیواری کے مضافات میں بھی جیل کی زمین ہے۔ یہاں سارا دن وہ قیدی، جن کی قید چند ماہ رہ جانے کی وجہ سے اُن کے بھاگ جانے کا اندیشہ صفر ہو، یا جن کا آگا پیچھا کوئی نہ ہو اور وہ سال ہا سال سے جیل کو اپنی ملکیت سمجھے بیٹھے ہوں، آپ اُنہیں اِن مضافات میں کام کرتے دیکھ سکتے ہیں۔ بظاہر یہ بے ضرر قیدی جیل کے افسران کے نجی کام کرتے نظر آتے ہیں مگر حقیقت میں جیل کے اندر اور باہر کے درمیان ایسا رابطہ ہیں، جو منشیات اور پیغامات کی منتقلی کا کام دیتے ہیں۔ مجھے نہ تو قیدیوں میں دلچسپی تھی اور نہ اِس علاقے سے، جہاں اِن کا وجود پایا جاتا ہے۔ محض اُس آدمی کے لیے وہاں جانا پڑا۔ میں نے گاڑی جیل کی مضافاتی دیوار کے پاس روکی اور پیدل ایک دیوار کا گیٹ عبور کیا، جس کا ایک حصہ کبھی کا ٹوٹ چکا تھا۔ ایک کچی راہداری پر چل دیا، جو بارش کے دنوں میں یقیناً کیچڑ سے بھر جاتی ہوگی لیکن اس وقت وہ گرد سے اٹی ہوئی تھی۔ یہ چھوٹی سی کچی سڑک سو قدم چلنے کے بعد جیل کے مرکزی گیٹ تک چلی گئی تھی۔ سامنے گھاس کے میدان میں کٹی ہوئی ٹاہلیوں کے چار پانچ موٹے تنے بے ترتیبی سے پڑے تھے۔ اِن کے نیچے سے کھُردری گھاس کی لمبی جڑیں دور تک پھیلی تھیں اور تنوں کے موٹے چھلکوں کو پھاڑ کر اندر گھس رہی تھیں۔ ان کے اردگرد بھی گھاس اتنی اونچی اور گھنی تھی کہ یہ موٹے اور بھاری تنے اُس میں گویا چھپے ہوئے تھے۔ اِن سوکھے تنوں سے کچھ فاصلہ آگے جا کر لہسن، پیاز اور سبزیوں کی کیاریاں نظر آ رہی تھیں اور جامنوں کے دو اونچے پیڑ بھی تھے۔ اِن کے پتے پانی کی کمی کے باعث پیلاہٹ میں تبدیل ہو رہے تھے لیکن اُن کی کسی کو پروا نہیں تھی۔ کیاریوں میں جیل کے وہی قیدی کام کر رہے تھے، جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ بعض کے پاؤں میں بیڑیاں بھی تھیں۔ یہ بیڑیاں دو لوہے کے سریوں اور تین کڑوں پر مشتمل تھیں۔ اس کی وجہ سے پاؤں اور گردن میں دھبے اور سیاہ گٹے پڑ چکے تھے۔ کچھ فاصلے پر مکئی اور چری کی فصلیں رجوا ہے تک چلی گئی تھیں۔ ان فصلوں میں آٹھ دس گائے اور کچھ بھینسیں چر رہی تھیں۔ اِن کے چرواہے بھی وہی قیدی تھے جن کا پہلے دو بار ذکر ہو چکا ہے۔ کئی ٹنڈ منڈ اور سوکھے پیڑوں کی چوبوں پر کوئے اور گِدھیں بیٹھی آرام کر رہی تھیں۔

کچھ ہی دیر میں میں جیل کے مرکزی دروازے پر پہنچ گیا جو بڑے بڑے بدمعاشوں کو نگل چکا تھا۔ دروازے کے دائیں پٹ میں ایک چھوٹی مگر مضبوط لوہے کی کھڑکی تھی۔ جس میں پیدل قیدیوں کو دھکے

مار کر اندر کیا جاتا ہے۔ اگر کوئی قیدی احتیاط سے کام نہ لے تو اُس کا سر بُری طرح سے ٹکرا جانے کا خطرہ ہے۔ اس دروازے کے دائیں طرف سینکڑوں ملاقاتی اپنے اپنے سامان کے ساتھ دور تک بکھرے تھے۔ سامان کے گٹھڑ اُن قیدیوں کے لیے تھے، جن کی ملاقات کو یہ لوگ آئے تھے۔

میرے پاس اُس قیدی کے لیے کچھ سامان بھی تھا۔ دودھ، بسکٹ، ڈبل روٹی اور اسی طرح کی روزمرہ استعمال کی چیزیں۔ کافی بھاری بیگ بن چکا تھا۔ اُسے اُٹھائے میں اُنہی ملاقاتیوں میں شامل ہو گیا، جو میرے آنے سے پہلے لمبی قطار بنائے کھڑے تھے۔ مجھے اُن کے وہاں پہلے آ جانے پر بھی شدید کوفت ہوئی لیکن یہ وہ کوفت تھی، جس کا اظہار نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں دو کیبن تھے، جن میں دو پولیس والوں پر مشتمل عملہ غصہ پیدا کر دینے والی سُست رفتاری سے سامان کا اندراج کر رہا تھا۔ لیک میں اس کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا کہ ذلت آمیز انتظار اور اُس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی اُکتاہٹ جیسی دو مشکلوں پر قابو رکھوں۔

یہ جولائی کے شدید اور کاٹ دینے والے دن تھے۔ تین چار شیشم کے درختوں کا سایا بھی تھا لیکن یہ سایا اُس لمبی لائن سے ہٹ کر تھا، جو کیبن کے سامنے لگی تھی۔ قطار میں کھڑا ہونے والا شخص اس سایے سے محروم ہو جاتا۔ ملاقاتیوں میں زیادہ تعداد بوڑھی عورتوں اور مردوں کی تھی۔ جن کے چہروں پر صدیوں کی بے نوری، حسرتیں اور کرب صاف دیکھے جا سکتے تھے۔ جیل کے دیوہیکل دروازے کے سامنے اِن کی حیثیت اُن بے کار اور بوسیدہ ہڈیوں کی تھی جنہیں شہر کے باہر بے احتیاطی سے پھینک دیا گیا ہو۔ اچانک میری نظر اُس خاتون پر جا پڑی۔ وہ میرے جانے سے پہلے وہاں موجود تھی۔ اُس کے ساتھ اُس کا ایک بیٹا تھا۔ چودہ سال کا ہوگا۔ مجھے لوگوں کی عمر کا اندازہ لگانے میں کبھی غلطی نہیں ہوئی۔ خاص کر جن میں میری دلچسپی شامل ہو۔ اُن دونوں کے پاس بھی ایک گٹھڑی تھی۔ کیا یہ حیرت کی بات نہیں کہ ملاقات کو آئے تمام لوگوں کی گٹھڑیوں میں ایک ہی سامان ہوتا ہے۔ واہیات یکسانیت کے ساتھ۔ جس کو چرانے سے بھی کراہت آتی ہے۔

اُس کی عمر پینتالیس سال تھی۔ میرا یہ اندازہ بھی ٹھیک تھا۔ اُس کے بیٹے کی عمر کی طرح میں اُس لڑکے سے دس سال بڑا تھا۔ اگر یہ عورت آج رات..... میرے تمام جسم میں ایک دم سنسنی پھیل گئی۔ نہیں نہیں یہ ناممکن ہے۔ میں نے ایسا کیوں سوچا؟ اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں۔ مجھے ایسے بیہودہ قیاسات کرنے کی عادت ہو چکی ہے۔ بہر حال لعنت بھیجیں ایسی چیزوں پر جن کے سوچنے میں انسان کا اختیار نہیں۔ میں نے اُس عورت سے رسمی سلام لیا اور سامان اُس لڑکے کے حوالے کر دیا، جو اُس لائن میں اب چوتھے نمبر پر تھا۔ اس کے بعد میں نے پولیس والے کے پاس جا کر کچھ پیسوں کے ساتھ تمام بات سمجھا دی اور ہم دونوں کا سامان میرے ہی نام سے اندراج کرنے کا فیصلہ ہو گیا۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد میں دوبارہ گیٹ پر آ گیا اور ملاقات کی منظوری کا لیٹر ایک کارندے کو پانچ سو روپے کے ساتھ سپریڈنٹ جیل کے پاس بھجوا دیا۔ ایک گھنٹے تک کی بوجھل تھکاوٹ اور تاریک ڈیوڑھی کی بدبودار خاموشی کے بعد مجھے اُس قیدی سے ملاقات کی

اجازت مل گئی۔ ڈیوڑھی کا اندرونی دروازہ پار کرنے سے پہلے میرے بائیں ہاتھ کی دستی پر ایک ٹھپہ لگا دیا گیا۔ اِس کا مطلب تھا، میں ملاقات کے بعد جیل سے باہر نکل سکتا ہوں۔ جیل کے اس دروازے کی ہیبت بہت زیادہ تھی۔ میرے اندر ہوتے ہی دونوں طرف کے تیس فٹ اُونچے اور آٹھ فٹ چوڑے آہنی پٹ بند ہوئے تو آواز کی دھمک میرے سینے پر لگی۔ اُس دن مجھے اندازہ ہوا کہ اندر کتنا خوفناک منظر تھا۔ باہر سے بڑی دیوار کے اندر ایک ہی جہان آباد لگتا ہے۔ جس میں رہنے والے ایک ہی قبیلے کے لوگ ہوں مگر ایسا نہیں تھا۔ اصلی جیل آگے تھی۔ ڈیوڑھی سے آگے ڈرا دینے والی دیواریں اور حیران کر دینے والے مناظر تھے، جنہیں آپ مناظر نہیں کہہ سکتے۔ یہاں پھر میرے سامنے ایک ایسی ہیبت ناک دیوار موجود تھی جو بیرونی فصیل جتنی اُونچی تو نہیں تھی لیکن اس کی وحشت اُس سے کہیں زیادہ تھی۔ مٹی کی یہ کچی دیوار، جس کے اُوپر بجلی کی ننگی تاریں اور بڑی بڑی لائٹیں بھوتوں کی طرح ڈرا رہی تھیں، اصل میں جیل کی نگہبان تھی۔ اس پر چکنی مٹی، بھوسے اور باریک کنکروں کا لیپ کیا گیا تھا جس کی مشقت بھی قیدیوں نے کی تھی۔ ایک سپاہی میرے ساتھ تھا جس نے اس دیوار میں پیوست لوہے کے بڑے دروازے کی چھوٹی کھڑکی کھول کر مجھے اندر داخل کر دیا اور اندر سے ایک دوسرے سپاہی نے مجھے وصول کر لیا۔ اب میں حقیقی جیل میں داخل ہو چکا تھا۔ میری آنکھیں بے شمار دیواریں اور گلیاں دیکھ رہی تھیں..... دھوپ سے بھری ہوئی۔ دیواروں میں لگے ہوئے چھوٹے چھوٹے دروازے تھے۔ گلیاں ویران اور دیواریں گرمی سے ہونک رہی تھیں۔ نگہبان عملہ، جس کا مزاج قیدیوں سے مختلف نہیں تھا، ریفلیں پکڑے گویا اپنی ہی قید پر پہرہ دے رہا تھا۔ میں سپاہیوں کی نگہبانی میں ایک گلی سے دوسری اور ایک دیوار کے بعد دوسری دیوار سے نکلتا چلا گیا۔ میں نہیں جانتا، اب تک کتنے نگہبان مجھے ایک دوسرے کے حوالے کر چکے تھے۔ لیکن اتنا جانتا تھا۔ میں ایسی بھول بھلیوں میں پڑ گیا کہ اپنی مرضی سے واپس نہیں جا سکتا تھا۔ بہت سی بارکیں اور بارکوں میں رہنے والے قیدیوں کے پاس سے گزرا، جو اپنے پنجروں میں اُن خونخوار جانوروں کی طرح بند تھے۔ یہ سب جانور تھے۔ میں یہ سوچ کر کانپ اُٹھا اور آنکھیں بند کر لیں۔

ہر بارک ایسی دنیا تھی، جس کا ساتھ والی دنیا سے کوئی تعلق نہیں۔ اِن کے آپس میں نہ دن ملتے تھے نہ راتیں۔ بالآخر مجھے ایک ایسے چھوٹے سے احاطے میں لے جایا گیا جس کی دیواروں پر لوہے کا جال پھیلا کر اُسے اُوپر سے مکمل طور پر بند کر دیا گیا تھا۔ احاطے کے اندر چاروں طرف بندی خانے اِس قدر مضبوط اور لوہے سے جکڑے ہوئے تھے کہ دیو بھی ہو تو اوندھا پڑا رہے۔ ہر بندی خانے میں ایک آدمی تھا۔ جس کی لمبائی قیدی کے قد سے زیادہ نہیں تھی اور چوڑائی محض چار فٹ۔ اِسی کے اندر ٹائیلٹ بھی تھے۔ اُس کی بدبو قیدی کے دماغ میں اس طرح سرایت کرتی کہ اُس کے لیے زندگی اور موت میں فرق ختم ہو جاتا اور پھانسی کے وقت اُسے زیادہ تکلیف نہ ہوتی۔ یہ سب سزائے موت کے قیدی تھے۔ جنہیں جہنمی فرشتوں نے

ڈھکیل کر ان بندی خانوں میں جکڑ دیا تھا۔ یہاں ویرانی نوحہ پڑھتی تھی، دھوپ سفید آگ برساتی تھی، خاموشی بین کرتی تھی اور قیدیوں کی بے نور آنکھیں اندھیروں سے خیرات مانگتی تھیں۔ مجھے انہی میں سے ایک قیدی سے ملاقات کرنا تھی۔ جس کی ہم نے ہائی کورٹ میں جاں بخشی کی اپیل کر رکھی تھی۔

''یہی ہے آپ کا آدمی۔'' نگہبان نے ایک بندی خانے میں نیم دراز شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ بہت خوبصورت نوجوان تھا۔ تیس سال کا ہوگا۔ قید کی مصیبت نے چہرے میں بے رونقی تو پیدا کی تھی مگر نین نقش بلا کی ذہانت اور کشش کی گواہی دیتے تھے۔ بالکل اپنے بھائی کی شکل پر تھا، جسے میں باہر چھوڑ آیا تھا۔ بندی خانے کی دیوار کے ساتھ پُشت لگائے غنودگی میں کچھ سوچ رہا تھا۔ میں نزدیک ہوا تو اُس نے آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا۔ میں اُس قیدی کے سامنے بیٹھ گیا۔ لیکن اُس نے نہ میرے سلام کا جواب دیا، نہ خیر باد کہا۔ ہم کچھ دیر خاموش ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے رہے۔ حتیٰ کہ لوہے کی سلاخوں نے بھی کوئی آواز پیدا نہ کی۔ مجھے اُس دن پتا چلا کہ موت میں کتنا سکوت اور وحشت ہے؟

''میرا نام مظہر ترمذی ہے۔'' کافی دیر کی خاموشی کے بعد میں نے بات شروع کی۔

''عزیز احمد، ہمیں تمھاری زندگی کی ضرورت ہے۔ ہمیں انسانی زندگی کی ضرورت ہے۔ ہماری تنظیم جسے انسانی حقوق کی تنظم کہا جاتا ہے، وہ چاہتی ہے، آپ کو بچا لیا جائے۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

لیکن دوسری طرف سے خاموشی رہی۔ جواب نہ پا کر میں دوبارا بولا۔

''دراصل ہمیں اِنہی کاموں کی تنخواہ ملتی ہے۔ یہی ہمارے معمولات ہیں۔'' میں پھر چُپ ہو گیا۔ اُس کی طرف سے مکمل خاموشی تھی۔ مجھے پھر بولنا پڑ۔

''آپ کی جگہ کسی دوسرے قیدی کو منتخب کر لیا جاتا تو ہم اُس کے لیے کام کرتے۔'' میری اِس بات پر اُس نے اپنا سر اُوپر اُٹھایا اور بولا۔

''وہ کون سی بات ہے جس کی وجہ سے آپ کی تنظیم نے مجھے منتخب کیا ہے؟''

''میں نہیں جانتا۔'' میں نے دوٹوک کہا۔

''لیکن میں جانتا ہوں۔'' اُس کی آنکھوں میں طاقت سی پیدا ہوئی۔

''وہ میری ماں ہے۔''

اگر اُسے سب پتا تھا تو مجھے چھپانے کی کیا ضرورت تھی؟ اس معاملے میں جتنا اعتماد پیدا ہوتا، اچھا تھا۔ چنانچہ میں نے واضح طور پر تو نہیں لیکن تائیداً کہا۔

''عزیز احمد! آپ کے کسی جاننے والے کا آپ کی ذات میں دلچسپی لینا فطری بات ہے۔ ہماری

تنظیم تک آپ کی رپورٹ کسی گردش میں آئی ہے۔ ورنہ تنظیم کو کیسے پتا چلتا کہ آپ کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ خدا اسی طرح اسباب پیدا کرتا ہے ورنہ فطرت کسی اور کو منتخب کر لیتی۔''

اب وہ مجھ سے بات کرنے کے لیے ذہنی طور پر آمادہ ہو چکا تھا۔ اُٹھ کے دوزانو ہوا اور بولنے لگا۔

''مظہر ترمذی صاحب! آپ کا خیال ہے، فطرت سب ٹھیک کرتی ہے۔ اگر ایسا کرتی تو میرے لیے یہ جگہ ہرگز ٹھیک نہیں تھی۔ دیکھیے، اس جگہ میں نے سینکڑوں قے کی ہیں (ٹائیلٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے)۔ کال کوٹھڑی کا یہ ٹائیلٹ جو میری عین پُشت کے ساتھ ہے۔ اس کی سڑانڈ میرے اندر بس چکی ہے۔ میری روح اور ہڈیوں کے گودے تک اس کی منحوس بدبو شامل ہے۔ یہ ٹائیلٹ میری بجائے یہاں کے سپریڈنٹ کے لیے بھی ہو سکتا تھا۔ لیکن وہ دن میرے لیے ہی تھا۔ اتنا بے برکت اور بدہیئت کہ میں اُس کی تصویر اپنی آنکھوں سے چھیل نہیں سکا۔ حالانکہ میں کبھی غیرت مند نہیں رہا۔ نہ مجھے یہ دعوہ ہے کہ اس نام کی کوئی شے کسی رسم سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ مگر قیاس کیجیے، جب کوئی شخص اس طرح دلدل میں پھنس جائے اور اُسے یہ تک نہ پتا چلے کہ اپنے باپ کا ماتم کرے یا ماں کی خواہشات اور اُس کے فیصلوں کو روئے، تو اُس کے دماغ کا کرب کون جان سکتا ہے۔'' میں نے اب اُس سے دوٹوک بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

''تم جو بھی ہو..... تم اس وقت میرے لیے ایک ایسے قیدی کی حیثیت رکھتے ہیں، جو ہماری تنظیم کے لیے ایک کیس ہے۔ ہم تمھیں کیس کے نام سے پکارتے ہیں۔ اس میں اگر تمھاری جان بچ جاتی ہے تو یہ ہمارا سکور ہوگا اور ہم اُس کی وجہ سے مزید فنڈ حاصل کر لیں گے۔ اس لیے میں تم سے انسانی بنیادوں سے ہٹ کر بات کرنا چاہتا ہوں۔ بالکل کاروباری شخص کی طرح۔ اب تم فیصلہ کرو کہ ہم اب تک تم پر جو خرچ کر چکے ہیں، وہ قرض اِس صورت میں ادا ہو جائے کہ تم اس قتل کی وجہ ہمارے حوالے کر دو، ورنہ یہ لوگ تمھاری پھانسی کے فوراً بعد آنکھیں اور گُردے بلا معاوضہ جمع کر لیں گے۔ اگر تم یہ دونوں چیزیں سپریڈنٹ جیل کی بجائے کُتوں کو کھلا دینا پسند کرتے ہو تو مجھے اُس قتل کے اسباب چاہییں۔'' وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔

''بعض اوقات ایسا ہوتا ہے۔ جو شخص آپ کی مدد کرنے کے لیے مخلص ہو اور اُس پریشانی کا سبب پوچھ رہا ہو جس کے بارے میں اُسے مدد کرنی ہے، اصل میں اُس کی وہ پریشانی اُس مدد کرنے والے کی وجہ ہی سے پیدا ہوئی ہوتی ہے۔ میری ماں، جس نے آپ اور آپ کی تنظیم کو اس مہم پر روانہ کیا ہے، وہی دراصل اس پورے قضیے کی ذمہ دار ہے۔ لیکن میری مصیبت تو یہ ہے کہ وہ اِس تمام قصے سے بڑی معصومیت سے بے خبر ہے۔ وہ نہیں جانتی، ہر گزرا واقعہ نئے واقعے کا سبب بنتا ہے۔ میں نے یہ قتل پاگل پن میں نہیں کیا۔ میری ایک مصیبت تھی جسے میں نے طاقِ نسیاں میں رکھ دیا تھا۔ لیکن آسمان کی گردش نے وہ تصویر اچانک میرے سامنے لا کھڑی کی۔

''دیکھو، تم وہ پریشانی اپنی ماں کی بجائے ایک ایسے آدمی کو سُنا رہے ہیں، جسے نہ واقعے سے

مطلب ہے، نہ تمھاری ماں سے سروکار ہے اور نہ تمھارے عمل سے لینا دینا ہے۔ اُسے تو اپنی تنظیم سے، جس کا وہ ملازم ہے، تنخواہ وصول کرنے کے لیے آپ کا کیس ڈیل کرنا ہے۔ تم بات شروع کرو۔'' میرے ان جملوں کے بیانیے میں ایسی تاثیر تھی کہ وہ کچھ دیر خموشی سے سوچتا رہا۔ بالآخر تذبذب کے ساتھ اپنی کہانی شروع کر دی۔ جو کچھ اُس نے کہا، اُسے مِن وعَن آپ کے سامنے پیش کروں گا کہ مجھے جس طریقے سے یہ بات آپ کو سنانی چاہیے تھی، اُس سے کہیں اچھے طریقے سے اُس نے بیان کر دی۔

''بھائی صاحب! آپ یقیناً میری ماں اور بھائی سے ملاقات کر چکے ہیں۔ آپ نے میرے لیے جو کچھ سامان خریدا ہے، اُس میں اُنھوں نے بھی اپنا سامان شامل کیا ہے اور یہ کافی عرصے سے ہو رہا ہے۔ دراصل میں اپنی ماں کی خریداری کو جانتا ہوں۔ آپ کے پاس چیونگم وغیرہ ہوگی؟'' اُس نے مجھ سے اچانک سوال کیا۔

''نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ وہ کہنے لگا۔

''دیکھیے، اس قسم کی کوئی چیز یہاں نہیں ملتی۔ شاید اس کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ لیکن میری ماں ایسی چیزوں کا خیال رکھتی ہے۔ دیکھنا جو سامان آپ میرے لیے لائے ہیں اُس میں چیونگم ہوگی حالانکہ آپ نے یہ نہیں خریدی۔ میں نے اُس کی ہر ملاقات ٹھکرا دی لیکن سامان وصول کر لیتا ہوں۔ اس طرح میری ماں مطمئن ہو جاتی ہے۔ ویسے بھی مجھے یہاں اُس کی سخت ضرورت ہے اور کوئی دوست اتنا لمبا ڈیل نہیں کر سکتا۔'' ایک لمحے کے لیے اُس نے اپنا سر جھکایا پھر میری طرف دیکھا۔ جب مجھے مکمل اپنی طرف متوجہ پایا تو بولنے لگا۔

''آج سے پندرہ سال پہلے کی بات ہے۔ میرا باپ کئی مہینوں کے لیے تبلیغ پر گیا تھا۔ وہ ایک سرکاری دفتر میں پندرہ گریڈ کا کلرک تھا اور رشوت کو ہدیہ سمجھتا تھا۔ اُس کا کام ایسا تھا کہ اُسے بہت سے ہدیے ملتے تھے۔ چوتھائی تنخواہ اور اُن ہدیوں کے لالچ میں کوئی نہ کوئی اُس کی جگہ کام کرنے کے لیے آمادہ ہو جاتا اور وہ ہر سال چار پانچ ماہ کے لیے تبلیغ پر نکل جاتا۔ اُس کا افسر اُس سے بہت خوش تھا۔ وہ اُن ہدیوں سے بہت کچھ اپنے افسر کو بھی دیتا۔ اُس وقت میرا وہ بھائی، جسے آپ باہر مل چکے ہیں، میری ماں کی گود میں تھا۔ میں پندرہ سال کا تھا۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اُن دنوں بہت پُرکشش تھا۔ میں ماں کے متعلق بہت کچھ جانتا تھا۔ ماں کے متعلق اور اُس آدمی کے متعلق، جو اِسی جیل سے دو سال پہلے عمر قید کی سزا کاٹ کر نکل چکا ہے اور ایک سال پہلے کسی بیماری میں مر چکا ہے۔ ایسی جگہ پر، جہاں میں بیٹھا ہوں، کوئی بھی اس قدر قید کاٹ کے مر سکتا ہے۔ وہ شخص میرے باپ کا قاتل تھا اور میری ماں نے میرے باپ کو قتل کروایا تھا۔ وہی عورت، جس سے باہر آپ کی ملاقات ہو چکی ہے۔ وہ میرے باپ کے قتل میں ملوث تھی۔ میرے باپ کے قتل سے پہلے سب کچھ جانتے ہوئے، میں کیوں خاموش تھا؟ اس لیے کہ میری ماں میرے متعلق بھی سب کچھ جانتی تھی۔ میں ایک ایسا لڑکا تھا جسے لڑکوں میں لذت ملتی تھی۔ دونوں طرح کی۔ میرے اور میری ماں

کے درمیان ایک خاموش معاہدہ تھا۔ پھر ایک دن میرے باپ کو میری ماں کے اور اُس شخص کے بارے میں پتا چل گیا۔ آپ یقیناً اِس کہانی سے لطف اندوز ہو رہے ہوں گے لیکن اب جب کہ میں بات کھول رہا ہوں تو مجھے آپ کے کسی رویے سے کوئی غرض نہیں۔ میرا باپ میرے بارے میں زیادہ نہیں مگر کچھ نہ کچھ جانتا تھا۔ اُسے یہ بات اُس وقت قابلِ قبول تھی۔ جب اُسے میرے دوستوں کو لمبے تبلیغی وعظ کرنے کا موقع مل جاتا۔ وہ اِس سے خوش ہوتا تھا۔ اس لیے میں جب بھی کسی لڑکے کو دوست بناتا تو پہلے اُسے اپنے باپ سے ملواتا۔ وہ اُس لڑکے سے تبلیغی چلّہ کرنے کا وعدہ لے لیتا۔ پھر میرے والد کو میرے دوست پر کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ حالانکہ ایک دفعہ اُس نے مجھے میرے دوستوں کے ساتھ قابل اعتراض حالت میں دیکھ بھی لیا۔ لیکن میری ماں کے فعل کو وہ برداشت نہ کر سکا اور یہ ایک ایسی بات تھی، جو ہم سب کے لیے بدبختی بن گئی۔ آہ بے خبری کتنی بڑی نعمت ہے۔ کیا ایسا نہیں ہے کہ ہزاروں خاندان انھی حالات میں بے خبری کے ساتھ جی رہے ہیں۔ شاید اُسی وقت میرے باپ اور میری ماں نے ایک دوسرے کے قتل کا فیصلہ کر لیا تھا۔ لیکن میری ماں اور وہ شخص دو تھے اور میرا باپ اکیلا۔ چنانچہ وہ قتل ہو گیا۔ میں اپنے باپ کا مدعی تھا۔ مگر مجھے یہ پتا نہیں تھا کہ میں اپنی ماں کا کیا کروں؟ وہ، جس کے مَیں صُلب سے تھا، اُس کا مقدمہ لڑوں یا وہ، جس نے مجھے نو ماہ اپنے پیٹ میں رکھا، اُس کی طرف داری کروں؟ تصور کیجیے، میں، جسے اپنی ماں اتنی ہی عزیز تھی جتنا باپ، کس کرب کے ساتھ تھانے میں بیٹھا تھا۔ وہ عصر اور مغرب کا دورانیہ تھا۔ وہ شخص، جس نے چاقو سے میرے باپ کا گلا کاٹا تھا۔ اُس کا میں نام لینا نہیں چاہتا۔ جس نے اپنے باپ کے کٹے ہوئے گلے اور کاٹنے والے کو سامنے دیکھا ہو، وہ عام آدمی کی طرح نہیں ہے۔ وہ شخص بالکل ننگا تھا۔ تھانے کے صحن میں پکی اینٹوں کے فرش پر لیٹا۔ یہ اچھی بات تھی لیکن میری ماں اُس کے سامنے بیٹھی تھی اور میں بھی، جو اُن دونوں کے سامنے بیٹھا تھا۔ یہ بات بالکل ٹھیک نہیں تھی۔ مگر انسپکٹر میری ماں کو کیسے نظر انداز کر سکتا تھا، جو اس عبرت کا مرکزی کردار تھی اور اب تھانے کے سُرخ پر آمدے کے ستون کے ساتھ فرش پر بیٹھی میرے بھائی کو دودھ پلا رہی تھی۔ کتنی عجیب بات ہے؟ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ ایک بھاری پتھر کے نیچے آ چکی ہے، اپنے بیٹے کو دودھ پلانا نہیں بھولی۔ میری ماں کو اُس کے سامنے بٹھا دیا گیا کہ وہ اپنے ننگے عاشق کو عین قریب بیٹھ کے پٹتے دیکھے اور اُس کی اُس شَے کو بھی، جو لٹک رہی تھی۔ وہ بکرے کی طرح چیخ رہا تھا۔ کبھی آپ نے بکرے کو ذبح ہوتے دیکھا ہے؟ وہ میری ماں کو بھی دیکھ رہا تھا۔ جسے مسلسل انسپکٹر کی طرف سے گندی گالیاں دی جا رہی تھیں اور میں اُن کا حصہ بلا وجہ وصول کر رہا تھا۔ میں، جو اپنے باپ کا مدعی تھا۔ میری ماں کی گود میں میرا چھوٹا بھائی تھا، جسے آپ باہر دیکھ چکے ہیں۔ وہ اس المیے سے ناواقف، محض دودھ پینے میں مصروف تھا۔ کیا میں آپ کو سمجھا سکتا ہوں؟ میں اُس وقت کیا سوچ رہا تھا؟ میری ماں کیا سوچ رہی تھی؟ وہ بے شک غلط کار تھی لیکن اپنے دونوں بیٹے اُسے عزیز تھے۔ باوجود اس کے کہ اُس نے اُن کا باپ چھین لیا تھا مگر یہ ایسی دلیل نہیں

ہے، جسے دنیا مان لے۔ یا میرا وہ چچا، جس کے بھائی کے گلے پر چھُری پھیر دی گئی۔ (کچھ دیر خاموشی کے بعد) یہ وہی رات تھی، جب میں اپنی ماں کو تھانے میں چھوڑ کر گھر آ گیا۔ حالانکہ انسپکٹر کی آنکھوں کی ہوس سب کچھ سمجھا رہی تھی۔ میں یہ باتیں سمجھنے میں اُس عمر میں پختہ ہو گیا تھا۔ یہ آرام سے سونے والی رات نہ تھی، مگر مجھے پچھلی رات نیند آ گئی۔ میں کئی دن سے جاگا ہوا تھا۔ دوسرے دن صبح ہزاروں خدشوں کے ساتھ تھانے میں داخل ہوا۔ نہیں وہ تین تھے۔ میرے پہنچتے ہی جن کی تصدیق ہو گی۔ محض انسپکٹر نہیں، آدھے تھانے نے جشن منایا تھا اور اُس کا تمام خرچہ میری ماں پر واجب ہوا، جو اُس نے تمام رات کی محنت میں چکایا۔ وہ تھکی ہوئی تھی، جاگی ہوئی تھی، سہمی ہوئی تھی۔ اُس نے مجھے دیکھا، ایک ایسی لونڈی کی طرح جس کا آقا اُسے معاف کر دینے پر قادر ہو۔ تمام خساروں کے ساتھ۔ یہ وہ خسارے تھے جنہیں کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔ یہ میرے خسارے تھے، میرے باپ کے تھے یا میری ماں کے؟ میں اس بارے میں نہیں جانتا۔ یہ سلسہ کئی دن چلتا رہا۔ پھر دونوں کا چالان کر دیا گیا۔ ایک دن میں نے اپنی ماں کو معاف کر دیا لیکن اُس انسپکٹر کو نہیں کیا، جو میری ماں سے کئی دن تک مشقت لیتا رہا۔ اُس کے بعد میں نے شہر چھوڑ دیا، اپنی ماں کو چھوڑ دیا، اُس بھائی کو چھوڑ دیا، جس کا اس معاملے میں ناخن برابر قصور نہ تھا مگر انسپکٹر کو نہیں چھوڑا تھا۔ ایک عرصہ گزرا، شاید اس زخم کو بھول جاتا جو میرے دل پر بہت کاری لگ چکا تھا۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ اُس کے پھلنے پھولنے کے اسباب پھر پیدا ہو گئے۔''

''وہ اسباب بتانا چاہو گے؟'' میں نے پوچھا۔

''میں نے سی ایس ایس پاس کر لیا۔ انٹرویو میں فیل ہو گیا یا کر دیا گیا۔ اس بارے میں مجھے زیادہ بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ دراصل ہمارے خاندان میں افسری کی کوئی روایت نہیں تھی اور انٹرویو لینے والے اس بات میں حق بجانب تھے۔ جن کے اباؤ اجداد کے سلسلے میں سول سروس سے منسلک کوئی نہیں ہوتا اُن کے اندر سے گنوار پن کی بو نہیں جاتی۔ خیر لعنت بھیجیں اس بات پر۔ اس کے نتیجے میں مجھے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں بیروں کے سپروائزر کی نوکری مل گئی۔ آپ جانتے ہوں گے، اِس محکمے میں آنے کے بعد آپ کو بڑے بڑے ڈنر اور شُرفا کی تقریبات کا اہتمام کرنا ہوتا ہے۔ یہ شریف لوگ اُس وقت بہت شریف اور بے ضرر ہوتے ہیں، جب وہسکی کا گلاس لے کر، یا جو بہت محتاط ہوں، وہ پلیٹ میں کھانا اور سلاد رکھ کر چلتے پھرتے ایک دوسرے سے گفتگو کرتے ہیں اور باہم متعارف ہوتے ہیں۔ یہی وقت تھا، جب وہ بدقسمت ایس پی، جو آج سے پندرہ سال پہلے تھانہ صدر کا انسپکٹر تھا، اپنی بیوی کے ساتھ میرے سامنے آ گیا۔ وہ مجھے بالکل اچھا نہیں لگا اور میں نے اُسے قتل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ حالانکہ میں جانتا تھا کہ اب ہم کم و بیش ایک ہی قبیلے کے لوگ ہیں لیکن آپ کو سمجھ لینا چاہیے انسان کی کچھ انفرادی ضد ہوتی ہے، جو کبھی کبھی سول سروس یا بیراگیری کی اخلاقیات سے ہٹ کر فیصلہ کرنے پر اُکساتی ہے۔ یہی اُس دن میرے ساتھ ہوا اور میں نے اُسی رات اُن

میاں بیوی کو قتل کر کے اُن کی اٹھارہ سالہ بیٹی کے ساتھ ریپ کیا۔ لیکن وہ ریپ نہیں تھا۔ وہ اپنے والدین کے قاتل کے ساتھ خوشی خوشی سیکس کرتی رہی۔ دوسرے کمرے میں ہونے کی وجہ سے وہ اُس بڑے سانحے سے بے خبر تھی۔ آہ، بے خبری کتنی بڑی نعمت ہے۔ میں نے پوری رات اُس کو لطف اندوز ہونے دیا۔ آپ کو اِس چیز سے مطلب نہیں لیکن میں سمجھتا ہوں، ایسی صورتِ حال میں بُری خبر سنانا، اُسے قتل کر دینے سے زیادہ شدید ہے۔ صبح سے پہلے اُسے کمرے میں چھوڑ کر میں ہوٹل سے نکل گیا۔ آپ اس بات کو نہ بھولیں کہ میں اُسے آسانی سے قتل کر سکتا تھا اور واحد گواہ کو مٹا سکتا تھا لیکن میں اپنے اِس گناہ کی تصدیق چاہتا تھا، جو مجھے مل گئی۔

''اور تم یہ بھی جانتے تھے کہ اس خواہش کی تمھیں کتنی بڑی قیمت چکانا تھی۔'' میں نے اُس کی آنکھوں میں جھانک کر کہا۔

''شاید موت کی صورت میں۔'' وہ زہر خند مسکرایا اور بولا۔

''میں کبھی معاشرے کا معزز آدمی نہیں رہا۔ میرا ذلیل اور حقیر ہونا میری پیدائش کے ساتھ طے ہو چکا تھا۔ میں نے یہ مقام ہرگز کوشش سے حاصل نہیں کیا۔ نہ میں اپنی ماں اور باپ کے فیصلوں میں شامل رہا لیکن اُن کا پھل برابر وصول کیا۔ تو پھر آپ اس قتل کو اُن واقعات کا تسلسل کیوں نہیں سمجھ لیتے۔ میں انٹرویو میں فیل نہ کیا جاتا تو شاید اُس ایس پی کے ساتھ وہسکی کا گلاس ٹکرا کر پی جاتا، جو پندرہ سال پہلے تھانہ صدر کا انسپکٹر تھا۔''

''میرا خیال ہے، آپ یہاں کی نسبت اُس ہوٹل میں پُرسکون رہتے۔'' میں نے کہا۔ اُس نے بات کرنے کے لیے اپنے جبڑے سختی سے بھینچے، پھر بولا۔

''آج مجھے اِس جیل میں ڈیڑھ سال ہو گیا۔ پہلے دن لوہے کا اِتنا اُونچا، بھاری اور بڑا دروازہ بند ہونے کے بعد میرا وجود مجھے ایک کیڑے کی طرح لگا تھا، جو میرے اپنے اختیار میں نہیں تھا۔ جیل کا دروازہ بند نہیں ہوا تھا، میری زندگی کا گیٹ بند ہو گیا تھا۔ ایسا گیٹ جس کی نہ صرف یہ کہ چابی میرے پاس نہیں تھی، بلکہ میں یہ بھی نہیں سوچ سکتا تھا کہ وہ کس کے پاس ہونی چاہیے۔ مجھ پر ایسی مایوسی طاری تھی، جس میں صدیوں کا خسارا شامل ہو۔ یہ نہیں کہ میں اپنے پیچھے کسی بے سہارا عزیز کو چھوڑ آیا تھا۔ نہیں میں نے غلط کہا۔ میری ایک ماں ہے جسے آپ باہر مل چکے ہیں اور ایک بھائی ہے لیکن آپ ہی بتائیں مجھے اُن کی پروا کیسے ہو سکتی تھی؟ بہرحال آپ اِس بات کو چھوڑیں۔ مجھے یہ قید مُردوں کی ایسی بستی میں لے گئی جن کی آواز یا آہ و بُکا زندہ نہیں سُنتے۔ چند لمحے اس مضبوط جہنمی دروازے کی ڈیوڑھی میں کھڑا رہنے کے بعد ایک سپاہی نے مجھے کراہت آمیز حقارت سے آگے کی طرف دھکا دیا تو اس سیاہ ڈیوڑھی سے باہر چندھیا دینے والی روشنی تھی۔ جہاں دوپہر کا سورج لپکیں چھوڑ رہا تھا۔ یہ جیل کا احاطہ تھا۔ یہاں پہلی دفعہ مجھے احساس ہوا کہ میرے ساتھ کچھ اور بھی سیاہ بخت موجود ہیں۔ ہم سب کو ایک سفّاک کرختگی سے لائن میں کر دیا گیا۔ ننگے پاؤں، ننگے سر، تانبے کی طرح تپے ہوئے کھردرے فرش پر کھڑے رہنا، اُس وقت قابل عمل ہو جاتا ہے، جب آپ کو بتا دیا جائے کہ آپ

یہاں کیوں اور کب تک کھڑے ہوں گے۔لیکن جب یہ دونوں باتیں آپ نہ جانتے ہوں اور نہ پوچھنے کے مجاز ہوں تو تکلیف کی شدت بے اندازہ ہو جاتی ہے۔ مسلسل ایک ہی جگہ بغیر ہلے جلے کھڑے رہنے سے پاؤں میں جو تکلیف تھی، وہ تھی، سب سے پیچیدہ امر بے تحاشا بہنے والے پسینے نے پیدا کیا۔جیسے نمک خوردہ پانی کا ڈول بھر کر انڈیل دیا گیا ہو۔اس حالت میں جسم کے مختلف حصوں میں خارش شروع ہوگئی۔لیکن یہ وہ خارش نہیں تھی جسے اپنے ہاتھوں کے ناخنوں کے مداوا کی اجازت ہوتی۔ خاص کر جب یہی عمل ناف کے زیریں حصوں میں شروع ہو جائے۔یقین جانیں یہ وقت خودکشی کے لیے بہت آسان اور فیصلہ کن تھا لیکن اُس وقت اس کے ذرائع نہیں تھے۔سہ پہر چار بجے ہمیں یہاں سے آگے ہانکا گیا۔ یہ پہلا دن مجھ پر سخت گزرا تھا۔لیکن پھر مجھے اندازہ ہوا کہ میں یہاں منافع میں ہوں۔اس جیل کے اندر دراصل سب حقیر لوگ ہیں۔سب ذلیل لوگ موجود ہیں۔البتہ کوئی بڑا ذلیل ہے اور کوئی چھوٹا۔ یہاں معزز اور شرفا نہیں رہتے اور مجھے احساس نہیں ہوتا کہ میری تذلیل ہو رہی ہے۔آپ ہی بتائیں جہاں سب لوگوں کی تذلیل ہوتی ہو وہاں کوئی کیا ذلیل ہو گا۔ یہاں میں اس لیے سکون میں ہوں کہ اس جگہ شریف لوگ نہیں آتے۔''

مسلسل ایک گھنٹے کی ملاقات کے بعد میں جیل سے باہر آ گیا۔ مجھے واپس اُسی طرح نگہبانوں نے ڈیوڑھی پر پہنچا دیا، جس طرح وہاں سے لے گئے تھے۔ڈیوڑھی کے دروازے کے پاس میرے بائیں ہاتھ کی دستی پر ٹھپہ دیکھا گیا، جو اندر جاتے ہوئے میری شرافت کی گواہی کے طور پر لگایا گیا تھا۔شرافت کے اس سیاہ ٹھپے کی موجودگی بتا رہی تھی کہ میں باہر کا آدمی ہوں۔ میرا جیل اور جرم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ باہر نکلا تو تمام منظر کھلا کھلا تھا۔ ہر طرف پاک صاف اور معصوم لوگ پھر رہے تھے، شرافت کے سیاہ ٹھپے لگے ہوئے۔معزز لوگوں کا ایک جمِ غفیر سڑکوں پر رواں دواں تھا، دفتروں میں کام کر رہا تھا۔انہی میں سے ایک میں تھا، اور اب میرا رُخ انسانی حقوق کی تنظیم کے دفتر کی بجائے اُس کی ماں کی طرف تھا۔ مجھے کیا معلوم، میں اُس کے پاس کیا لینے جا رہا تھا۔

◀◀ ● ▶▶

Mirza Ghalib Kitab Markaz,City Arcade Plaza Basement
Shop No: 10,1/8,Markaz,Islamabad(Pakistan)
+92 3235389312

غضنفر کا ناول مانجھی: ایک تنقیدی مطالعہ
الفیہ نوری
صنف: تنقید — سن اشاعت: ۲۰۱۴ء
صفحات ۱۲۹ — قیمت: ۲۰۰/روپے
پتہ: امعرفت اختر حسین، پرانی مسجد، چوک بازار، ڈمراؤں، بکسر (بہار)

● ممتاز رفیق

آدھا عشق

میں ہمیشہ سے مزاجاً ایک جدا آدمی تھا۔ایسے لوگ کنبے میں مشکل سے کھپ پاتے ہیں۔باپ نے بیٹے کو بے جوڑ دیکھا تو جائیداد میں سے حصہ دے کر جیسے ناتا ہی توڑ لیا۔جو ہجوم میں تنہائی کا حلیف رہنے کا عادی ہوا سے تو اس واقعے سے جیسے اپنے ڈھنگ سے زندگی کرنے کی چھوٹ مل گئی۔ مالی آسودگی تو معمولی نین نقش کو سنوار دیتی ہے میں تو پھر ایک وجیہہ انسان تھا۔ترکے میں حاصل ہونے والے گھر میں کتابوں سے بڑھ کے اور کوئی چیز نہ تھی۔علم کے جویا کے لیے کوئی اور چیز اہم بھی کب ہوتی ہے۔میں کتابوں، اپنی تخلیقی مصروفیات اور ادب اور آرٹ کی تقریبات میں مگن رہا کرتا۔لیکن یہ گئے دنوں کا قصہ ہے، اب وہ دن کہاں، جب میں ہر شام کسی ادبی تقریب یا تصاویر کی نمائش میں موجود اپنے وجود کو ایک معنویت دینے میں مشغول رہا کرتا تھا۔ میں تو یوں ہی سا الگ تھلگ رہنے والا آدمی ہوں، ایک لا ابالی اور بے پروا انسان جو جو ہر آن مست الست رہا کرتا ہے۔میرے پاس بھی سنانے کے لیے ایک داستان ہے میری دیوانہ وار وابستگی کا قصہ، جو میری زندگی کا جواز بھی تھا اور خوشی کا ایک بہانہ بھی۔میری چاہت، جس کی توقع سے سوا پذیرائی کی گئی۔وہ عجب حیران کن حد تک تیز گام عورت تھی جیسے شعلے کی لپک اور پھر اس کی معاملہ فہمی، وہ میرے خفیف سے اشارے کو پوری معنویت کے ساتھ سمجھنے کی اہلیت رکھنے کے علاوہ میرے جذبات سے پوری جزیات کے ساتھ واقف تھی اور یقیناً میرے حوالے سے ایک خاص انداز سے سوچتی تھی۔اس کی والہانہ پزیرائی نے میرے رات دن تلپٹ کر کے رکھ دیئے تھے لیکن یہ جلتی بجھتی آگ کا ماجرا تھا، مگر یہ سب بہت بعد کی باتیں ہیں.....لیکن پھر ہوا کیا؟ میں مرد پر عورت کی ذہنی برتری کا ہمیشہ سے قائل رہا ہوں شاید اس طرح بات الجھ رہی ہے۔ بیان میں آنے کے بعد ممکن ہے آپ سمجھ لیں کہ میرے راستے کی دیوار کیا تھی۔شاید اس کی دیوانگی حد سے سوا تھی جسے میں سہار نہ سکا.....یا جانے کیا تھا۔اس ان کہی کو سو معنی پہنائے جا سکتے ہیں۔

وہ ایک غیر معمولی عورت ہے۔ اُس نے تمام عمر اپنے انتخاب کی شرط پر سرخ جوڑا زیب تن کرنے سے اعتراض کیا۔ وہ ہمیشہ سے اپنے فیصلے خود کرنے کی عادی رہی اور اس چلن کو اس کی اعلیٰ تعلیم اور بڑے عہدے نے اور بڑھاوا دیا۔ جب اس سے میری ملاقات ہوئی وہ ایک ملٹی نیشنل ادارے میں کنٹری ہیڈ کے عہدے پر فائز تھی۔ اپنی ملازمت کی سنگین مصروفیات کے باوجود وہ ہمیشہ فنون لطیفہ سے جڑی رہی اور اس کی یہی سرگرمی میرے اور اس کے تعلق کی بنیاد ٹھہری۔ میں اکثر اسے ادبی محافل میں گفتگو کرتے سماعت کرتا اور دل ہی دل میں اس کے شخصی توازن، متانت، نفاست، وقار اور گہرے مطالعے کو سراہتا جو دوران کلام اس کی باتوں سے چھلکتا تھا۔ پھر میرے علم میں آیا کہ اس کی کہانیوں کی کتاب شائع ہو چکی ہے۔ کہانیوں کے کردار اور موضوعات مجھے بہت الگ سے لگے..... غیر روایتی اور انوکھے، ان کہانیوں کی بنت اور لکھت بھی منفرد تھی۔ کہانیاں قاری کو اپنے اندر جذب کر لینے کا وصف رکھتی تھیں لیکن بعض مواقع پر مجھے اس کے تجربے کی کم مائیگی کا احساس ہوا۔ اس کے خیال کی گیرائی اور جملوں کی بے ساختگی نے بہت لطف دیا۔ میں کئی ماہ سے اسے دیکھ رہا تھا اور آدمی کو جاننے کے لیے تو ایسی دو چار ملاقاتیں بھی بہت ہوتی ہیں۔ سو میں کہہ سکتا ہوں کہ میں اس سے واقف ہوں حالانکہ اسے تو خبر تک نہیں تھی کہ وہ کسی کے ملاحظے میں ہے۔ شاید یہ ممکن بھی نہیں تھا۔ ہر شام ایک ہجوم میں گھرا انسان کس کس پر نظر رکھ سکتا ہے لیکن مجھے مغالطہ سا تھا کہ وہ مجھے دیکھا کرتی ہے، مگر اسے دیکھنا کہنا نامناسب ہوگا۔ ہاں، وہ ایک اچٹتی نظر ہوتی جو لحظے بھر کو مجھ پر ٹک کر گزر جایا کرتی۔

میں اتفاقات کا سرے سے قائل نہیں ہوں۔ اُس دن کی ملاقات کو بھی میں اتفاق نہیں سمجھتا۔ سو ہوا یوں کہ مجھے مصوری کی نمائش میں مدعو کیا گیا۔ یہ دعوت مجھے میرے نوجوان مصور دوست الطاف نے دی تھی۔ میں پہنچ گیا اور اس کی ایک پینٹنگ دیکھنے میں محو تھا کہ عقب سے ایک مانوس سی آواز سنائی دی۔

''ہاؤ بیوٹی فل!'' میں نے پہلو بدل کر دیکھا یہ وہی تھی۔

''کیوں جناب! امپریشن ازم کا کیا کمال شاہ کار ہے۔'' اس کی بے تکلفی پر میں حیران سا رہ گیا۔ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے میں نے پینٹنگ کی کلر اسکیم، ڈیٹیلز اور پینٹر کے اسٹروکس کی مہارت اور موضوع کی ندرت پر اچھا خاصا لیکچر دے ڈالا۔ وہ بہت سنجیدگی سے میری بات سنتی رہی پھر مسکرا کر کہا۔

''واہ صاحب! آپ تو خاصے جان کار ہیں ہمیں آپ کی گفتگو کے ڈھنگ نے بہت مزا دیا۔ آپ یقیناً آرٹ کریٹک نہیں ہیں۔'' میں نے تعجب سے پوچھا۔

''آپ نے یہ نتیجہ کیسے اخذ کیا؟'' اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

''آپ نے پوری گفتگو میں کسی ماسٹر پینٹر کا حوالہ نہیں دیا۔ خالص اپنے خیالات بیان کیے اور جیسے تخلیقی انداز میں بات کی وہ ان غریبوں کے نصیب میں کہاں۔ ان کا تو ایک بنا بنایا سانچا ہے اور بس۔'' پھر ذرا ٹھہر کر بولی۔

''آپ شاید رائیٹر ہیں۔'' اس سے قبل کہ میں کچھ کہتا۔ میرا آرٹسٹ دوست لپکتا ہوا آیا اور مجھے ایک مسکراہٹ پر ٹرخاتا ہوا اس سے لہلہاتے انداز میں مخاطب ہوا۔

''میڈم! یہ میری بڑی خوش نصیبی ہے کہ آپ میری دعوت پر ایگزی بیشن میں تشریف لائیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلا کر میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''آپ کی اصل خوش نصیبی یہ ہے کہ یہاں مصوری کے ایسے پارکھ موجود ہیں۔'' میرے دوست نے تعجب سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا: شہزاد صاحب؟ پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔

''آپ میڈم سے واقف ہیں؟ یہ ملک کی سب سے اہم آرٹ کریٹک ہیں۔'' میں یہ سن کر سناٹے میں آ گیا لیکن خود کو سنبھالتے ہوئے بولا۔

''میں انہیں کہانی کار کی حیثیت سے جانتا ہوں۔'' پھر اُس سے مخاطب ہو کر بولا۔

''میں واقف نہیں تھا ورنہ .....'' اُس نے خوش دلی سے قہقہہ لگایا۔

''جناب آپ نے بہت قیمتی باتیں کیں۔ ہم کریٹک تو بس حوالے اور رٹا ہوا سبق دہراتے ہیں۔'' میرا دوست لجاجت سے بولا۔

''میڈم! آپ کی اپنی الگ انفرادیت ہے۔'' اس کا جملہ نظر انداز کر کے اس نے مجھے اپنا کارڈ تھماتے ہوئے پینٹر کو مخاطب کیا۔

''الطاف! آپ اپنے مہمانوں کو دیکھیں، میں شہزاد صاحب کے ساتھ آپ کے فن پاروں سے لطف اندوز ہوتی ہوں۔'' الطاف آنکھوں میں حیرت سرمہ کیے وہاں سے ٹل گیا۔ وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔

''تعجب ہے، ایک تخلیقی انسان بھی اتنا غبی ہو سکتا ہے۔'' میں نے کھلکھلا کر کہا۔

''یہ بہت سخت جملہ ہے جناب اور حقیقت یہ نہیں ہے۔ الطاف، خاصا روشن ذہن ہے۔ وہ تو کہیے شخصیت کے سحر نے اس کی مت مار دی۔''

''لیکن اتنے باصلاحیت پینٹر میں یہ کم زوری بھلی نہیں لگتی، اسے تو اپنے فن پر پورا بھروسہ ہونا چاہیے۔ میں اُس میں ایک بڑے آرٹسٹ کی جھلک دیکھ رہی ہوں۔ ایک بڑے فنکار کو ہر جادو کا توڑ معلوم ہونا چاہیے۔''

''ہوں.....درست کہا، اگر اس وقت وہ یہاں ہوتا تو کیسا شاد ہوتا لیکن یہ بھی تو ایک کجی ہی ہے ناں۔ ایک تخلیقی آدمی کے لیے تعریف سے زیادہ مہلک چیز اور کیا ہو سکتی ہے؟''

''یہ تو آپ نے عجب کہا۔ ہمارے ہاں فن کار کو ملتا ہی کیا ہے کہ اب اسے تعریف سے بھی محروم کر دیا جائے۔''

''نہیں، میں نے یہ نہیں کہا۔ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ تعریف تو ایک کسوٹی ہوتی ہے۔ اگر تعریف کرنے والے میں کھرا کھوٹا جانچنے کی صلاحیت نہ ہو تو تعریف قبول نہیں کرنی چاہئے ورنہ وہ کیلے کے چھلکے کی طرح قدم اکھاڑنے میں دیر نہیں لگاتی۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''جی! اس بات سے ہم متفق ہیں بلکہ سمجھتے ہیں کہ آپ نے ایک اہم نکتہ بیان کیا۔ پھر بولی۔

''آئیں پینٹنگز دیکھتے ہیں۔ الطاف نے واقعی زبردست کام کیا تھا۔'' وہ مختلف تصاویر پر میرے تبصروں اور ان کی تفہیم سے بہت متاثر نظر آ رہی تھی۔

''آپ واقعی کمال کی نظر رکھتے ہیں اور کتنے مختلف اینگل سے پینٹنگ کو کھوجتے ہیں۔'' اس نے تحسین سے لبریز لہجے میں کہا پھر بولی۔

''شہزاد صاحب! ملاقات جاری رہنی چاہئے اور ہاں آپ کا کنٹیکٹ نمبر؟'' اب ہم گیلری میں بچھے صوفے پر آ بیٹھے تھے جہاں میز پر چائے وغیرہ کا بھی اہتمام تھا۔ وہاں کتنے ہی لوگوں نے اسے ہلو ہائے کہا لیکن اس کی متانت نے انہیں ہم سے دور ہی رکھا۔ اس نے اچانک الطاف کی بنائی ہوئی نیوڈز پر بات شروع کر دی۔ وہ ان پینٹنگز کے دائروں اور قوس کے علاوہ دیگر تفصیلات کی تحسین کرتی رہی پھر بولی۔

''یہ آسان نہیں کہ پینٹر نیوڈ تخلیق کرتے ہوئے خود پر گرفت رکھے اور اپنی پوری توجہ اور مشاقی اپنے فن پارے کے لیے مختص کر دے۔'' اس کے بعد میں نے ادب پر مصوری کی مختلف تحاریک کے اثرات کا ذکر چھیڑ دیا وہ جس روانی سے بات کر رہی تھی۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ فن مصوری کا گہرا شعور رکھتی ہے۔ میں یہ سوچ کر بھی خوش تھا کہ اب ایک ہمہ صفت، باخبر عورت میرے دوستوں میں شامل ہو چکی ہے۔ الطاف اسے اس بے تکلفی سے گفتگو کرتے دیکھ کر عجب ہونق ہو رہا تھا۔ مجھے اس کی حیرانی کا سبب معلوم تھا۔ وہ واقعی بہت لیے دیے رہنے والی بردبار عورت تھی۔ مجھے خیال آیا یہ مجھ پر اتنی مہربان کیوں ہے؟ چائے کا سپ لے کر میں نے سوال کیا۔

''آپ نے پینٹر بننے کے بجائے کریٹک بننے کو کیوں ترجیح دی؟'' وہ خواب ناک لہجے میں بڑبڑائی۔

''پینٹر؟ جی پینٹر تو میں رہ چکی ہوں لیکن کوئی مکمل پینٹنگ نہیں بنا سکی بالکل اپنی کہانیوں کی طرح۔'' اس نے مسکرا کر بات ختم کی پھر اچانک بولی۔

''میری کہانیوں کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟'' میں نے ذرا سے توقف کے بعد سنجیدہ آواز میں کہا۔

''وہ کہانیاں ایک میچور تخلیق کار کے فن پارے ہیں۔ میں ان پر اس رواروی سے بات نہیں کرنا چاہتا۔ پھر اس کی جگ مگ آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کر بولا۔

''آپ کہانی بننے کا ہنر خوب جانتی ہیں۔ مجھے ان کہانیوں کے موضوعات کا انوکھا پن بہت بھایا اور آپ جس طرح اچانک، کسی منطقی انجام کے بغیر کہانی ختم کر دیتی ہیں۔ اس سے مجھے لگا جیسے آپ مغربی کہانی کاروں سے خاصی متاثر ہیں لیکن آپ کے کرداروں کے رویے میں جو تیکھا پن ہے اس نے مجھے افریقہ کے کلاسکی ادیبوں کے انداز تحریر کی یاد دلائی۔'' اس نے توجہ سے میری بات سن کر ایک گہرا ہنکارہ بھرا، پھر سنجیدگی سے گویا ہوئی۔

''جناب! آپ اب تک کہاں تھے؟'' پھر خود کلامی کے انداز میں دھیمے لہجے میں کہا۔

''نہیں، میں نے غلط کہا آپ تو موجود تھے لیکن بس میری نظر ہی چوکتی رہی۔'' پھر بے تکلفی سے بولی۔

''یہ آپ اتنے الگ تھلگ کیوں رہتے ہیں۔ ہم نے آپ کے ساتھ کبھی کسی کو نہیں دیکھا۔'' میں ذرا حیرت سے مسکرایا۔

''ارے! آپ تو بہت تیز نظر ہیں، اجنبیوں کو بھی گہرے مشاہدے میں رکھتی ہیں۔'' اس نے قہقہہ لگایا۔

''اجنبی! نہیں آپ اجنبی تو کبھی بھی نہیں تھے اور میں سب کو نظر کی سان پر نہیں رکھتی مگر آپ تو ایک الگ آدمی ہیں۔ اپنے آپ میں گم لیکن ہر جانب سے باخبر اور متجسس۔'' اس نے بات مکمل کر کے مجھے گہری نظروں سے دیکھا۔ میں نے ہلکی سی تالی بجائی اور ہنستے ہوئے بولا۔

''تعجب ہے.....آپ اچٹتی نظر سے بھی اتنی گہرائی تک دیکھ لیتی ہیں۔ آپ نے مجھے پاتال سے نکال کر سر عام لا کھڑا کیا ہے..... مجھے زعم تھا کہ یہ فن بس میں ہی جانتا ہوں۔ ہاں، آپ نے سچ کہا میں ایسا ہی ہوں۔'' وہ شرارت سے مسکائی۔

''میں جانتی ہوں کہ اگر انسان کو ہم زاد میسر نہ آئے تو وہ اپنی تنہائی کو ترجیح دیتا ہے۔'' پھر عجیب لہجے میں بڑبڑائی۔

''دیکھیں آج ہم نے ایک دوسرے کی تنہائی لوٹ لی۔ پھر گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے بناوٹی خفگی سے بولی۔

''صاحب! آپ کوئی اسم جانتے ہیں؟ وہاں میرا گھر ٹھنڈا پڑا ہوگا اور آپ نے مجھے یہاں پتھر کیے بٹھا رکھا ہے۔'' میں مسکرا کر اٹھتے ہوئے بولا۔

''یہ خود کلامی بھی عجب چیز ہے۔ وقت کا احساس ہی جاتا رہتا ہے۔'' وہ چلتے چلتے ٹھٹک کر بولی۔

''بھئی واہ! یہ تو آپ نے عجب ہشت پہلو بات کہی۔ واقعی ایک عالم مدہوشی میں یہ بہت سا وقت گزر گیا۔ پھر نخرے سے کہا۔

''اب اس لطف کو کرکرا مت کر دیجے گا۔ ہم میں انتظار کا یارا ذرا کم کم ہے اور جس سے ملاقات کی للک بھی ہو تو جانئے.....'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ ہم نے مہمانوں کی کتاب پر دستخط کیے الطاف کو الوداع کہا اور باہر نکل آئے۔ اسے کار کا دروازہ کھولتے دیکھ کر میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''ہم جلد دوبارہ ملیں گے۔'' اس نے کار اسٹارٹ کر کے پوچھا۔

''اب آپ کا پروگرام کیا ہے؟''

''میرے لیے اب یہاں کیا دھرا ہے۔ بس میں بھی چلا۔'' اس کے باریک ہونٹوں پر تبسم کی لکیر چمکی۔

''اوکے، سو لانگ۔'' اور وہ یہ جا وہ جا۔ میں اس کے بعد بھی کافی دیر وہاں کھڑا سوچتا رہا کہ اچانک اتنی فراوانی سے نصیب ہو جانے والی اس مسرت کو سنبھال بھی سکوں گا؟ گھر پہنچ کر بھی ذہن کے پردے پر ایک رنگین فلم چلتی رہی۔ پھر خیال آیا کہ میرے یہ احساسات کچھ زیادہ امیچور تو نہیں لیکن یہ سوچ کر کچھ تسلی ہوئی کہ یہ محض دوستی ہی تو ہے اور اگر کچھ اور بھی ہے تو میں کب تعلق کی بنیاد کسی جھوٹ پر رکھ رہا ہوں۔ یوں بھی یہ ڈور تو اسی نے باندھی ہے۔ اب اگر میں گرہ لگانا چاہتا ہوں تو اس میں ایسا ناروا کیا ہے؟ اسی دنگل میں کافی رات بہہ گئی۔ کروٹیں بدلتے جانے کب نیند نے بے دھیان کر دیا۔ ابھی ناشتے وغیرہ سے فارغ ہی ہوا تھا کہ موبائل ٹرٹرانے لگا۔ میں نے گھڑی پر نظر ڈالی ایک بجا تھا۔ موبائل پر اجنبی نمبر دیکھ کر میں نے کال ڈس کنکٹ کر دی۔ پھر خیال آیا کہ جانے کون ہو؟ شاید کسی اہم بات کے لیے کال کی گئی ہو یہی سوچ رہا تھا کہ موبائل دوبارہ بجنے لگا۔

''ہیلو! کون؟''

''جناب آپ کی صبح ہوگئی؟ کئی بار فون کر چکی ہوں۔'' آواز میں دبی دبی سے خفگی تھی۔

''اوہ! سوری..... میں دیر سے اٹھا۔'' اس نے بات اچک کر شوخی سے پوچھا۔

''اچھا، تو آپ بھی رات گئے تک جاگتے رہے، خوب۔''

''جی یہ تو درست ہے لیکن اس خوب کو کیا معنی دیے جائیں؟ اور ہاں آپ آفس نہیں گئیں؟'' وہ کھلکھلائی۔

''ظاہر ہے انسان سائے سے بچھڑ جائے تو کہاں کی نیند؟ رہا آفس تو بس یوں ہی چھٹیاں لے لی تھیں کسے معلوم تھا یہ اتنی بار آور ثابت ہوں گی۔'' وہ ایسی بے تکلفی سے کلام کر رہی تھی جیسے ہم برسوں کے آشنا ہوں۔''

''میں کچھ سمجھا نہیں۔'' میں نے سادہ سے لہجے میں کہا۔

''جی میں بھی الجھتی رہی کہ ٹرنکلائزر لینے کے باوجود نیند کو کیا ہوا؟ پھر آپ کا ایک فقرہ یاد آیا کہ یہ خود کلامی بھی عجیب چیز ہے، وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوتا تب جا کر نیند کے بدراہ ہونے کا بھید کھلا۔ کروٹیں لیتے اور جاگتے خواب دیکھتے رات بیت گئی۔'' پھر بولی۔

''کیا ہم سب باتیں فون ہی پر کر لیں گے؟'' پھر عجب لگاوٹ سے کہا۔

''آپ آجائیں ناں۔'' میں نے وعدہ کیا کہ چینج کر کے پہنچتا ہوں۔

یا الٰہی! یہ سب کس تیزی سے ہو رہا ہے۔ ابھی کل ہی تو ہماری ملاقات ہوئی ہے اور وہ..... مجھے اس کی کیفیت دیکھ کر صحرا میں بھٹکے ہوئے اس پیاسے آدمی کی بیتابی یاد آئی جسے نخلستان میں اچانک میٹھے پانی کا چشمہ میسر آ گیا ہو۔ میں مسکرایا اور باتھ روم میں جا گھسا۔ دروازے پر پہلی دستک ہی نے کھل جا سم سم کا کام کیا۔ اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں رات کی جگار واضح تھی۔ چہرہ میک اپ سے عاری لیکن اس کی شادابی دیدنی تھی۔ اس نے لباس میں بھی کسی تکلف کا خیال نہیں رکھا تھا۔ یہ سب اس عورت کے اوریجنل ہونے کے اشارے تھے۔ اس نے مجھ پر نظر گزاری، مسکرائی اور کہا۔

''خاصے اسمارٹ لگ رہے ہیں۔'' اس نوکیلے جملے کی چبھن کو سہتا ہوا میں صوفے پر بیٹھ کر بولا۔

''جی! تہوار کے دن اپنا آپ سنوارنا ہماری پرانی روایت ہے۔'' اس کی آنکھوں میں حیرت سی لپکی۔

''تہوار؟'' اس نے دھیرے سے کہا پھر یکا یک چہرے پر دھنک سی بکھر گئی۔

''آں..... اچھا۔'' پھر لگا کمرے میں نقرئی گھنٹیاں سی بج اٹھی ہوں۔

''مگر آپ نے دیکھا ہم تو اجڑے ہوئے ہیں۔'' پھر خود کلامی کے انداز میں بولی۔

''ہمیں یہ خیال کیوں نہیں آیا؟'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''کچھ لوگ ان تکلفات سے ماورا ہوتے ہیں۔'' وہ مسکرائی۔

''اچھا..... یہ فرمائیں آپ کافی لیں گے یا چائے؟''میں نے تعجب سے کہا۔

''ارے اس تکلف کو جانے دیں لیکن کیا آپ بھی دیر سے اٹھیں؟''

''نہیں، بس چائے پی لی تھی۔ سوچا تھا باقی آپ کے ساتھ دیکھا جائے گا۔ لیکن خیر.....''

میں نے حیرت سے کہا۔

''اچھا.....لیکن کافی کا لطف تو اس کی تلخی میں ہے۔''اس نے یک ٹک مجھے دیکھا۔

''جناب! ہم بہت اعلیٰ کافی بناتے ہیں۔''میں نے نفی میں سر ہلایا۔

''کیا مطلب؟''وہ الجھ کر بولی۔

''یہی تو مسئلہ ہے۔ آپ بنائیں گی تو تلخی کہاں رہے گی؟''اس نے دانت جگمگائے۔

''آپ ہم سے واقف نہیں۔ ہم کڑواہٹ برقرار رکھنے کا قرینہ بھی رکھتے ہیں۔'' کافی واقعی بہت عمدہ تھی۔ اس نے سپ لیتے ہوئے کہا۔

''جناب! یہ کیا بوریت ہے کہ ہم تہوار کے دن بھی یہاں مونہہ لپیٹے بیٹھے رہیں کچھ celebration ہونی چاہئے۔''میری آنکھیں مسکرائیں۔

''ہوں، خیال تو برا نہیں۔'' وہ اٹھی، کھڑکی کا پردہ اٹھتے ہی کمرا روشنی سے چم چم کرنے لگا۔ اس نے تاسف سے کہا۔

''ہم کب سے روشنی کو ترسے ہوئے تھے اور روشنی ایک ہاتھ کے فاصلے پر ہماری منتظر تھی۔'' پھر چہرہ تمتما کر بولی۔

''چلیں دیکھتے ہیں شہر آج کیسا لگ رہا ہے۔''میں نے اثبات میں سر ہلا کر سوال کیا۔

''آپ کو سمندر سے ملاقات کیے کتنی مدت بیت گئی؟''

''سمندر.....؟''اس نے کھوئی ہوئی آواز میں سرگوشی کی پھر شوخی سے کہا۔ ''کل کی شام اسی کے ساتھ گزری اور آج بھی تو .....!''اس نے بات نامکمل چھوڑ کر غور سے میرے چہرے پر نظر کی اور کہا۔

''آپ جس سمندر کی بات کر رہے ہیں اس کی وسعت اور شکوہ ہمیں ہیبت زدہ کر دیتا ہے لیکن آج .....''ایک ذومعنی بات کہہ کر چپ پکڑ لی۔ کچھ توقف کے بعد برتن سمیٹتے ہوئے کہا۔

''لیکن سمندر کے روبرو ایک اور سمندر دیکھنا کیسا انوکھا نظارہ ہوگا۔ چلیں کسی دن گھومتے پھرتے سمندر سے بھی نمٹ لیں گے۔''

میرے حوالے سے اس کی خوش خیالیاں مجھے تشویش میں مبتلا کر رہی تھیں۔ میں نے اسے غور

سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''آپ مجھے کتنا جانتی ہیں؟''اس کے چہرے پر سرسوں سے پھوٹی۔ اس نے بڑھ کر میرے مونہہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''پلیز، ہم سے ہماری خوشیاں نہ چھینیں۔ ہمیں اپنی یہ fantisy بہت عزیز ہے۔''میں نے قہقہہ لگایا۔

''خوب، آپ میرا مرتبہ گھٹا رہی ہیں اور میں مونہہ باندھے بیٹھا رہوں۔ جناب، انسان اپنے اندر ایک مکمل کائنات ہے اور آپ مجھے سُسرے سمندر سے تشبیہ دے رہی ہیں۔''اس کے چہرے کی گلابی لوٹ آئی۔

''اچھا جی.....تو یہ دعوے ہیں.....دیکھتے ہیں۔''میں نے ملائمت سے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

''سنیں! میں آپ کو تم کہہ کر پکار سکتا ہوں۔''اُس نے ٹھٹک کر لہالوٹ ہونے کے انداز میں کہا۔

''سچ...کیا میں اتنی خوش بخت ہوں؟''

میرا دل چاہا کہ اٹھ کر اسے سینے سے لگا لوں اور اس پر بوسوں کی بارش کر دوں لیکن خود کو باندھے بیٹھا رہا۔ پھر دھیرے سے پکارا۔

''سنو!''وہ جیسے خواب سے چونک کر بولی۔

''ہوں.....جی؟''

''سنو now no more آپ جناب، یار دوستوں میں یہ تکلفات بھلے نہیں لگتے۔''وہ مسکرائی۔

''جی دوستی.....اس سے تو بات اب شاید کوسوں آگے نکل چکی ہے۔''یہ ایک قطعی اور نہایت واضح بیان تھا۔ میں خاموشی سے اس کا مونہہ تکنے کے سوا اور کیا کرتا۔ اس نے اپنی بات پہ تڑکا لگایا۔

''عورت کی خاموشی کو نیم رضامندی سے تعبیر کیا جاتا ہے اور مرد کی؟''

''ویسے مرد اگر خاموش رہے تو سمجھنا چاہیے کہ وہ نہ صرف پوری طرح متفق ہے بلکہ بہت سرشار بھی ہے۔''

''بات تو بالکل کھری ہے لیکن اب ہم اپنے مزاج کا کیا کریں لیکن آپ نے معاملہ ہی پانی کر دیا۔''میں مسکرایا۔

''درست، وہ ساعتیں مر چکی ہیں جن میں ہم دونوں سانس لیتے رہے ہیں۔ یہ ایک نیا منظر نامہ ہے اور بدلاؤ اس کا پہلا تقاضہ ہے۔ خواب دیکھنے کے لیے اس کی شرائط پوری کرنی ہوتی ہیں۔'' وہ سنجیدگی سے گویا ہوئی۔

''ارے ہاں یہ تو خیال ہی نہیں آیا۔ جب آدمی زندگی وارنے پر تیار ہو تو یہ مزاج کے ٹکے کا ہے۔'' میں مسکرایا۔

''لیکن سوال یہ ہے کہ اگر ہم اسی طرح باتیں بگھارتے رہے تو گھومنا پھرنا ہو چکا۔'' وہ شوخی سے بولی۔

''جناب آپ ایک لاجواب انسان ہیں۔ بس چند سیکنڈ، یوں گئی اور یوں حاضر۔'' میں لفظ لاجواب کی معنویت میں ڈوبا ہوا تھا کہ وہ جینز جوگر ڈاٹے ہوئے لوٹ آئی۔ ہم باہر نکلے تو ہر طرف سنہری دھوپ بکھری ہوئی تھی۔

''کتنے عرصے بعد دن کا جوبن دیکھا ہے ورنہ تو سرمئی شام ہی آنکھوں کا کاجل بنی ہوئی تھی۔'' اس نے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے لب وا کیے۔

''جانے آپ کی سنگت میں ابھی کتنی اور نعمتیں ہماری منتظر ہیں۔'' لہجے کی بشاشت بول رہی تھی۔

''اچھا تو اب کہاں چلیں۔'' میں نے کار سڑک پر لاتے ہوئے پوچھا۔ اس کے بدن سے پھوٹتی گرم مہکار مجھے ان جانے خدشات میں مبتلا کر رہی تھی۔ وہ ترنت بولی۔

"I am with you and it is your festivel."

''اچھا? only mine''

''ارے بھئی یہ انگریزی بھی کیسی تہی دامن زبان ہے، ویسے من و تو کا جھگڑا اب رہا ہی کہاں؟ اچھا کسی ایسی جگہ چلیں جہاں اجنبی آوازوں کی گونج ہو۔'' میں نے کار بڑھاتے ہوئے کہا۔

''چلیں آج وہاں چلتے ہیں جہاں آپ کو بہت پہلے ہو آنا چاہئے تھا۔'' اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

''بھلا کہاں؟''

''جامعہ کلاتھ مارکیٹ، جہاں آپ اپنے ان بہت سے کرداروں کو دیکھ سکیں گی جن سے اب تک ملنے سے محروم رہیں۔ دکان داروں سے مول تول کرتی عورتیں، مہنگے ملبوسات کو دیکھتے ہوئے ان کی آنکھوں میں جمی ہوئی حسرت، ان کی آپس کی بات چیت اور بے ساختہ ردعمل اور بہت کچھ۔'' اس نے گہرے تجسس سے میری بات سنی۔

''ہاں..... میں کب سے یہ سب دیکھنے کی تمنائی تھی لیکن میں نے خود کو کس قدر سمیٹ کر رکھا۔ لیکن اب.....'' اس کی آواز میں عجب عزم اور ارادہ تھا۔ پھر اچانک کہا۔

''آپ نے تو کہا تھا آپ جناب نومور پھر؟'' میں چپ چاپ مسکرا دیا۔

میں اسے آرٹ کونسل سے گزارتا ہوا میوزیم کے سامنے کی پارکنگ تک لے آیا۔ کار پارک کر کے ہم نے سڑک عبور کی لوگ اس کی گوری چٹی رنگت اور لباس کے باعث لوگ اسے غیر ملکی سمجھ رہے تھے۔ وہ اردگرد سے بے پروا کسی بچے کی سی ہمک سے وہاں موجود ہر چیز کو دیکھ رہی تھی۔ تنگ گلیوں سے گزر کر بسوں کی یلغار سے بچتے ہوئے ہم برنس روڈ پر سے گزرے۔ وہاں دہی بڑوں کی چاٹ کی دکان پر وہ اڑ کر کھڑی ہو گئی۔

''میں دہی بڑوں کی چاٹ کھائے بغیر یہاں سے ایک انچ نہیں بڑھوں گی۔'' وہ ٹھنکی۔ دکان دار نے دھلے ہوئے برتنوں کو ایک بار پھر دھو کر چاٹ بنانی شروع کی۔ وہ اٹھ کر کاونٹر پر پہنچی۔

''بھائی، چاٹ خوب چٹ پٹی بنائیے گا۔'' دکان دار نے حیرت سے اردو بولتے سنا پھر بولا۔

''میڈم! مزا نہ آئے تو پیسے واپس۔'' وہ مسکراتی ہوئی واپس آ گئی۔

''کتنی رنگا رنگی ہے اس دنیا میں اور ہمیں دیکھیں کہ کبھی شاہ جی کے دوار سے ایک قدم آگے نہیں بڑھے۔''

''شاہ جی کا دوار؟'' میں نے نا سمجھنے والے انداز میں دہرایا۔

''ارے صاحب وہی آرٹ کونسل۔ آئے دن وہاں آتے ہیں کبھی سوچا ہی نہیں کہ اس کے آگے کیا ہے۔ چاٹ کھاتے ہوئے اس کی آنکھیں ساون بھادوں کا منظر پیش کر رہی تھیں اور ناک سرخ انگارہ ہو رہی تھی لیکن وہ اس سب سے بے خبر سٹاسٹ کھانے میں مشغول تھی۔ میں نے کولڈ ڈرنک طلب کی اور چسکیاں لینے لگا۔ پلیٹ ختم کر کے اس نے ادھر اُدھر دیکھا۔

''اب میں دہی بھلے ٹرائی کروں گی۔'' اس نے شوق سے کہا۔ میں نے میٹھے دہی بھلے منگوا لیے۔ اس نے ان کے لیے پانی الگ سے منگوایا اور پلیٹ ختم کر کے ایک آسودہ سی دھیمی آواز میں ڈکار لی۔ ہم دوسری دکان سے آئس کریم کھا کر نکلے ہی تھے کہ جانے کہاں سے ایک بندر والا آ گیا۔

''سلام میم ساب!'' اس نے بندر کی زنجیر ہلائی۔ وہ دو پیروں پر کھڑا ہو کر سلام کرنے لگا۔ یہ سب دیکھ کر اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ وہ غرائی۔

''ختم کرو یہ تماشا۔'' بندر والا سہم سا گیا اور چاہتا تھا کہ وہاں سے ٹل جائے کہ وہ بولی۔

''ٹھہرو، یہ بندر بیچو گے؟'' بندر والے نے حیران نظروں سے اسے دیکھا۔

''میم ساب یہی ہماری روزی روٹی ہے۔''اس کے چہرہ پر مامتا کا نور تھا۔

برنس روڈ سے ملحق سڑک پر شامیانوں کی مرمت کی جارہی تھے تو کہیں تصاویر فریم ہورہی تھیں۔ وہ بے حد سست رفتاری سے چلتے ہوئے یہ سب گہری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔اسی کے ساتھ بندر پر بھی اس کی پوری نظر تھی۔ بائیں ہاتھ مڑے تو یہاں عورتوں کا اژدھام تھا۔مختلف دکانوں اور ٹھیلوں پر زندگی اپنے پورے جمال اور بدصورتی کے ساتھ جلوہ فگن تھی۔ وہ مجھے چھوڑ کر ایک دکان کی طرف بڑھ گئی جہاں بہت رش تھا۔عورتیں بھاؤ تاؤ میں مصروف تھیں اور وہ ان کے مشاہدے میں مشغول تھی۔ مارکیٹ میں کب کئی گھنٹے گزر گئے احساس ہی نہیں ہوا۔ جب گاڑی اس کے گھر کے سامنے رکی تو وہ میری طرف پلٹی۔

''آئیں ناں!''میں نے نفی میں سر ہلایا۔

''نہیں!''اس کے ہونٹوں پر کشادہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

''آپ نے مجھے مالا مال کر دیا ہے۔اچھا کل ملتے ہیں۔''میں نے ایک بوسہ ہوا میں اچھالتے ہوئے کہا۔

''یہ تمہارے لیے۔''وہ کھلکھلائی۔

''واہ صاحب !یہ بھی خوب رہی۔''میں نے خدا حافظ کہہ کر واپسی پکڑی۔ میں گزرے ہوئے دن کے بارے میں سوچنے لگا، وہ تمام دن کیسی مگن رہی تھی۔زندگی کے اس نئے ذائقے نے اسے سرشار کر دیا ہے۔میں یہی سب سوچتا ہوا نیند کی آغوش میں چلا گیا۔صبح ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر گنگناتے ہوئے اخبار دیکھنے بیٹھ گیا۔لاشعوری طور پر میری توجہ موبائیل ہی کی طرف تھی۔وقت بہلانے کے لیے چائے لینے کے لیے اٹھا تو فون بول اٹھا۔میں نے لپک کر کال ریسیو کی۔وہ کہہ رہی تھی۔

''صاحب ،آپ تو گھوڑے بیچ کے سوتے ہیں۔اگر ہم سے دیر ہوگئی تھی تو آپ کال کر لیتے۔''میں نے جواباً کہا۔

''پہلے خود عادت بگاڑ دی اور اب مارا کاٹی پر اتر آئی ہیں۔''پھر جیسے اسے یاد آ گیا۔

''لیکن یہ آپ کہاں لاپتا ہیں؟''میں نے چھیڑ کی۔

''سوچا شاید.....!''وہ انگارے کی طرح چٹخی۔

''فوراً آجائیں،جشن کل ختم نہیں ہوگیا۔''میں مسکرایا۔

''اوکے باس!ابھی آیا۔آپ کافی بنائیں اور میں یہ پہنچا۔''

میں اس کے گھر پہنچا تو وہ میری منتظر تھی۔کچھ دیر ادھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد میں نے پوچھا۔

''لیکن وہ کافی کہاں رہ گئی۔''وہ مسکراتی ہوئی کچن کی طرف بڑھ گئی۔پھر وہ مہکتی کافی کے ساتھ میرے پہلو میں بیٹھ گئی۔

''آج تو کیل کانٹے سے لیس ہو۔''وہ باریکی سے مسکرائی۔

''آپ ہی نے تو کہا تھا بدلاؤ بہت ضروری ہے۔''پھر بہت ناز سے بولی۔

''بناؤ سنگھار تو یوں بھی ہمیشہ سے عورت کا حق رہا ہے۔''میں کافی کا سپ لے رہا تھا کہ اس نے اچانک کہا۔

''کیا خیال ہے آج سمندر سے نہ نپٹ لیا جائے،ہم چل رہے ہیں ناں سمندر کی سیر کو؟''میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''تم کو خوش رکھنا تو اب میری بھی خوشی ہے۔''وہ کھلکھلا کر ہنسی۔

''اور اگر میں روٹھ گئی؟''میں نے پل بھر سوچا۔

''کیا کوئی اپنے آپ سے بھی روٹھ سکتا ہے؟''وہ لاجواب سی ہو کر کمرے کی طرف بڑھ گئی۔میں کافی کے پیالے کچن میں رکھ آیا۔وہ باہر آئی تو اس کی سج دھج ہی اور تھی۔چست جینز اور جوگرز میں وہ بہت حسین لگ رہی تھی۔میں نے سرسری لہجے میں کہا۔

''چند دنوں میں تم میں جو تبدیلیاں آچکی ہیں ان پر کبھی غور کیا؟''اس نے گہری آواز میں جواب دیا۔

''ہوں، میں بھی اس بات پر حیران ہوں لیکن انسان عجیب غیر معمولی مخلوق ہے۔آپ کا اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''میں، میرا تو منظر نامہ ہی بدل کر رہ گیا ہے۔گمان تک نہیں تھا کہ کبھی کسی کے ساتھ یوں سیر سپاٹے کرتا پھروں گا،تم عجب کمال عورت ہو۔''ہم ہنستے بولتے سی ویو پہنچ گئے۔اس نے سوال کیا۔

''یہ سمندر کیسا چپکا پڑا ہے۔اسے کاہے کا سوگ ہے؟''میں نے شوخی دکھائی۔

''یہ تمہارے احترام میں خاموش ہے۔ابھی مجھ پر نظر پڑنے دو،دیکھنا کیسے لوٹیں لگاتا ہے۔''اس نے خوش دلی سے قہقہہ لگایا پھر نخرے سے کہا۔

''بھلا کیوں؟''اچانک ایک لہر ساحل کی طرف لپکی۔

''دیکھو!حسن میں کتنی طاقت ہوتی ہے۔سمندر نے تمہارے استقبال کے لیے اپنا نمائندہ بھیج دیا۔''اس نے حیران سا ہو کر مجھے دیکھا پھر کھلکھلائی۔

''شجی !آپ بھی کمال کرتے ہیں۔''میں نے ہولے سے دہرایا۔

''شجی!'' لگا جیسے مونہہ شہد سے بھر گیا ہو۔ وہ میری کیفیت پر نگراں تھی۔ میں نے لہک کر کہا۔

''واہ، جی خوش ہو گیا لیکن.....!'' اس نے ذرا ایک سوچا۔

''لیکن کیا؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں پیوست کر دیں۔

''منیر نیازی کی نظم کی چند لائنیں سنو:

کھولو یہ بھاری دروازہ مجھ کو اندر آنے دو

اس نے کہا کہ کون... میں نے کہا کہ میں

اس کے بعد ایک لمبی چپ اور تیز ہوا کا شور۔''

اس نے بے ساختہ ''واہ!'' کہا پھر کچھ وقفے کے بعد بولی۔

''بہت گہری بات ہے من وتو.....'' میں نے بات اچکتے ہوئے پوچھا۔

''اب میری لیکن کا مطلب سمجھ میں آیا؟'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''مگر نام تو محض ایک شناخت ہے۔ یہ کیا اچھا لگے گا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو یکساں نام سے پکاریں اور یکتائی تو روحوں کا سنگم ہوتا ہے۔ میں شجی کہتی ہوں تو اچھا لگتا ہے لیکن اگر.....''

''نہیں نہیں مجھے یہ بہت بھلا لگا۔ لیکن تم ہر بات کو اتنی سنجیدگی سے کیوں لیتی ہو۔'' میں نے قہقہہ لگایا۔

''بھئی کیا بوریت ہے۔ دیکھو سمندر ہماری راہ تک رہا ہے۔'' اس نے جھٹ سلیپر اتارے، جینز کے پائنچے پلٹے اور میری طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ ایک ذرا سا تامّل کے بعد میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کا ہاتھ تھام کر ایسا لگا جیسے پورے بدن میں برقی رُو دوڑ گئی ہو۔ اس کے نرم، گرم اور گداز ہاتھ کی گرفت رفتہ رفتہ سخت ہوتی جا رہی تھی۔ ہم دونوں ہی سمندر پر نظریں گاڑے ریت پر اپنے قدموں کے نشان ثبت کرتے آگے ہی آگے رواں دواں تھے۔ پیر پانی سے ٹکرائے تو جسم میں ایک الگ قسم کی سنسنی پھیل گئی۔ مجھے لگا اس کے بدن میں خفیف سی لرزش ہوئی ہو۔ پانی اب پنڈلیوں سے بڑھ کر ہمارے گھٹنوں تک چڑھ آیا تھا اور ہم ایک بے خودی میں بڑھے جاتے تھے۔ یکا یک ایک آدمی پانی اچھالتا ہوا ہماری طرف لپکا۔

''کیا ارادے ہیں؟ اس نے اُکھڑے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔ ہم نے جیسے ہوش میں آتے ہوئے ادھر اُدھر دیکھا۔

''آپ خطرے کے نشان سے بہت آگے نکل آئے ہیں۔'' اس کے لہجے کی کڑواہٹ اپنی جگہ تھی۔ ہم خاموشی سے واپس پلٹ گئے پھر پایاب پانی میں ٹہلنے لگے۔

''شجی! یہ مسخرہ کون تھا؟ سارا لطف مٹی میں ملا دیا۔'' وہ خفگی سے بولی۔ میں مسکرایا۔

''ہاں دیکھو، بس دو چار قدم ہی کی تو بات تھی پھر ہم سمندر کی آغوش میں ہوتے۔'' اس نے عجب سی آواز میں کہا۔

''تو کیا برا ہوتا؟ سمندر ایک بہت بڑی اکائی ہے ایک انوکھی دنیا۔'' اس کا ہاتھ اب تک میرے ہاتھوں میں تھا اور سرور کی ایک خفتہ لہر پورے بدن میں لوٹیں لگ رہی تھی۔

''کیا خیال ہے کچھ کھا ہی نا لیا جائے؟'' میک ڈونلد دیکھ کر بھوک چمک اٹھی تھی۔ اس نے مسکرا کے چوٹ کی۔

''تھک گئے، چلیں جناب لیکن پہلے مونہہ پر پانی کا ایک چھپا کا مار لیا جائے۔'' ہم فریش ہو کر ریسٹورنٹ کی طرف بڑھے۔

''کیسا لگ رہا ہے؟'' میں نے بشاشت سے دمکتے اس کے چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔ وہ مسکرائی۔

''آج ہم زندگی کے بہت سے نادر تجربات سے دوچار ہوئے۔ کسی مرد کے ہاتھ کا پہلا لمس عورت کو ذائقے کی کیسی سبک اور دھیمی دھیمی آنچ سے ہم کنار کرتا ہے اسے اب ہم بیان میں لا سکتے ہیں۔ لحظہ بھر تھم کر بولی۔

''یہ ایک ایسا تجربہ تھا جسے ہم ان کہا رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ ہماری زندگی کی سب سے انوکھی خوش بختی ہے۔'' وہ سانس لینے کو رکی۔

''ہم سمندری پانی کی سرسراہٹ اور ہلاکت خیزی کی معنویت سے پہلی بار متعارف ہوئے۔ مگر آپ؟'' اس نے حسب عادت بات ادھوری چھوڑ کر چائے کی پیالی اپنی طرف کھسکائی اور میرے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔

''میری بھی کچھ ایسی ہی کیفیت ہے لیکن شاید شدت قدرے زیادہ ہے کیوں کہ میں نے پہلی بار نسوانی لمس کا شرف حاصل کیا ہے۔'' اس نے تعجب سے مجھے دیکھا۔

''اگر ہم آپ کے کھرے پن سے کسی حد تک واقف نہ ہوتے تو مشکل تھا کہ اس بات پر یقین آتا۔ لیکن سچ پوچھیں تو کسی زندہ لمس کا ہمارا بھی یہ پہلا ہی تجربہ ہے۔'' چائے وغیرہ سے فارغ ہو کر وہ اچانک اٹھ کھڑی ہوئی۔

''اب چلیں، دیکھیں سمندر کیسی وحشت انگیزی پر اتر آیا ہے۔ بس چلیں یہاں سے کسی پرشور جگہ۔''

کار اسٹارٹ کرتے ہوئے میں نے مسکرا کر کہا۔

''کیا اندر بہت اتھل پتھل ہو رہی ہے؟'' اس نے آنکھیں ٹیڑھی کر کے کہا۔

''آپ کیسے مہلک آدمی ہیں۔'' پھر موضوع بدل کر بولی۔

''میری کہانیوں میں وہ کیا بات تھی جسے اس دن آپ گول کر گئے تھے۔''

میں نے متعجب ہو کر کہا۔

''اچھا..... بہت زیرک ہو یار۔ ہاں، ان کہانیوں میں ایک کسر ہے۔ تم اپنے کم مایہ کرداروں کے بیان میں ڈول جاتی ہو۔ صاف محسوس ہوتا ہے کہ اس میدان میں تمہارا تجربہ برائے نام ہے اور یہ ایک بنیادی کمی ہے۔'' اس نے توجہ سے بات سنی پھر کہا۔

''آپ کی سچ بیانی کا بہت شہرہ سنا تھا اور آج دیکھ بھی لیا کہ آپ کس بے باکی سے لگی لپٹی رکھے بغیر سچ بولنے کا وصف رکھتے ہیں۔ لوگ آپ کو دل آزار کے نام سے یاد کرتے ہیں لیکن ایسی دردمندی سے تو کوئی دوست ہی بات کر سکتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''میں جانتا ہوں لیکن تم کمال کی باخبر عورت ہو۔ رہی کہانیاں تو اب تم اس تجربے سے گزر چکی ہوں۔ آئندہ کہانیوں میں تم اپنے قارئین کو حیران کر دو گی۔''

ہم روشن سڑکوں پر ادھر اُدھر مٹر گشت کرتے ہوئے ٹاور پر پہنچے تو اسے وکٹورین عہد کا طرز تعمیر یاد آ گیا۔ سڑک پر برائے نام ٹریفک تھا جب ہم شاہین کامپلکس سے پی آئی ڈی سی کی جانب مڑے تو کچھ آگے جا کر اچانک اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے ملائمت سے کہا۔

''میں ایک ہاتھ سے ڈرائیو نہیں کر سکتا۔'' اس نے خجل سا ہو کر ہاتھ ہٹا لیا۔ ''ہم جب تک لمس کے جادو سے آشنا نہیں ہوئے تھے تو خیال تک نہیں آتا تھا لیکن اب.....'' میں خاموشی سے کار ڈرائیو کرتا ہوا اس کے گھر پہنچ گیا۔ اسے اللہ حافظ کہا تو اس نے بڑی ادا سے کہا۔

''آپ ہوا میں کچھ اچھالنا بھول گئے۔'' میں نے ترنت جواب دیا۔

''ہوا! نہیں اسے ہی کیوں نہیں جس کے لیے اسے روانہ کیا تھا۔'' اس کا چہرہ کھل اٹھا بولی۔

"Come on have a nice cup of coffee"

اب میں بھی کب تک پتھر بنا رہتا۔ اُس نے شاور لیا اور مجھے بھی فریش ہونے کا مشورہ دیا۔ میں جب تک مونہہ ہاتھ دھو کر فارغ ہوتا گھر میں کافی کی سوندھی مہک بکھر چکی تھی۔ وہ مجھ سے سٹ کر بیٹھ گئی۔ اس نے کافی کا سپ لے کر میری طرف کیک کی پلیٹ بڑھاتے ہوئے ناز سے کہا۔

''آپ بھی جادوگر ہیں۔ میں کیا تھی اور آپ نے کیا سے کیا بنا دیا۔ یہ نری دیوانگی ہے، جانے

آپ نے میری بے دھیانی میں کیا پڑھ کر پھونک دیا؟'' میں نے قہقہہ لگایا۔

''واہ! کیا دیدہ دلیری ہے۔ مجھ گوشہ گیر کو محفل پسند بنا دیا اور الزام بھی مجھ ہی پر۔'' میں نے ہاتھ چھڑا کر اسے اپنی اُور کھینچ لیا۔ وہ بھی پھولوں سے لدی مہربان ڈالی کی طرح میری جھولی میں آ گری۔ ہم پر دیر تک بے خبری کا یہ عالم طاری رہا۔ کافی دیر بعد مجھے خیال آیا کہ کافی دیر ہو گئی ہے۔ میں اسے خود سے الگ کیا اور اُٹھ بیٹھا۔ میں نے فرمائش کی۔

''کافی کا ایک اور گرم پیالہ پھر میں چلوں گا۔'' اس نے کچھ مایوسی سے کہا۔

''کیوں؟ آج یہیں رہ جائیں ناں!'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''کون کافر جانا چاہتا ہے لیکن میں چھلکنا نہیں چاہتا۔'' اس کی آنکھوں میں روشنی سی لہرائی اور وہ کچن کی طرف بڑھ گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ کافی لیے کمرے میں داخل ہوئی بولی۔

''آپ لوگوں کی ماہیت کیسے بدل لیتے ہیں؟'' میں نے قہقہہ لگایا۔

''کیوں ٹھٹھول کرتی ہو جو خود کو نہ سنبھال سکا وہ کسی کو.....'' اس نے بات کاٹ کر کہا۔

''آپ کا انکسار بھی کمال ہے۔ آپ شاید جانتے ہی نہیں کہ آپ کیا ہیں۔'' میں مسخرے پن سے بولا۔

''اچھا، تو کسی دن بتاؤ نا، میں کیا ہوں۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''نہیں صاحب، آپ میں بہت بھول بھلیاں۔ ہیں میں تو یہ خطرہ مول لینے سے رہی۔ آپ انسانی نفسیات پر جس بلا کی گرفت رکھتے ہیں وہ کم کسی کو نصیب ہوتی ہے۔''

''ہائیں، یہ انکشاف تم پر کب ہوا؟ جانے دو یار میں کیا جانوں.....'' اس نے بات قطع کی۔

''محترم! اتفاق سے میں آپ کی کتاب پڑھ چکی ہوں۔''

''میری کتاب؟'' میں بڑبڑایا۔

''مگر یہ تو بھولا بسرا قصہ ہے۔ خیر بھول جاؤ۔ میں نے کوئی خاص تیر نہیں مارا۔''

''میری سمجھ میں نہیں آتا آپ Low profile پر اتنے مصر کیوں ہیں۔ اس کی سچائی عیاں تھی۔''

''سمجھ جاؤ گی۔ تم بھی نئی بات سمجھنے میں طاق ہو۔'' میں نے آخری سپ لے کر کہا۔

''اب میں چلا۔'' اس نے عجب لگاوٹ سے کہا۔

''رہ جائیں ناں!'' میں نے کہا۔

''ناں، نہیں، نو، بس نہیں۔'' میں نے ذرا رکھائی سے کہا۔ وہ خاموش رہی۔ گھر پہنچ کر بلکہ راستے میں گزرے ہوئے دن کے بارے میں سوچ کر بدن اور ذہن میں لطیف سی گدگدی ہوتی رہی لیکن اسی کے

ساتھ خفت کی ایک خفتہ لہر بھی جسم میں رواں تھی۔ یہ خیال بہت اذیت ناک تھا کہ میں نے تعلق کے تقدس کو مجروح کر دیا۔ اس ملے جلے خیال کی آنچ بدن میں دیر تک دوڑتی رہی۔ خیال آیا کہ آج زندگی میں پہلی بار معلوم ہوا کہ دنیا میں شہدا ایسی زندہ مٹھاس ایک اور بھی ہے۔ کیا بے انت عورت ہے۔ میں بڑبڑایا، کہیں ناراض نہ ہوگئی ہو؟ میں نے بھی تو کیسی سختی سے اس کی دعوت مسترد کر دی تھی۔ ابھی اسی چوں کہ چناں چہ میں تھا کہ موبائل بول اٹھا۔

''ہیلو، خیریت؟''

''آپ سو تو نہیں گئے تھے؟'' میں نے حیران سا ہو کر پوچھا۔

''ہم تمام دن ساتھ رہے اور تم کو کسی خاص بات کا خیال اب آیا، خیر کہو۔'' وہ چٹ سے بولی۔

''جناب! آپ کی گٹھری میں میرے لیے حیرانیوں کا اور کتنا سامان ہے؟''

''کیا مطلب، میں نے کیا کر دیا؟''

''جب آپ نے ہماری پیش کش رد کی تو دھچکا سا لگا جیسے کھلے چوراہے پر سر سے چادر کھینچ لی گئی ہو لیکن جب اوسان اوزان میں آئے تو خیال آیا کہ ہم کھولتے خون کی طلب میں کیسی بے مثل خوبی کو نظر انداز کر گئے۔ اپنے وجود پر ایسا اٹل اختیار تو خاص لوگوں کا وصف ہے ہمیں آپ کے اس عمل نے بہت شاد کیا۔ آپ واقعی نہایت منفرد انسان ہیں۔'' میں نے قدرے رکھائی سے کہا۔

''جسے اپنی عزت کا پاس ہو وہ کسی اور کو بھی داغ دار کرنے کا روادار نہیں ہو سکتا اور ہم دونوں جس تعلق میں بندھے ہوئے ہیں۔ اس کے تقاضے تو اس سے سوا ہیں۔ سوکھا ہوا پتہ ذرا سی ٹھیس سے چور چور ہو جاتا ہے۔ یہ فیصلہ میرے لیے بھی آسان نہیں تھا لیکن صحیح وقت میں مشکل فیصلے ہی میں انسان کی اصل پوشیدہ ہے۔ اچھا اب سو جاؤ اس سے قبل کے نیند اور خواب بدراہ ہو جائیں۔'' میں نے یہ کہہ کر لائن ڈس کنکٹ کر دی مگر اس طرح بھلا رابطہ منقطع ہوتا ہے۔ اب میں ذہن کے روشن پردے پر مجسم ہو کر در آنے والی یادوں کا کیا کرتا؟ اس عورت نے دیکھتے ہی دیکھتے میرے روز نامچے کو کیسا تتر بتر کر کے رکھ دیا ہے۔ میں نے خود کلامی کی لیکن خیال آیا کہ یہ تو ناانصافی ہوگی کہ تنہا کسی ایک کو اس کا ذمہ دار قرار دیا جائے۔ میں صرف یہ کر سکتا تھا کہ معاملات کی ترتیب کو بدل دوں اور دیکھوں تو سہی وہ تعلق کی کس سطح تک آ پہنچی ہے۔ دیکھنا چاہیے کہ اس کٹھنائی کی یہ کڑواہٹ اس پر کیا اثرات مرتب کرتی ہے؟ یہ سوچ کر مجھے سکون سا مل گیا کچھ ہی دیر میں نیند آنکھوں میں ڈولنے لگی۔

صبح بیدار ہوا تو روشن دن چڑھ آیا تھا۔ میں نے موبائل آف کر کے طویل غسل کے بعد ڈٹ کر

ناشتہ کیا۔ گھر میں کئی روز کی عدم توجہ کے باعث بکھراوا بڑھ گیا تھا۔ ہر چیز پر گرد کی تہہ چڑھی ہوئی تھی۔ گھر صاف کرتے ہوئے لطف آیا۔ گری پڑی چیزیں اپنی جگہ پر رکھیں۔ میلے کپڑوں کو پلاسٹک بیگ میں بھر کے ڈرائی کلینز کو دینے نکل گیا۔ وہاں سے فارغ ہو کر بال ترشوائے اور پھر ایک سپر اسٹور سے چیزوں سے لدا پھندا گھر پہنچا۔ چولہے پر مٹر قیمہ چڑھایا اور جب تک وہ پکتا رہا میں ٹی وی پر کرکٹ میچ دیکھتا رہا پھر ڈرائی فروٹ کا جار لیے اسٹیڈی میں جا گھسا جہاں کئی ادھورے تراجم میری راہ تک رہے تھے۔ کام کے انہماک میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا لیکن جب پیٹ دہائی دینے لگا تو اُٹھنا ہی پڑا۔ چائے کے ساتھ قیمہ مٹر کے سلائس نے بہت مزا دیا۔ ڈاک میں کئی دعوت نامے موجود تھے۔ انہیں دیکھ کر ناگاہ اس کا خیال ذہن میں در آیا۔ جانے وہ کس حال میں ہوگی؟ شاید حیران، برہم یا پریشان۔ یہ سب اس کی توقع کے خلاف ہو رہا تھا۔ اسے اپنی خیریت سے تو مطلع کر دینا چاہیے۔ یہ تو نری سفاکی ہوگی کہ محبت میں شرابور ایک عورت کو بغیر وجہ بتائے تڑپنے کے لیے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ نہیں، میں یک طرفہ طور پر فیصلے کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتا۔ مرد کتنا ہی پڑھ لکھ جائے اپنی وحشی جبلت سے باز نہیں آتا۔ مجھے اسے اعتماد میں لینا چاہیے۔ میں نے نمبر ڈائل کیے۔ پہلی ہی بیل پر اس کی لرزتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''ہیلو! آپ خیریت سے ہیں؟''

''ہوں، ٹھیک ہوں تم سناؤ۔'' میں نے آواز میں بشاشت پیدا کرتے ہوئے جواب دیا۔

"Oh thanks God." اس کی آسودہ آواز سنائی دی۔

''لیکن آپ نے کب سے ہمیں سولی پر لٹکا رکھا ہے۔ کہاں تھے آپ.....؟ جانتے ہیں ہم نے یہ وقت کتنی اذیت میں گزارا۔ جانے کیسے کیسے واہمے ہماری جان کے بیری بنے رہے۔ آپ نے فون بھی آف کر رکھا تھا جس سے اور ہول اٹھ رہے تھے۔ کیوں کیا آپ نے ایسا؟'' میں نے سکون سے اسے بات کرنے کی مہلت دی۔

''تمہاری یہ وارفتگی بہت خوش کن ہے۔ میں بھی اسی نوع کی آگ میں جلتا رہا اور اس کیفیت کو دوام دینا چاہتا ہوں لیکن مجھے تمہاری شدت اور بے صبری سے خوف آتا ہے۔ تم سارا میلہ ایک دن میں کیوں لوٹ لینا چاہتی ہو۔'' اس کی آنسوؤں میں گندھی آواز میں خاصی ترشی تھی۔

''ہم نے سکھ کے چار سانس ہی تو لیے ہیں، ہم نے کون سا میلہ لوٹ لیا۔ یہ مرد اتنے اذیت پسند کیوں ہوتے ہیں؟ لیکن آپ تو ایک الگ آدمی ہیں، کیا آپ کو ہماری بے قراری کا کوئی اندازہ نہیں..... میں کیا کروں؟'' میں نے گمبھیر آواز میں کہا۔

''سنو! ہمیں ملاقاتوں کے اس تواتر پر نظر ثانی کرنی ہوگی، جس تعلق کو تم دوستی سے کوسوں آگے کا معاملہ قرار دے چکی ہو اس کی دل کشی برقرار رکھنے کے لیے اسے روزمرہ کے چلن سے بچانا ہوگا۔''

''آپ کیسی گاڑھی باتیں کر رہے ہیں، اس ذہنی کیفیت میں ہمارے ذہن میں دھول اڑ رہی ہے، خاک پلے نہیں پڑ رہا۔''

''تمہیں یاد ہے تم کتنے دن سے دعوتوں کو نظر انداز کر رہی ہو؟''

''جی! لیکن ہم کیا کریں ہمیں آپ کے سوا کچھ یاد ہو جب ناں! آپ ہمارے جسم میں لہو کی طرح دوڑ رہے ہیں۔''

''ہوں! یہ تو ہوتا ہی ہے جب آپ کسی کے ہو جائیں یا کسی کو اپنا لیں لیکن ہم بہت تیز دوڑ رہے ہیں.....شاید ٹین ایجرز سے بھی زیادہ برق رفتاری سے۔ مگر ہمیں کچھ فیصلے کرنے ہوں گے۔ لیکن نہیں تم اس طرح فون پر یہ بات نہیں سمجھ سکتیں۔ اچھا یوں کرو آج آرٹس کونسل میں ملتے ہیں۔''

میں آرٹ کونسل پہنچا تو وہاں ہر طرف الو بول رہے تھے لیکن اوپن ائیر ریسٹوران میں بہار آئی ہوئی تھی۔ وہاں لوگ اسے دائرہ کیے بیٹھے تھے۔ میں نے وہاں پہنچ کر کچھ دیر ان سے چونچیں لڑائیں اور پھر ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

''آپ کیسا کاٹ کھانے والا جملہ بول سکتے ہیں، آج دیکھا۔''

''میں اکثر طرح دے جاتا ہوں لیکن نااہلوں کے اجتماع میں میرے اندر دبکا بھیڑیا بھونکنے لگتا ہے۔''

''آپ نے خوب کہا لیکن اگر نااہلی تعارف بن جائے تو نیم خواندہ اسے بھی امتیاز جانتے ہیں۔''

''چھوڑو یار! کس بنجر منظر نامے میں پھول کاڑ رہی ہو۔ یہ کہو دن کیسا کٹا؟'' میں نے موضوع بدل دیا۔ اس نے شاکی نظروں سے مجھے دیکھا۔

''جیسے جلتے صحرا میں برہنہ پا سفر.....مگر کسے پروا ہے لوگ تو ترتیب کے الٹ پھیر میں الجھے ہوئے ہیں۔'' طنز کی دھار تیز تھی مگر میں ہنس دیا۔ اس نے بگڑ کر کہا۔

''یہاں ہنسی کا کیا محل تھا؟''

''تمہیں یہی سمجھانے کے لیے تو بلوایا ہے۔'' وہ چپکی ہو کر بیٹھ گئی۔ ویسے لگتا ہے میرا کہا ہر لفظ اکارت گیا۔ جب میں نے گاڑی سپر ہائی وے کی طرف موڑی تو وہ چونک کر بولی۔

''ہم کہاں جا رہے ہیں؟''

''جہاں تم زندگی کی نئی معنویت سے آشنائی حاصل کر سکو گی۔ وہ ایک نہایت پُرسکون جگہ ہے۔''

''کیا گھر سے بھی زیادہ؟'' وہ منمنائی۔

''گھر.....وہ تو ایک قید خانہ ہے۔ کبھی کبھار کھلی فضا میں بھی سانس لینا چاہئے۔''

ہائی وے کے ساتھ جب ایک صاف ستھرے ہوٹل کے سامنے کار رکی تو وہ بے ساختہ بولی۔

''ارے واہ! کیا شان دار جگہ ہے۔ آپ بھی کیا اچھا ذوق رکھتے ہیں۔''

''اور تم، جس نے مجھے انتخاب کیا؟'' اس نے چٹ جواب دیا۔

''ہم ایک دوسرے کی پسند ہیں۔''

''اس میں کوئی شک نہیں کہ ان دنوں ہم دونوں ہی سحر زدہ کی سی زندگیاں گزار رہے ہیں لیکن ہر چیز توازن چاہتی ہے.....'' ابھی میری بات جاری ہی تھی کہ ویٹر نے آرڈر سرو کرنا شروع کر دیا۔

''آپ نے کل مجھے بہت ناآسودہ کیا۔'' اس نے روہانسا سا ہو کر کہا۔

''چھوڑو بھئی! میں ایک دن کیا نہیں آیا کہ تمہارے اعصاب ہی جواب دے گئے۔'' اس نے دھیمے سے کہا۔

''وہ اور بات تھی۔ کہا ناں، ہم میں انتظار کا یارا کم ہے۔'' میں نے قہقہہ لگایا۔

''ہاں بھئی ہم بھی کہاں جا سکتے ہیں تمہاری زنجیر میں عجب لطف بندھا ہوا ہے۔ اچھا ایک بات تو بتاؤ محبت اور عشق میں کیا فرق ہے؟'' اس نے جھٹ ایک گھسا پٹا جواب دیا۔

''محبت فاتح عالم ہے۔'' میں نے مایوس سا ہو کر کہا۔

''اچھا! لیکن یہ تو اچھا خاصا کلیشے ہے۔ تم نے محسوس کیا اس میں کیسی عمومیت سی ہے جب کہ عشق.....'' وہ بات اچک کر بولی۔

''ہم ان دونوں باتوں کو ہم معنی خیال کرتے ہیں۔'' میں نے نفی میں گردن ہلائی۔

''نہیں، یہ کیسے ممکن ہے۔ محبت تو بیک وقت بہت سے افراد سے ممکن ہے جب کہ عشق صرف کسی خاص ہستی پر فریفتہ ہو کر اپنی ذات اس کے لیے مخصوص کر دینے کا سودا ہے۔ یہ ایک پوتر، خالص اور لطیف جذبہ ہے۔'' اس نے سنجیدگی سے اثبات میں سر ہلایا۔

''آپ شاید بہت precise معنوں میں بات کر رہے ہیں۔ مگر فی زمانہ تو عشق مجازی بھی.....'' میں مسکرایا۔

''اس سے زمانے کا کیا ٹانکا یہ تو زمان و مکان سے آگے کا قصہ ہے۔ اور عشق مجازی سو اس کی اپنی لطافتیں ہیں۔'' وہ کشادگی سے مسکرائی۔

''اس معمے بازی کی کیا ضرورت ہے۔آخر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟''میں نے ستایشی نظروں سے اسے دیکھا۔

''تم واقعی ذہین ہو۔تمہارا دعوا ہے کہ میں تمہارے بدن میں لہو کی طرح دوڑتا ہوں اور میرے سوا تمہیں کچھ نظر ہی نہیں آتا۔سوال یہ ہے کہ اگر واقعی ایسا ہی ہے تو آخر تم اپنے گرد میری موجودگی کو محسوس کرنے سے قاصر کیوں ہو؟ تم جہاں ہوتی ہو وہاں میں نہ ہوں کیا یہ ممکن ہے؟''اس کا چہرہ گلنار ہو گیا۔

''اس پہلو سے تو میں نے سوچا ہی نہیں۔''میں نے جواباً کہا۔

''تو اب سوچو،اس سے پہلے کہ سب کچھ بکھر جائے۔''وہ بولی۔

''آج آپ نے مجھے ہفت اقلیم سے نواز دیا۔''میں نے نفی میں سر ہلایا۔

''افسوس تمہاری طلب بہت کم ہے۔عشق کے آگے اس ہفت اقلیم کی کیا حیثیت ہے۔عاشق کو ان کثافتوں سے بے نیاز ہونا چاہئے لیکن ابھی وہ مرحلہ ذرا دور ہے۔فی الوقت تو ہم ایک دوسرے کو دریافت کر رہے ہیں۔یہ ایک دل نشین عمل ہے تم اسے انجوائے کیوں نہیں کرتیں؟''اس نے سادگی اور سچائی سے کہا۔

''آپ کسی بھنور کی مانند ہیں اور میں ڈوبتی جا رہی ہوں،مجھے خوف آتا ہے۔میں آپ میں ضم ہو جانا چاہتی ہوں۔''

''ہم دونوں ہی اس کیفیت سے دوچار ہیں لیکن تمہیں کچھ زیادہ ہی بے صبری ہے۔''وہ کھلکھلائی۔

''اندر دھڑ دھڑاتی اس آگ کا کیا کروں؟''

''دوا پشن ہیں۔''

''کیا.....؟''اس نے اشتیاق سے سوال کیا۔

''پارس بننے کا انتظار کرو یا پھر اس میں جل بجھو۔''

''پارس بن کر فائدہ؟''

''محترمہ!عشق،نفع نقصان کا بہی کھاتہ نہیں ہے۔''واپسی کا سفر خاموشی سے کٹا۔وہ اپنے آپ میں الجھی ہوئی تھی۔کسی گہری سوچ میں غلطاں۔اسے ڈراپ کر کے میں گھر لوٹ آیا۔آج پہلی بار اپنی محویت میں اسے کافی کی دعوت دینا بھی یاد نہیں رہا۔میری باتوں نے اسے ایک چیستاں میں الجھا دیا تھا۔پھر کتنے ہی ہفتے اس مکالمے کی امان میں گزر گئے۔وہ خود کو ایک حد کا پابند رکھنے کا عادی بنا رہی تھی لیکن میں دیکھتا کہ کٹورا چھلکا جاتا ہے۔اب ہم نے اپنے دن اپنے موبائل سے باندھ لیے تھے اور شامیں مختلف تقریبات

سے،وہیں ہماری ملاقات ہو جاتی۔وہ گاہے گاہے کسی نہ کسی بہانے مجھے واپسی پر گھر لے آتی اور پھر ہم رات گئے تک ایک دوسرے میں مشغول ہو جایا کرتے۔اس کا بدن اپنی نازکی اور دل کشی میں تیز نشے کی تاثیر رکھتا تھا۔اس پر سپردگی اور آمادگی میرے جسم میں قید وحشی کو بھڑکاتیں مگر.....ایک ایسی ہی بے پناہ رات میں جب ہم بکھر رہے تھے اچانک اس نے پوری شدت سے خواب گاہ میں چلنے کا مطالبہ کر دیا۔وہ میری کوئی بات سننے پر آمادہ نہیں تھی۔اس پر وحشت اور ایک نوع کی دیوانگی سواری گانٹھ چکے تھے۔میں نے کوشش کی کہ وہ باز آ جائے لیکن جیسے جیسے میں سمجھاتا اس کی ضد میں تندی آتی جاتی تنگ آ کر میں نے ترش لہجے میں اس کا مطالبہ رد کر دیا۔شدید ترین مایوسی کے بعد وہ یکا یک ایک عجب ڈھنگ سے مسکرائی۔

''اچھا!ٹھیک ہے۔جائیں،آپ جائیں۔''اس کے لہجے میں جانے کیا تھا کہ میں کٹ سا گیا۔اور اس کے اس غیر معمولی ردعمل پر غور کرتا ہوا میں گھر لوٹ آیا۔مجھے لگا جیسے میں ایک کم یاب موتی گنوا بیٹھا ہوں۔رات بہت بے چینی میں گزری۔دوسرے دن سورج نصف النہار پر تھا کہ موبائل جاگ اٹھا۔یہ اسی کا فون تھا۔میں نے چی کنم میں کال ریسیو کی۔

''ہیلو.....''وہ سرد مہری سے کہہ رہی تھی۔

''شہزاد صاحب!آپ بھی خوب آدمی ہیں۔آئے دن الاؤ دہکاتے ہیں اور پھر اسے جوں کا توں چھوڑ کر چل دیتے ہیں۔روز روز کی اس اذیت نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا کہ میں نے جسے آپ کے کردار کی رخشندگی سے منسوب کیا تھا کہیں وہ آپ کی ایک مجبوری تو نہیں ہے۔صاحب،جسم کے بھی کچھ تقاضے ہوتے ہیں انہیں باتوں سے کب تک بھلایا جا سکتا ہے؟''میں نے اسی کے انداز میں کہا۔

''محترمہ آپ کا خیال قطعی غلط ہے میری کوئی مجبوری نہیں لیکن.....''

''لیکن کیا؟''وہ غرائی۔

''لیکن میں موتی کو آب سے محروم نہیں کر سکتا۔''اس نے میرا جواب سن کر لائن کاٹ دی۔

یہ ہمارے درمیان ہونے والا آخری مکالمہ تھا۔

◀◀ ● ▶▶

Flat No:A-424,Cassim Complex,Block-18,
Gulistan-e-Jauhar
Karachi(Pakistan) + 92 3002385591

● ڈاکٹر نگہت نسیم

آلو قیمہ

سکینہ کو کراچی کے سب سے بڑے دماغی امراض کے ہسپتال میں داخل ہوئے تین دن گزر چکے تھے، جہاں مجھے نفسیات کی گتھیوں کو سلجھاتے ہوئے کوئی دسواں برس تھا۔ وہ جب سے آئی تھی اس وقت سے چپ تھی بلکہ وہ تو کئی دنوں سے چپ تھی اور کئی ڈاکٹروں سے علاج کے بعد ہی مینٹل ہوسپٹل لائی گئی تھی۔ سکینہ دبلی پتلی تیکھے نین نقش کی پرکشش لڑکی تھی۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں یا تو حیرانی نظر آتی یا پھر ویرانی۔ چہرے کی زردی میں یاسیت نمایاں تھی۔ خوبصورت کٹاؤ والے ہونٹ پانی کی کمی کی وجہ سے بیجان لگ رہے تھے۔ گہرے نیلے پھولدار شلوار قمیض کی سلوٹیں بتا رہی تھیں کہ وہ کئی راتوں سے صرف کروٹیں بدلتی رہی ہے۔ گہری نیلی کناری والے سفید دوپٹے میں سے جھانکتے کالے بال اس کے چہرے سے اپنایت میں ایسے لپٹ رہے تھے جیسے تسلی دے رہے ہوں۔ سکینہ کے پاس ہر بات کے جواب میں صرف ایک چپ تھی۔ کچھ کھانے کو دیتے تو ایسے پتھر کی ہو جاتی جیسے نہ اسے کچھ سنائی دے رہا ہو اور نہ ہی کچھ دکھائی دے رہا ہو۔ آج اس کو مینٹل ہسپتال کے انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں داخل ہوئے تیسرا دن تھا۔ دوا کی مقدار بھی بڑھائی جا چکی تھی اور ڈرپ بھی لگ چکی تھی اور میں سوچ رہی تھی کہ چپ کے اس سمندر کو کیسے عبور کروں۔ اگر کل تک سکینہ نے کچھ نہ کھایا اور نہ بولا تو ایمرجنسی میں الیکٹرک شاک (ای سی ٹی) دینا پڑ جائے گا۔ کاش کہ سکینہ اس سے پہلے ہی کچھ بول پڑے اور کچھ کھا لے تا کہ اس طریقہ علاج کی ضرورت نہ پڑے۔

سکینہ کے گھر والوں میں سے اس کی ماں اور بہن کے ساتھ اس کا شوہر اور ساس آفس کے باہر انتظار گاہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں آج بھی سکینہ سے ملاقات کے بعد انہیں کچھ نہ بتا پائی کہ سکینہ کب تک اس حالت میں رہے گی۔ وہ ہر بار کی طرح آج بھی وہی بات کہہ رہے تھے جو سکینہ کو ہاسپٹل داخل کرواتے وقت بتائی تھی۔ سکینہ کی ماں رندھے ہوئے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

''سکینہ ٹھیک ٹھاک تھی۔ اپنے گھر ہنسی خوشی رہ رہی تھی، جانے کیا ہوا ہے؟'' پھر سفید سوتی دوپٹے سے آنسو پونچھتی جاتی اور کہے جاتی۔

''ابھی عمر ہی کیا ہے میری بچی کی..... یہی کوئی چوبیس سال..... ہائے یہ کوئی عمر ہے بیمار پڑنے کی..... دوا کھانے کی۔'' پھر ماتھا پیٹ لیتی اور کہتی۔

''نظر کھا گئی میری بچی کو۔ کوئی پیر فقیر کرو ..... کہیں جن بھوت کا سایہ ہی نہ ہو۔'' جس پر سکینہ کی چھوٹی بہن تہمینہ اپنی ماں کو فوراً ٹوک دیتی۔

''توبہ کریں امی جی!، کوئی جن بھوت نہیں ہے۔ کسی پیر فقیر کی ضرورت نہیں۔'' پھر میری طرف متوجہ ہوتی اور کہتی۔

''سکینہ کو بچے بہت اچھے لگتے ہیں۔ اللہ پاک نے شادی کے دو برس بعد اسے بیٹا دیا تھا..... احمر..... پر وہ ایک برس کا بھی نہ ہونے پایا تھا کہ اللہ پاک نے واپس لے لیا۔ اس کے بعد سے کوئی خوشخبری سکینہ کے دامن میں نہیں آئی۔ اپنی اس کمی کو سکینہ بہت محسوس کرتی تھی اور چپ سی ہو کر رہ گئی تھی۔ شاید اسی لیے اب زیادہ بیمار ہو گئی ہے۔'' پھر خاموش سا سکینہ کا شوہر اعجاز آہستہ آہستہ بتاتا۔

''باجی، ہماری طرف سے سکینہ پر اولاد نہ ہونے پر کوئی دباؤ نہیں ہے سب اس کی دلجوئی کرتے ہیں۔ خدا جانے کس کی بات کو دل پر لے لیا ہے۔'' بھلا اس سارے منظر میں سکینہ کی ساس کیوں نہ بولتی وہ اپنے بیٹے کی طرف دیکھتی اور نظروں ہی نظروں میں اسے خاموش رہنے کا حکم جاری کرتی اور خود سکینہ کی ماں کی طرف دیکھتے ہوئے بولے جاتی۔

''ہائے، بہت علاج کروایا کہ بہو کی گود ہری ہو جائے۔ ہم نے تو کوئی پیر فقیر نہیں چھوڑا۔ بس اللہ کی رحمت ہی اس کے ساتھ نہیں ہے۔ کتنی بار سمجھایا کہ لوگوں سے ملنے جلنے میں احتیاط کیا کرو پر آج کل کی لڑکیاں جہاں منہ اٹھایا چل پڑتی ہیں۔ کچھ مہینوں سے تو سکینہ پر نیا بھوت سوار تھا۔ یتیم خانے جانے کا اور خدا جانے وہاں کا کون سا بچہ گود لینے کا رونا ڈالے رکھتی تھی۔'' پھر وہ خونخوار نظروں سے سکینہ کی ماں کی طرف ایسے دیکھتی جیسے ایسا کرنے کو انہوں نے ہی کہا ہو۔ اتنی آوازوں کے بیچ سکینہ چپ رہتی۔ سر جھکائے زمین کی طرف ایسے دیکھتی رہتی جیسے اس کے اردگرد کوئی نہ رہتا ہو اور نہ بستا ہو۔ کسی کے پاس بھی مزید کچھ نیا کہنے کو نہ تھا۔ انٹرویو والے کمرے میں ایک لمبی سی خاموشی چھا گئی جسے میں نے ہی توڑا اور ایک نئی یقین دہانی کے ساتھ سکینہ کے تمام گھر والوں کو واپس گھر جانے کو کہہ دیا اور خود سکینہ کی کیس ہسٹری میں الجھ گئی۔

سکینہ کو داخل ہوئے چوتھا روز تھا..... اور اس کی چپ کو کئی دن۔ ایسا کب تک؟ آج میں نے

سوچ لیا تھا کہ مجھے اس یتیم خانے ضرور جانا ہے جہاں سکینہ چوری چوری جایا کرتی تھی اور اس بات کو اس کی ساس نے باتوں باتوں میں ہر انٹرویو میں جتایا تھا۔ یتیم خانے کی تفصیل سکینہ کے شوہر اعجاز سے مل گئی تھی۔ اسی نے بتایا تھا کہ احمر کی پیدائش پر اسی یتیم خانے کو بچوں کو بلا کر ان دونوں نے خوشی منائی تھی۔ فون پر یتیم خانے کے منیجر سرمد صاحب سے سکینہ کے سلسلے میں ملاقات کا وقت صبح کے دس بجے مقرر ہو چکا تھا۔ میں نے کتابیں بند کیں اور یتیم خانہ جانے کے لیے تیار ہونے لگی۔ اعجاز نے بہت کہا کہ وہ بھی ساتھ چلے گا پر میں نے اسے منع کر دیا۔ میرے ذہن میں کئی سوال تھے جنہیں جاننا میرے لیے بہت ضروری تھا۔ مجھے سکینہ کو سمجھنا تھا۔ پھر مجھے آگے بہت کچھ علاج کے بارے بھی سوچنا تھا۔ فیصلے تنہائی مانگتے ہیں جو مجھے اس وقت چاہئے تھی۔

میں اعجاز کے بتائے ہوئے پتے پر یتیم خانہ پہنچ چکی تھی جو چھوٹی سی پیلے رنگ کی بلڈنگ تھی اور جس کی دیواروں پر جا بجا رنگ اتر چکا تھا۔ عمارت کے دونوں طرف چھوٹے چھوٹے بغیر رنگ کے لوہے کے دروازے تھے جو شاید آفس میں کام کرنے والوں کی گزرگاہ تھی۔ عمارت کے بیچوں بیچ بڑا سا لوہے کا ہی کالا گیٹ تھا جس پر بڑا سا کالے ہی رنگ کا تالا لگا ہوا تھا۔ گیٹ سے باہر ایک باوردی چوکیدار کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے سرمد صاحب سے دس بجے کی ملاقات کا بتایا۔ اس نے مجھے دائیں طرف لوہے کے بے رنگ چھوٹے سے گیٹ کی طرف اشارہ کیا اور اندر جانے کو کہا۔ میں چوکیدار کو شکریہ کہتے ہوئے دائیں طرف بڑھ گئی۔ سرمد صاحب جیسے میرے ہی منتظر تھے۔ درمیانی عمر کے خوش اخلاق سے سرمد صاحب بے حد احترام سے ملے۔ انہوں نے بتایا کہ ان کا یتیم خانہ بغیر کسی نام کے اس لیے ہے کہ ہر بچے کو اپنا ہی گھر لگے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ ان کے یتیم خانے میں دو سو بچے ہیں جن کی عمریں پانچ سال سے لے کر اٹھارہ برس تک ہیں۔ انہیں قران پاک مدرسے میں پڑھایا جاتا ہے جو یتیم خانے کے اندر ہی ہے۔ یہیں پر ان کے لئے پرائمری اسکول اور ہائی اسکول تک کا انتظام ہے۔ وہ بڑی دردمندی سے بتا رہے تھے۔

''اسلام میں سب سے زیادہ یتیم کے حق کا ذکر ہے پر اسلامی ملکوں میں ہی یتیم سب سے زیادہ تکلیف سہتے ہیں۔ ان کے لیے فنڈز کم ہوتے ہیں۔ گورنمنٹ کی سرپرستی نہیں ہوتی۔ اور تو اور انہیں نہ ہی کوئی اپناتا ہے اور نہ ہی اپنے بچوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔'' ان کے پاس زیادہ تر بچے ایسے تھے جو کشمیر اور کوئٹہ میں ظلم و بربریت میں مرنے والے والدین کے تھے یا زلزلوں میں بچ جانے والے بچے۔ میں خاموشی سے سرمد صاحب کی باتیں سن رہی تھی۔ یتیم خانے کی دنیا ہماری دنیا سے کتنی الگ تھی۔ ہر

رشتے سے محروم ایک دوسرے میں رشتے تلاش کرتے ہوئے کمسن بچے جن کا ہماری دنیا سے صرف صدقہ خیرات کا رشتہ تھا۔ پاروں اور تسبیحات کا رشتہ..... مرگ و برسی پر فاتحہ کا رشتہ.....!

''آپ فون پر کچھ سکینہ صاحبہ کے بارے بتا رہی تھیں۔'' میں نے چونک کر سرمد صاحب کو دیکھا جواب چائے پانی کا مجھ سے پوچھ رہے تھے۔ جسے شکریہ کہہ کر میں نے منع کر دیا اور سکینہ کی بابت ضروری معلومات انہیں پہنچائیں۔ انہوں نے بتایا کہ سکینہ انتہائی خوش اخلاق عورت تھی۔ کوئی دو برس سے یہاں آ رہی تھی۔ وہ پہلے تو کبھی کبھار آتی تھی پھر کچھ عرصے سے ہر پندرہ روز میں ایک بار یہاں ضرور آتی۔ بچوں میں گھل مل جاتی۔ ان کے ساتھ کھیلتی، انہیں کھانا کھلاتی، کہانیاں سناتی اور واپس چلی جاتی۔ بچوں کو اس سے بے حد پیار تھا۔ کوئی ایک ماہ سے وہ نہیں آئی اور ہر بچہ انہیں پوچھ چکا ہے۔ سرمد صاحب نے یہ کہہ کر مجھے اور حیران کر دیا کہ وہ کبھی کسی کے ساتھ نہیں آتی تھی لیکن آفس میں سب جانتے تھے کہ سکینہ اعجاز کی بیوی ہے اور احمر کی ماں تھی کیونکہ احمر کی پیدائش پر اس نے ہی خصوصی طور پر اس یتیم خانے کے بچوں کو اپنے گھر دعوت دی تھی جسے بچے آج بھی یاد کرتے ہیں۔ پھر وہ مجھے ساتھ لے کر آفس سے نکلنے لگے۔ اسی اثنا میں اندر فون کی گھنٹی بجنے لگی اور سرمد صاحب مجھ سے معذرت کرتے ہوئے فون ریسیو کرنے چلے گئے۔ میں سرمد صاحب کے آفس سے باہر نکل آئی۔ آفس کا ایک دروازہ یتیم خانے کے اندر کی جانب بھی کھلتا تھا۔ وہاں سے تین سیڑھیاں اتر کر سیدھی ایک روش سی جا رہی تھی۔ میں اسی روش پر کھڑی دونوں جانب دیکھ رہی تھی جہاں گھاس کا فرشی قالین بچھا ہوا تھا جس پر بچوں کے لیئے چھوٹے بڑے جھولے لگے ہوئے تھے۔ گھاس کے دائیں بائیں چورس سبز ٹکڑوں کے آخری جانب جہاں سے پکی اینٹوں والا برآمدہ شروع ہوتا تھا وہاں دونوں طرف درخت لگے ہوئے تھے جس کی چھاؤں میں تنے سے جڑا ایک واٹر کولر رکھا ہوا تھا اور ساتھ ہی ایک بنچ تھی جہاں غالباً بچے بیٹھ کر پانی پیتے ہونگے یا پڑھتے ہونگے یا پھر باتیں کرتے ہونگے۔ اپنی قسمت کا سوچتے ہونگے۔ اپنے پیاروں کو یاد کرتے ہونگے۔ اور اگر باہر کی دنیا کا سوچتے ہونگے تو کیسے کیسے نہ تڑپتے ہونگے..... پھر اداس ہو کر اپنے کمروں کو لوٹ جاتے ہونگے۔ وہ کمرے برآمدے کے سامنے ہی بنے ہوئے تھے۔ کمروں کے دروازے کھلے ہوئے تھے جہاں ہر کمرے میں چھوٹی بڑی کئی چارپائیاں پڑی ہوئی تھیں جن پر رنگ برنگے بستر بہت سلیقے سے لگے ہوئے تھے۔ دل میں آیا کہ کمروں کے اندر جا کر دیکھوں کہ ان چار دیواریوں پر کون سے خوابوں کی فہرست کندہ تھی جو ہمارے خوابوں سے الگ تھی۔ میں نے ابھی چند قدم آگے ہی بڑھائے تھے کہ میں وہیں رک گئی۔ کسی نے میرا آنچل ہلکے سے کھینچا تھا۔ میں گھبرا کر پلٹی۔ ہلکے نیلے رنگ کی نیکر اور شرٹ پہنے سانولے سے رنگ کا صاف ستھرا سا بچہ بڑی معصومیت سے میرے آنچل

کو تھامے مجھے تک رہا تھا۔ وہ بچہ مشکل سے سات برس کا ہوگا لیکن اس کی آنکھوں میں سات قرنوں کے سوال پوشیدہ تھے۔ میں اس کے قد کے برابر آنے کے لیے فرش پر بیٹھ گئی۔ اس کی امید سے بھری چمکیلی آنکھیں میری چہرے پر مرکوز تھیں اور مجھے لگ رہا تھا جیسے وہ میرے دل کے اندر اتر رہا تھا۔ میں نے بے اختیار ہو کر پوچھا۔

''کیا نام ہے اتنے پیارے بیٹے کا؟''

''آلو قیمہ!'' اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''کیا عمر ہے تمہاری؟''

''آلو قیمہ!!'' اس نے پھر وہی جواب دیا تو دوسرے بچے جانے کہاں چھپے ہوئے تھے، باہر نکل کر ہنس پڑے۔

''تم یہاں کب سے ہو بیٹے؟''

''آلو قیمہ!!!'' بچے کے جواب نے مجھے پریشان کر دیا پر بچوں کے بلند ہوتے قہقہے بھی اسے پریشان نہ کر سکے۔ وہ اب بھی مسکرا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ابھی بھی میرا آنچل دبا ہوا تھا۔

''بیٹا! تم کون سی کلاس میں پڑھتے ہو؟'' اس نے اپنا سر زور سے ہاں میں ہلایا اور کہا۔

''آلو قیمہ!!!!''

''معاف کیجئے گا آپ کو تکلیف ہوئی بہت ضروری فون آ گیا تھا۔'' سرمد صاحب کی بات پر میں نے جلدی سے اس بچے کے ہاتھ سے اپنا آنچل چھڑایا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور محویت سے پوچھا۔

''یہ بچہ کون تھا؟'' سرمد صاحب مسکرا دیئے۔

''ڈاکٹر صاحبہ یہ بچہ یاسر بہت اسپیشل ہے۔ اس کی پیدائش کے سال بعد ہی اس کے ماں باپ ایک حادثے میں وفات پا گئے تھے اور اسے اس کے چچا نے ہمارے ہاں داخل کروا دیا تھا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن پھر پلٹ کر خبر نہ لی۔''

''پر اس معصوم کو ماں چاہئے سرمد صاحب! کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آٹھ سال سے کم عمر کے بچے لڑکیوں کے یتیم خانوں میں پلیں تا کہ انہیں ماں کے لمس سے آشنائی رہے۔'' میں بے اختیار کہہ گئی۔

''جی، جی، آپ کی بات درست ہے پر ہم کوشش کے باوجود ایسا نہیں کر سکتے۔'' سرمد صاحب کو شاید دفتری پالیسیاں یاد آ گئی تھیں جو جزوی طور پر پرائیویٹ اداروں کو کچھ زیادہ ہی درپیش رہتی تھیں۔ وہ بتا رہے تھے۔

''آج سے کوئی تین سال قبل اعجاز اور سکینہ یہاں تشریف لائے تھے۔ ان کے ہاں بیٹا ہوا تھا اور وہ بچے کے عقیقہ کے لیے یتیم خانے کے بچوں کو کھانے پر بلانا چاہتے تھے۔ اس دن سکینہ کی ملاقات یاسر سے ہوئی تھی۔ پانچ برس کا یاسر ان کے ساتھ جیسے جڑ سا گیا تھا۔ دراصل یتیم خانے اور مدرسوں کے بچوں کو لوگ کہاں خوشی کی تقاریب میں بلاتے ہیں۔ پر احمر کے عقیقہ پر پچیس بچے پہلی بار کسی خوشی کو منانے کسی کے گھر گئے تھے۔ انہیں یقین ہی نہ ہو رہا تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔'' سرمد صاحب مسکرا رہے تھے جیسے اس واقعہ کا لطف لے رہے ہوں۔ انہوں نے بڑی محبت سے بتایا۔

''جب بچوں نے اپنا شبہ دور کرنے کے لئے وہاں جا کر پارے مانگے تو سکینہ صاحبہ نے ہنس کر سب کو باری باری گلے سے لگایا اور کہا کہ آج ہم سب لوگ مل کر احمر کی زندگی اور خوشیوں کے لئے دعا کریں گے اور صرف خوشی منائیں گے۔ واپسی پر انہوں نے سب بچوں کو تحفے بھی دیئے اور پچاس پچاس روپے بھی بانٹے۔ یاسر بچوں میں سب سے چھوٹا تھا، ساری رات خوشی سے سویا نہیں۔ سکینہ نے اس دن بچوں کی فرمائش پر اپنے ہاتھ سے آلو قیمہ بنایا تھا۔'' میری حیرانگی قابل دید تھی۔ اب ہم کافی کمروں کے سامنے سے گزر کر ملحقہ مدرسے کے سامنے کھڑے تھے جہاں بچے قران پاک پڑھ رہے تھے۔ سرمد صاحب آگے آگے تھے اور میں ایک معمول کی طرح ان کے ساتھ چل رہی تھی..... خاموش پر سب کچھ اپنے اندر جذب کرتے ہوئے۔ اب ہم یتیم خانے کے اسکول کے سامنے تھے جہاں دو کمروں میں پرائمری کی کلاس ہو رہی تھی اور تیسرے کمرے میں سیکنڈری کی کلاس۔ میں سوچ رہی تھی کہ اگر یہ دو سو بچے سڑک پر ہوتے تو کیا ہوتا؟ سرمد صاحب کی بات نے مجھے چونکا دیا۔ وہ کہہ رہے تھے۔

''یتیم خانوں اور مدرسوں میں جو بھی صدقے خیرات میں آتا ہے وہ زیادہ تر بریانی رائتہ ہی ہوتا ہے یا پھر قورمہ۔ ہمارے بچوں نے سن رکھا تھا کہ آلو قیمہ ایک ڈش ہے جو صرف ماں ہی اپنے بچوں کو بنا کر کھلاتی ہے۔ یاسر نے کبھی آلو قیمہ نہیں کھایا تھا۔ اس نے پہلی بار فرمائش کی تھی سکینہ صاحبہ سے اور انہوں نے اپنے وعدے کے مطابق آلو قیمہ بنایا بھی تھا۔ یاسر کو اتنا مزا آیا کہ اس دن سے ہر آنے جانے والے کو خوشی خوشی بتاتا ہے کہ اس نے بھی آلو قیمہ کھایا ہوا ہے۔ سکینہ صاحبہ جب بھی آتی یاسر کے لیے آلو قیمہ اپنے ہاتھ سے بنا کر لاتی تھی اور اپنے ہاتھوں سے کھلایا کرتی تھیں۔ یاسر ان کی غیر موجودگی سہار نہیں سکا اور جب سے وہ ہر کسی کو اس کے سوال کے جواب میں آلو قیمہ کہہ دیتا ہے۔ آپ برا نہ منائیے گا۔'' میں نے پلٹ کر اس معصوم کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اس وقت بھی اس کی خواہشیں امید کا جھولا جھلا رہی تھیں۔ میں یاسر کی معصومیت، محرومی اور ان گنت سوالوں کو اپنی آنکھوں میں لیے واپس مینٹل ہاسپٹل آ گئی اور اب میں سکینہ کے

روبرو تھی.....وہی اداس مضمحل آنکھیں.....دن بدن کمزور ہوتا جسم اور سکوت کا نوحہ لکھتا اس کا وجود.....

''سکینہ! آج میں اس یتیم خانے گئی تھی جہاں تم جایا کرتی تھیں۔'' اس نے میری بات پر بے چینی سے مجھے دیکھا پر کہا کچھ نہیں!

''میں نے بہت سارے بچوں سے ملاقات کی۔ بچے تمہیں بہت یاد کرتے ہیں پر یاسر تمہارے بغیر بہت بہت اداس ہے۔'' میری بات پر سکینہ کی آنکھوں میں اعتبار کا رنگ چھلکنے لگا۔ وہ کرسی پر بیٹھی بے چینی سے پہلو بدلنے لگی۔ میں نے آہستگی سے کہا۔

''تم بہت اچھی ہو سکینہ۔ تم درد کی زبان جانتی ہو۔ تم دوسروں کی خواہشوں کو خوشبو کی طرح خود پر چھڑک لیتی ہو۔ پھر ان خواہشوں کو اپنائیت اور شفقت کا پیراہن دے دیتی ہو..... ماں ہو جاتی ہو۔'' سکینہ کی آنکھوں میں زندگی کے سرخ ڈورے تیرنے لگے۔ میں نے اعتبار کے منظر میں ایک نیا رنگ بھرنے کی کوشش کی۔

''کیا نام ہے تمہارا؟'' میں اس سے زندگی کا تعارف نئے سرے سے کروانا چاہتی تھی۔

''آلو قیمہ!'' اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''کیا عمر ہے تمہاری؟''

''آلو قیمہ!! سکینہ نے سکون سے جواب دیا۔

''کیا تم جانتی ہو کہ یہاں کب سے ہو؟''

''آلو قیمہ!!!'' سکینہ کے جواب پر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مجھے لگا جیسے یاسر کے نرم ہتھیلیوں میں میرا آنچل دبا ہو۔

''تمہیں یاد ہے..... بیمار ہونے سے پہلے تم نے یتیم خانہ جانے کی ضد کی تھی اور تمہیں کمرے میں قید کر دیا گیا تھا۔'' اس نے اپنا سر زور سے ہاں میں ہلایا اور مسکراتے ہوئے کہا۔

''آلو قیمہ!!!'' سکینہ کے ایک ہی جواب پر میرے کئی سوال سانس لینا بھول گئے۔ اعتبار کے منظر نے، بے اعتبار رشتوں کے سارے بھید کھول دیئے تھے۔

◀◀ ● ▶▶

21-Junction Road
Moorebank,NSW-2170
Australia
9425 20 1035

● م۔ص۔ایمن

کیمیا

بیر بھائی سکول ٹیچر تھے۔ صبح آٹھ بجے سکول پہنچنے کے لیے انہیں سات بجے سے پہلے لامحالہ گھر سے رخصت ہونا ناگزیر ہوتا ہے۔ اور سات بجے سے پہلے پہلے ناشتے جیسی مصروفیات سے فارغ ہونا بھی لازم ہے۔ اس سبب، علی الصبح بیدار ہوتے، نماز فجر کے بعد ان کی پیٹھ کسی قسم کے بھی 'ٹیک' سے محروم ہو جاتی، اور سردی کے موسم میں تو عین فجر کی نماز کے وقت انہیں گھر سے نکلنا پڑتا۔ چھٹی ہوتی تو کچھ دیر کے لیے گھر آتے، دوپہر کا کھانا سہ پہر کے وقت کھاتے، چند منٹ آرام کرتے اور پھر مختلف گھروں میں بچوں کو ٹیوشن دینے نکل کھڑے ہوتے۔

حسب معمول ایک بار وہ صبح بیدار ہوئے، غسل کی نیت کی تو صابن ندارد۔ اب کیا کیا جائے؟ اس وقت تو دکانیں بھی سب بند ہیں۔ 'حسب معاشرہ' انہوں نے اپنا غصہ بچوں پر اتارا، خوب بھڑاس نکالی۔ زوجہ محترمہ نے ڈرتے ڈرتے مشورہ دیا کہ 'فجو' پان والے کی دکان کھل گئی ہوگی، جا کر وہاں سے صابن لے آئیں۔ اس مشورے نے گویا جلتی پر تیل کا کام کیا، بولے۔

''پان والے کی دکان سے صابن لے آؤں؟ میں پان والے سے صابن مانگوں گا تو کیا وہ مجھے عقلمند شہری سمجھے گا؟''

بیگم نے کہا۔ ''اس وقت اسی کی دکان کھلی ہوتی ہے اس کی دکان پر ایسی چھوٹی موٹی چیزیں مل جاتی ہیں، آپ جائیں تو سہی۔''

طوعاً و کرہاً وہ فجو پان والے کی دکان پر چلے گئے۔ لیکن پان والے سے صابن مانگنا انہیں انتہائی حماقت انگیز حرکت معلوم ہو رہی تھی۔ وہ چپکے کھڑے رہے، تا آنکہ ایک اور صاحب آئے انہیں ان سے بھی زیادہ جلدی تھی آتے ہی ہاتھ بڑھاتے نہانے کا صابن مانگا، فجو کے دونوں ہاتھ چل رہے تھے، ایک ہی جگہ کھڑے کھڑے اس نے کمر کو بل دیا اور پیچھے دیکھے بغیر ہی اپنے سر کے اوپر ایک خانے میں سے نہانے کا

صابن نکال اس گاہک کو دے دیا۔اس سے سو روپے کا نوٹ لیا۔ بقایا واپس کیے اور دوسرے گاہک کی جانب متوجہ ہو گیا۔شبیر بھائی بھی شیر ہو گئے انتہائی رعب سے بولے۔

''ایک صابن مجھے بھی دو۔'' صابن لے کر'سو کا نوٹ دے کر بقایا لے کر' وہ واپس آ گئے لیکن دل و دماغ فجو کی دکان میں ہی چھوڑ آئے۔

''میں بمشکل تین منٹ فجو کی دکان پر کھڑا ہوا۔ان تین منٹوں میں فجو کے گولک میں سو سو کے پانچ نوٹوں کا اضافہ ہوا؟ یار! یہ کام تو ٹھیک ہے، پان کی دکان کی آڑ میں اس نے جنرل سٹور بنا رکھا ہے۔ چھوڑ و ٹیوشن کے چکر کو مہینے بعد فیس مانگنا پڑتی ہے، وقت پر ملتی ہی نہیں۔کیوں نہ یہی کام کیا جائے؟'' یہ خیال شبیر بھائی کے دماغ میں جم سا گیا۔اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے اسی موضوع پر اسی ڈگر پر سوچتے رہتے، ایک دن انہوں نے اپنے ساتھی قاسم سے ذکر کیا قاسم نے تائید کی۔

''کام تو بڑا اچھا ہے، ندیم بھائی کی بھی اپنی دکان ہے، وہ ایک زمانے سے یہ کام کر رہے ہیں۔''

ندیم، قاسم اور شبیر کی انتہائی اہم 'میٹنگ' ہوئی جس میں ندیم نے اس کاروبار کے اسرار و رموز انہیں منتقل کیے، جس میں انتہائی اہم نکتہ یہ تھا کہ 'پان کا سارا ذائقہ' کتھے' میں ہوتا ہے۔

شبیر بھائی چونکہ اپنے علاقے میں 'ماسٹر صاحب' کے نام سے مقبول تھے، اس لیے انہوں نے اپنے علاقے سے دور، تاکہ تعلیم کا بھرم بھی قائم رہے اور بزنس بھی جاری رہے، گلستان جوہر میں کرائے کی ایک دکان تاکی اور بطور پارٹ ٹائم 'سائیڈ بزنس' کا آغاز کر دیا۔وہاں ان کی دکان کے علاوہ پان کی چند دکانیں پہلے سے موجود تھیں، ان کے لگے بندھے گاہک تھے جو برسوں سے انہی دکانوں سے پان کھا رہے تھے، انہیں اپنی دکان پر بلوانا، اپنا مستقل گاہک بنانا بے حد مشکل تھا اور شبیر بھائی نے اس مشکل کام کو چیلنج سمجھ کر کیا۔انہیں یہ گُر یا نکتہ معلوم ہو چکا تھا کہ پان کی جان کتھے میں ہوتی ہے۔اور عام بازاری کتھا تو سب ہی استعمال کرتے ہیں، میرا کتھا سپیشل ہونا چاہیے۔پڑھا لکھا پنواڑی ہونے کا کچھ تو فائدہ ہو! چنانچہ وہ میرے پاس لائبریری میں آئے اور کتھا سازی سے متعلق کتاب طلب کی۔میں نے ان کے حوالے کر دی، قیمت سن کر حیران ہو گئے، کتاب کی قیمت چار سو روپے تھی، بہر کیف سوچ کر اور یہ سمجھ کر کہ کتھا بن گیا تو کتاب کی قیمت کتھے میں سے ہی نکل آئے گی۔وہ کتھا سازی کی کتاب لے کر چلے گئے۔

بات آئی گئی ہو گئی تھی مجھے اس سے کوئی غرض نہ تھی کہ وہ کتابی ترکیب سے کتھا بنانے میں کامیاب ہوئے یا نہیں؟ تاہم ایک بار انہوں نے شدہ شدہ ذکر کیا کہ کتاب میں بہترین ترکیبیں ہیں اور بہت عمدہ کتاب ہے۔

چار پانچ مہینے گزر گئے۔ایک دن لائبریری پر آئے اور بولے۔

''ذرا لغات دکھائیں ایک لفظ کا مطلب دیکھنا ہے۔''

اگر کوئی شخص مجھ سے لغت مانگے تو یہ میرا امتحان ہوتا ہے۔لغت دینے سے پہلے پہلے اس سے پوچھ لیتا ہوں کہ وہ کس لفظ کا مطلب دیکھنا چاہتا ہے، اور عموماً یعنی کم و بیش پنچانوے فیصد مطالب، لغت کھولنے سے پہلے ہی میں بتا چکا ہوتا ہوں، جس کی تصدیق لغت دیکھنے کے بعد ہو جاتی ہے۔حسب عادت میں نے ان سے بھی پوچھ لیا کہ کس لفظ کا مطلب دیکھنا چاہتے ہیں؟ بولے۔

''کٹھالی' کا، کٹھالی کیا چیز ہوتی ہے۔'' میں نے لغت دیتے ہوئے کہا۔

''یہ مخصوص پتھر کا بنا ہوا ایک برتن ہوتا ہے جو دھات پگھلانے کے کام آتا ہے۔اس پیالہ نما برتن میں کوئی بھی دھات ڈال کر اسے بھٹی میں رکھ دیتے ہیں وہ دھات پگھل جاتی ہے جبکہ کٹھالی نہیں پگھلتی۔ پگھلی ہوئی دھات سانچے میں انڈیل دی جاتی ہے، جو سانچے میں ڈھل کر فوراً ہی جم جاتی ہے۔''

انہوں نے لغت کھولی مطلوبہ صفحہ نکالا، میرے بتائے گئے مطلب کی تصدیق بھی ہو گئی اور یہ بھی کہ میں نے اس سے زیادہ ہی تفصیلی معلومات فراہم کی تھیں

''یہ کٹھالی ملے گی کہاں سے؟'' ان کا دوسرا سوال تھا۔

''کیا مطلب؟ آپ کو کیا ضرورت پڑ گئی؟ آپ کے کس کام کی؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ اس وقت لائبریری میں چند دیگر افراد بھی موجود تھے وہ ان کی جانب کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے بولے۔

''بتاؤں گا۔لیکن یہ بتائیں کہ یہ کٹھالی ملے گی کہاں سے؟'' میں نے کہا۔

''بھئی! کٹھالیوں کے سائز ہوتے ہیں چھوٹی سے چھوٹی یعنی ایک دو انچ کی بھی ہوتی ہے اور بڑی سے بڑی آرڈر دے کر بنوائی جاتی ہے آپ کو کتنی بڑی چاہیے؟'' وہ بولے۔

''مجھے چھوٹی سی ہی چاہیے ہوگی، ایک دو انچ کی ہی ہو جائے۔'' میں مزید حیران ہوا۔

''اتنی چھوٹی سی کٹھالی تو سنار استعمال کرتے ہیں زیورات بنانے کے لیے، آپ کیا کریں گے؟'' میری بات سن کر موقع پر موجود دیگر افراد نے بھی چونک کر ان کی جانب دیکھا۔

''مجھ سے کسی نے منگوائی ہے۔'' انہوں نے بات نبھائی۔

''ورنہ میرا کیا کام کٹھالی سے؟ میرا ایک رشتہ دار آیا ہوا ہے وہ حکیم ہے، اس نے پریشان کیا ہوا ہے۔'' پھر دیگر موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔

''مجھے ایک چھوٹی سی کٹھالی چاہیے۔'' تخلیہ ہوتے ہی وہ بولے۔

میں نے انہیں پتہ سمجھا دیا کہ جانا انہیں خود ہی پڑے گا جا کر اپنی مرضی سے لے آئیں ۔ مجھے کٹھالی کی قیمت کا بالکل بھی اندازہ نہیں ہے کہ کتنے کی ملے گی ، کتنے کی مناسب ہونا چاہیے؟ ایسے مواقع پر عموماً یہ ہوتا ہے کہ لوگ میری ہی ڈیوٹی لگا دیتے ہیں کہ میں ہی لا کر بھی دے دوں ، گویا جاننے کا جرمانہ بھی میں ہی ادا کروں۔

''آپ کو میرے ساتھ جانا پڑے گا۔'' وہ بولے۔

''میرا جانا کیا ضروری ہے، پتہ بتا دیا ہے جا کر اپنی مرضی کی کٹھالی دیکھ بھال کر لے آئیں مجھے کیا معلوم آپ کو کس کام کے لیے چاہئے'' میں نے جان چھڑانا چاہی۔ وہ ہنسے اور بولے۔

''ایک بات بتاتا ہوں آپ کو، حالانکہ میں اس معاملے میں کسی کو بھی شامل نہیں کرنا چاہتا تھا ممکن ہے کہ آپ کچھ بہتر مشورہ دے سکیں، ہاں! جب آپ کے پاس کوئی ممبر وغیرہ آ جائے گا تو ہم اس موضوع پر بات نہیں کریں گے۔''

یہ وعدہ لینے کے بعد وہ بولے۔''میں نے آپ سے کتاب لی تھی چار سو روپے کی۔ اس میں کتھا بنانے کی ترکیبوں کے علاوہ بھی بے شمار ترکیبیں ہیں۔ میں نے ساری کتاب ہی پڑھ لی۔''

''چار سو روپے پورے کرنے کا یہی ایک طریقہ ہے۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''چار سو روپے نکالنے کا طریقہ بھی ہے۔'' وہ سرگوشی میں بولے۔

''اس میں سونا بنانے کی ترکیب بھی لکھی ہوئی ہے۔''

''اچھا؟'' میں پھر حیران ہوا۔

''میں نے اس ترکیب پر عمل کیا اور سونا بنانے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔'' کہتے ہوئے انہوں نے جیب سے ایک 'براؤن پیپر' (جیسا کہ عام طور پر کاپی کتابوں کی جلد میں استعمال ہوتا ہے) کی تہہ شدہ پرچی نکالی اور بولے۔

''یہ پڑھئے۔''

میں نے پڑھا۔ لکھا ہوا تھا۔

محترم شبیر صاحب، السلام علیکم!

مبارک ہو! آپ سونا بنانے میں کامیاب ہو گئے ہیں اب اس محلول کو کٹھالی میں ڈال کر دو سیر اُپلوں کی آنچ دیں۔ خالص سونا نکل آئے گا۔

نیچے یہ تحریر لکھنے والے کی مہر لگی ہوئی تھی جسے پڑھنے کی کوشش بھی فضول ہی تھی کچھ تو وہ خود مدھم تھی

اور کچھ کاغذ ہی ایسا تھا۔

''یہ کیا ہے؟'' میری حیرانی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ بولے۔

''میں نے کتاب میں لکھی ترکیب کے مطابق عمل کیا، سونا تو بن گیا ہے لیکن سونا نکالنے کی ترکیب کتاب میں نہیں لکھی تھی میں نے ادارے کو خط لکھا تو یہ جواب آیا ہے۔'' میں نے ایک بار پھر غور سے خط کی تین سطریں پڑھیں۔ کچھ سمجھ نہ آئی کہ میں اس پر کیا کہوں؟ میں نے ہونٹ پلٹ دیئے اور بولا۔

''آپ خود ہی بہتر فیصلہ کر سکتے ہیں میں کیا کہہ سکتا ہوں اس سلسلے میں؟''

''میں آپ کو ساری بات بتاتا ہوں،'' وہ گویا ہوئے۔

''کتاب میں مختصر سا فارمولا لکھا تھا کہ قینچی سے فلم کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے 'ہائپو' میں ڈال دیں چار دن بعد فلم کے ٹکڑے نکال دیں، اور اسے نرم آنچ پر پکائیں، پھر اسے چار دن تک یونہی چھوڑ دیں۔ میرا ایک دوست ایک سینما میں ہوتا ہے۔ میں نے اس سے ناکارہ فلمیں منگوالیں، کیمیکل کی دکان سے ہائپو لے آیا، کتاب میں لکھی اس ترکیب پر عمل کیا تو ایک گاڑھا گدلا سا محلول بن گیا اب سمجھ نہ آئی کہ اس کا کیا کروں۔ میں نے ادارے کو خط لکھا۔ تمام صورت حال لکھ کر معلوم کیا تو یہ جواب آیا جو آپ کے سامنے ہے۔ میں نے اس محلول کو کانچ کی بوتل میں ڈال کر رکھا ہوا ہے۔ یہ جواب ملنے کے بعد میں نے اس شیشی کو ہلا کر دیکھا، واقعی اس کے پیندے میں سنہری ذرات دکھائی دے رہے ہیں۔''

اری بات سمجھ کر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ شبیر بھائی سونا بنانے میں کامیاب ہو گئے ہیں اب اسے اس محلول میں سے نکالنا ہے اور اس کے لیے انہیں 'کٹھالی' کی ضرورت ہے۔ میں نے آئیڈیا دیا۔

''آپ کٹھالی بھی اپنی بنالیں اگر تجربہ کامیاب ہوتا ہے تو پھر اگلے مرحلے میں کٹھالی خرید لیجیے گا۔ اپنا بنایا ہوا سونا بیچ کر!'' وہ ہنسے اور بولے۔

''میں کٹھالی کیسے بناؤں؟''

''آپ کہیں سے چکنی مٹی لے لیں ایک پیڑے جتنی۔ اسے گوندھ کر گیند نما بنالیں پھر اس گیند میں انگلی سے سوراخ کریں جو آر پار نہ ہو، اس طرح آپ کی کٹھالی بن جائے گی آپ وہ محلول اس میں ڈال کر ایک آدھ گھنٹہ اسے ساکن حالت میں چھوڑ دیں جب محلول میں سنہری ذرات تہہ نشین ہو جائیں تو اس سوراخ کا منہ مٹی سے بند کر دیں۔ اُپلوں کو چھوڑیں گھر میں سے ہی فالتو لکڑیاں جمع کر کے انہیں الاؤ کی صورت میں آگ لگائیں، اب اس گیند کو اس آگ پر رکھ دیں یہ گیند سخت ہو کر پتھر بن جائے گی۔ جب آگ بجھ جائے گیند ٹھنڈی ہو جائے تو اسے توڑ دیں محلول خشک ہو چکا ہوگا اور سونے کے ذرات پگھل کر یک جان

ہو چکے ہوں گے۔'' انہیں یہ ترکیب سمجھ بھی آ گئی اور بھا گئی۔ پھر کیا ہوا؟ کیا نہیں ہوا؟ کچھ خبر نہیں۔ مجھے تو اتنی فرصت تھی ہی نہیں کہ اس بات کو یاد بھی رکھتا چہ جائیکہ اس موضوع پر گفتگو ہی ہوتی۔

شبیر بھائی بھی پان کی دکان میں بے طرح مصروف ہو گئے تھے۔ راشد منہاس روڈ اور گلستان جوہر کے سنگم پر ان کی پان کی ایک شاندار دکان تھی جو بظاہر پان کی ہی دکان تھی لیکن اندر سے اس قدر کشادہ کہ اس میں روزمرہ ضرورت کی بیشتر اشیاء دستیاب تھیں حتیٰ کہ آپ کی مطلوبہ کوئی ایسی بھی چیز ہوگی جس کے متعلق آپ کا خیال ہوگا کہ یہ مانگ کر مجھے شرمندہ ہونا پڑے گا، اس کے پاس نہیں ہوگی، لیکن آپ کے طلب کرنے کی دیر ہے آپ کی مطلوبہ شے آن واحد میں، اس چھوٹی سی دکان سے برآمد ہو جائے گی۔ یہ دکان صبح اذان فجر سے قبل کھلتی ہے اور رات کے تین بجے تک بھی اہل محلّہ کو خدمات فراہم کرتی دکھائی دے گی۔ اس دکان پر تین افراد باری باری 'ڈیوٹی' دیتے ہیں۔ دن میں تین بار اس دکان کی آمدنی شاپنگ بیگ میں بھر کر گھر جاتی ہے جہاں دکان کے مالک کی بیوی اور بیٹیاں مل کر چھوٹے اور بڑے نوٹوں کو علیحدہ کرنے کے بعد ہی انہیں گن سکتی ہیں۔ یعنی ماشاءاللہ اتنا کیش ہوتا ہے کہ دکان میں اسے گننا ممکن ہی نہیں ہوتا۔ میں سمجھ گیا کہ شبیر بھائی کی سونا بنانے والی ترکیب کامیاب رہی اور یہی وجہ ہے کہ وہ بے حد مالدار ہو گئے ہیں۔ انہوں نے ایک شاندار مکان بنا لیا تھا۔ کار بھی خرید لی تھی اور اب انہوں نے سکول کی نوکری بھی چھوڑ دی تھی۔

میری ان سے عرصے سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ شہر میں ہڑتال ہو گئی۔ سارا بازار بند تھا۔ گھر میں بیکار بیٹھے بیٹھے شبیر بھائی کا خیال آ گیا۔ سوچا چل کر ان سے سونا بنانے کی ترکیب سیکھی جائے۔ چنانچہ میں تیار ہو کر ان کے نو تعمیر شدہ مکان کی طرف چل پڑا۔ حسب توقع وہ بھی گھر پر ہی تھے۔ 'تخلیہ' ہوا تو میں نے ان سے پوچھ ہی لیا۔

''وہ سونے کا کیا ہوا، وہ کٹھالی؟ وہ گدلا سا محلول؟'' جواب دینے کی بجائے وہ اچانک ہنس پڑے۔

''کیا ہوا بھئی۔ کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

ہنستے ہوئے انہوں نے ایک بیہودہ سی ضرب المثل استعمال کی اور بولے۔

''ایک تو ہمارے پاس وقت کی ہمیشہ ہی قلت رہتی ہے، کسی عزیز وغیرہ کا انتقال ہو جائے تو اس کے مرنے کا افسوس نہیں ہوتا اپنے کاروبار کو بند رکھنے کا افسوس ہوتا ہے، ایسے میں بمشکل تمام اپنی نیند خراب کر کے سونا بنانے کی ترکیب پر عمل کیا تھا سونا بن بھی گیا لیکن۔'' وہ اپنی بات روک کر پھر ہنسے۔

''ہنستے رہیں گے، اکیلے ہی؟'' میں نے پوچھا۔ انہوں نے کہا۔

''نہیں آپ کو بھی بتاتا ہوں میں تو اپنی قسمت پر ہنس رہا ہوں اور آپ مجھ پر بھی ہنسیں گے۔''

''میں آپ سے کٹھالی بنانے کی ترکیب معلوم کر کے گیا تھا۔ جا بجا کھدائی ہوتی ہی رہتی ہے۔ ایک جگہ کھدائی میں مجھے چکنی مٹی دکھائی دی۔ میں تھوڑی سی مٹی لے کر گھر آیا۔ چھت پر چڑھ کر، گھر والوں کی نظر بچا کر اسے گوندھا، گیند بنائی اس میں سوراخ کیا، گھر کی چھت پر فالتو لکڑیاں تھیں انہیں آگ لگانے کے لیے جمع کیا، کانچ کی وہ بوتل، جس میں سونے کے ذرات تھے، تلاش کی، نہ ملی۔ ناچار اپنی بیگم سے پوچھ لیا۔

''یہاں ایک بوتل رکھی ہوئی تھی وہ کہاں گئی؟ اس نے چارپائی کے نیچے سے بوتل نکال کر دی اور پوچھا۔ 'یہ والی؟' میں نے بوتل پہچان لی۔

''ہاں یہ والی!'' لیکن اس کے اندر کچھ اور ہی تھا، وہ محلول نہیں تھا۔

''یہ کیا ہے اس کے اندر؟'' میں نے پوچھا۔

''کھانسی کی دوا؟'' جواب ملا۔

''میرے پیروں کے نیچے سے زمین کھسک گئی ''اس کے اندر تو.....''

جواب ملا کہ ''وہ تو پتہ نہیں اس کے اندر کیا کیچڑ جیسا تھا، مجھے کھانسی تھی میں نے اسے گرا کر بوتل دھو ڈالی اور ڈسپنسری سے اس میں کھانسی کی دوا لے آئی۔''

مجھے بہت افسوس ہوا کہ شبیر بھائی نے اتنی محنت سے سونا بنانے کا فارمولا حاصل کیا اور وہ عین وقت پر ناکام، ہو گئے۔ میں نے افسوس ظاہر کیا۔ پھر خیال آیا کہ جب انہیں ترکیب معلوم ہی ہو گئی تھی تو پھر سے بنا لیا ہوگا۔ میرے پوچھنے پر وہ ہنستے ہوئے بولے۔

''نہیں! میں نے وہ طریقہ دوبارہ نہیں آزمایا کیونکہ مجھے سونا بنانے کا ایک اور بہتر اور کامیاب طریقہ مجھے معلوم ہو چکا ہے اور میں سونا بنا بھی رہا ہوں۔'' اب حیران ہونے کی باری میری تھی۔ میں نے حیرت زدہ لہجے میں دریافت کیا۔

''وہ ترکیب کیا ہے؟'' میری بات سن کر کہنے لگے۔

''بھائی صاحب! سونا بنانے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ محنت اور صرف محنت۔ اور آج اسی انتھک محنت کے نتیجے میں میری پان کی دکان سونا اُگل رہی ہے۔'' اور میں نے دیکھا.....ان کے چہرے پر واقعی محنت کی سنہری دھوپ کھلی ہوئی تھی۔

◀◀ ● ▶▶

Aimun Library
Parsi Gate Chanesar Goth
Karachi-75460 Pakistan

● عبد الغنی شیخ

صرف چند کیلومیٹر دور

عادل کو ابو اور امی کے الفاظ یاد آئے۔ کینیڈا روانگی سے پہلے انہوں نے کہا تھا۔

''تمہارا اتنی دور جانا ہمیں بالکل پسند نہیں۔ تم ہمارے اکلوتے فرزند ہو۔ ہماری آنکھوں کا نور اور دل کا سرور ہو۔ تمہارے بیرون ملک جانے سے ہم بڑے سوگوار ہیں۔ اب جا ہی رہے ہو تو وہاں زیادہ مدت نہیں رہنا۔ ابو اور امی کو نہیں بھولنا۔ ہمیں یاد کرتے رہنا۔ اور ہاں! کسی غیر ملکی لڑکی سے شادی مت کر لینا۔'' امی نے جب یہ بات کہی تو ان کی آنکھوں میں گہری التجا تھی۔

کچھ دیر پہلے الزبتھ نے اس کے گلے کے گرد اپنے باز وحمائل کر کے کہا تھا۔

"I love you Adil."

عادل پہلے ہی الزبتھ کی زلفوں کا اسیر ہو چکا تھا۔ ان الفاظ نے اس کے دل میں آگ لگا دی۔ تاہم ابو اور امی کے الفاظ آڑے آئے۔

جب بھی جلوت اور خلوت میں الزبتھ اس کے ذہن پر چھا جاتی تو ابو اور امی کے ملتجیانہ چہرے اس کی آنکھوں کے سامنے آ جاتے۔ ایم بی اے کرنے کے بعد وہ اپنے دوست ثاقب کی وساطت سے ٹورنٹو آیا تھا اور اسے ایک کمپنی میں ملازمت مل گئی تھی۔ اسی کمپنی میں الزبتھ بھی کام کرتی تھی۔

روانگی کے وقت اس نے ابو اور امی سے کہا تھا کہ وہ اب تک ملک سے باہر کہیں نہیں گیا ہے۔ ایک نیا ملک دیکھنے کا اس کو بڑا شوق ہے۔ یہ سنہرا موقع ہے کہ اس کو کینیڈا جیسا ایک خوبصورت اور ترقی یافتہ ملک دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ ٹورنٹو میں ایک سال سے زیادہ نہیں رہے گا۔ وہ ایک سال بھی نہیں رہا اور دس ماہ بعد الزبتھ کو مایوس چھوڑ کر وطن لوٹ آیا۔

کچھ عرصہ بعد اس کو اپنے شہر میں ایک پرائیوٹ کمپنی میں کام ملا۔ ابو اور امی کی خواہش تھی کہ جیتے جی اس کی شادی رچا دیں۔ ابو اپنی بھانجی سے اس کی شادی کرانا چاہتے تھے۔ امی کو بھی یہ لڑکی پسند تھی لیکن

عادل کسی اور لڑکی کو اپنا دل دے بیٹھا تھا۔ ابو نے کہا۔

''ہم تمہاری پسند کی لڑکی کے تعلق سے کچھ نہیں جانتے۔ اس کے خاندان کا ہمیں کوئی علم نہیں ہے جبکہ نعیمہ کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ صورت اور سیرت سے نعیمہ بہت اچھی لڑکی ہے۔''

''سلمیٰ بھی اچھی لڑکی ہے ابو۔'' ابو اور امی نے عادل کی مرضی کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔ ابو بولے۔

''تمہاری پسند ہماری پسند ہے۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا..... تم ہمیں چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤ گے۔'' یہاں عادل نے پہلی دفعہ یہ انکشاف کیا کہ وہ کینیڈا میں ایک مغربی لڑکی الزبتھ کو بہت چاہتا تھا اور لڑکی کو بھی اس سے بڑا پیار تھا۔ لیکن والدین کی محبت اس کے لیے زیادہ اہم تھی اور وہ بھاری دل سے حسب وعدہ ایک سال کے اندر وطن واپس لوٹ آیا ہے۔ اس نے کہا کہ وہ اب انہیں کبھی نہیں چھوڑے گا۔

سلمیٰ سے عادل کی شادی ہوئی۔ چند ماہ اچھی طرح گزرے۔ ابو اور امی کو بھی کوئی شکایت نہیں تھی۔ لیکن آہستہ آہستہ سلمیٰ کے رویے میں تبدیلی آنے لگی۔ گھر کا ماحول اسے راس نہ آتا تھا۔ وہ بار بار میکے جانے لگی۔ کبھی کسی سہیلی کے ساتھ کسی بہانے سے گھر سے نکلتی اور دیر سے لوٹتی۔ پھر وہ عادل سے چھوٹی چھوٹی باتوں کی شکایت کرنے لگی۔ ایک دن عادل بولا۔

''ابو! میں ایک فلیٹ خرید رہا ہوں۔ دو بیڈ روم والا۔''

''کس لیے؟'' ابو نے پوچھا۔

''رہائش کے لیے۔''

''اپنے گھر میں کیا کمی ہے عادل؟ رہائش کے لئے یہ مکان کافی ہے۔''

''ابو! ہمارا یہ محلّہ بہت گنجان ہو گیا ہے۔''

''یہ ہمارا آبائی مکان ہے۔ ہم برسوں سے یہاں رہ رہے ہیں۔ ہمیں اس سے گہرا انس ہے۔ بہت ساری ناقابل فراموش یادیں اس سے وابستہ ہیں۔ ہمسائے اچھے ہیں۔ ان سے ہمارا کبھی جھگڑا نہیں ہوا۔ دو بیڈ روم والے فلیٹ میں ایک خاندان کا گزارہ کیسے ہوگا؟ مہمان آتے ہیں۔ زندگی میں دکھ سکھ آتے ہیں۔ جگہ بڑی ہونی چاہئے۔''

''فلیٹ کا اپنا چارم ہے۔'' ابو اور امی کو لگا کہ یہ عادل نہیں کہہ رہا ہے بلکہ سلمیٰ کہہ رہی ہے۔ امی کو ایک ہمسائی نے بتایا تھا کہ بہو ساس سسر سے الگ رہنا چاہتی ہے۔ ہمسائی نے سلمیٰ کی ایک سہیلی سے یہ بات سنی تھی۔ تب امی کو ہمسائی کی بات پر یقین نہیں آیا تھا۔ لیکن اب عادل بتا رہا تھا۔

''یہ فلیٹ شہر کے مضافات میں ایک کھلی جگہ پر واقع ہے۔ یہاں سے صرف چند کیلومیٹر دور

ہے۔گردونواح کا منظر بڑا دلکش ہے۔دور دور تک ہرے بھرے کھیت ہیں۔'' پھر اس نے کہا۔

''آپ دونوں بھی ہمارے ساتھ رہیں گے۔''

''ہم اپنا یہ مکان چھوڑ کر کہیں نہیں جائیں گے۔'' امی بولیں۔

''عادل بیٹا! دراصل بہو ہم سے الگ رہنا چاہتی ہے۔''

''نہیں امی! یہ بات صحیح نہیں ہے۔''

''یہی بات صحیح ہے عادل۔تمہاری امی نے یہ بات کسی سے سنی ہے۔پہلے ہمیں اس پر یقین نہیں آیا تھا۔خیر! یہ بتاؤ کہ فلیٹ کی قیمت کیا ہے۔؟'' عادل نے فلیٹ کی قیمت کا انکشاف نہیں کیا۔البتہ یہ کہا کہ اکاؤنٹ میں جمع شدہ رقم اور سلمٰی کے باپ کی جزوی مدد سے فلیٹ کی قیمت چکائی جاسکتی ہے۔

''کس منزل پر ہے؟'' ابو نے پوچھا۔

''چوتھی منزل پر۔''

''عادل! اس عمر میں چوتھی منزل پر آنا جانا کیا میرے اور تمہاری امی کے لئے مشکل نہیں ہے؟ تم جانتے ہو کہ تمہاری امی کو دل کا عارضہ ہے۔سیڑھیاں چڑھنے سے سانس پھولتی ہے۔اور دل کی دھڑکن تیز ہوجاتی ہے۔'' عادل نے ان کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور باہر چلا گیا۔

''عادل کتنا سیدھا سادا ہے۔بہو کی باتوں میں فوراً آجاتا ہے۔'' امی بولیں۔

''سلمٰی نے اس کو شیشے میں اُتار لیا ہے۔'' ابو بولے۔

ماں باپ نے عادل کی مرضی کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔عادل نے فلیٹ خرید لیا اور دونوں میاں بیوی اس میں منتقل ہوگئے۔اس کے کچھ عرصہ بعد سلمٰی ایک پرائیوٹ اسکول میں بطور استانی کام کرنے لگی۔عادل ایک روز گھر آیا اور کہنے لگا۔

''میں کمپنی کے کام پر ایک ماہ کے لیے ممبئی جارہا ہوں۔سلمٰی اکیلی ہے۔امی ایک ماہ کے لیے سلمٰی کے ساتھ رہیں۔''

''تمہارے ابو اکیلے رہ جائیں گے۔میں نہیں جاسکتی۔''

''سلمٰی کو ایک ماہ کے لیے یہاں لے آؤ۔'' ابو بولے۔

''وہ یہاں نہیں آئے گی۔میں نے اس سے کہا تھا۔''

''تمہارے ابو کو چھوڑ کر میں کیسے جاسکتی ہوں۔'' امی بولیں۔

''تمہاری امی کی صحت بھی اچھی نہیں ہے۔'' ابو بولے۔

''امی! سلمٰی حاملہ ہے۔آپ کو کہیں باہر نہیں جانا ہے۔سلمٰی سکول سے لوٹتے ہوئے ضرورت کی چیزیں لے آیا کرے گی۔صبح ایک عورت صفائی کرنے اور برتن مانجنے آتی ہے۔امی! آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن یہاں تمہارے ابو کا کھانا کون بنائے گا۔'' عادل بے بسی سے دونوں کو دیکھنے لگا۔اس کا افسردہ چہرہ دیکھ کر ابو اور امی کا دل پسیج گیا۔اور امی جانے کے لیے تیار ہوگئیں۔

عادل کی روانگی کے دوسرے روز سلمٰی بولی۔

''امی! عادل نے آپ کو خواہ مخواہ تکلیف دی۔میں اکیلی رہ سکتی ہوں۔''

''عادل نے بہت اصرار کیا بہو۔تمہارا تنہا رہنا اس کو اچھا نہیں لگتا۔''

''فلیٹ بالکل محفوظ ہے اس لیے مجھے کوئی گھبراہٹ نہیں ہوتی ہے۔''

سلمٰی ناشتہ کرنے کے بعد سکول جاتی تھی۔کئی دفعہ گھر میں لنچ کے لیے کھانے پینے کی چیزیں نہیں ہوتی تھیں۔جب امی نے سلمٰی سے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے برا مانا۔اس کا موڈ بھی خراب ہی رہا کرتا تھا۔ایک ہفتہ بعد عادل کی امی گھر لوٹ آئیں۔دوسرے روز ممبئی سے عادل کا فون آیا۔

''ابو! امی سلمٰی کو اکیلی چھوڑ کر کیوں چلی گئیں؟''

''بیٹا! سلمٰی نے کہا تھا کہ وہ اکیلی رہ سکتی ہے۔''

''نہیں ابو! یہ غلط ہے۔امی کا جانا سلمٰی کو اچھا نہیں لگا ہے۔''

''سلمٰی کو بات بات پر غصہ آتا تھا اور اس نے ایسی صورت حال پیدا کردی تھی کہ تمہاری امی کا وہاں رہ پانا مشکل ہوگیا۔اور وہ مجبوراً گھر لوٹ آئیں۔لو، اپنی امی سے بات کرو۔'' امی نے فون لیا اور بولیں۔

''فون پر کیا بتاؤں عادل! جب گھر لوٹو گے تب بتاؤں گی۔'' عادل نے فون رکھ دیا۔امی کہنے لگیں۔

''عادل کتنا بھولا بھالا ہے، سلمٰی کے مزاج کو ابھی تک سمجھ نہیں پایا ہے۔''

عادل کی امی اکثر بیمار رہا کرتی تھیں۔عادل کا الگ رہنا ان کو بہت بھاری لگ رہا تھا۔وہ مغموم رہا کرتیں۔ایک روز ان کے سینے میں درد ہوا۔انہیں ہسپتال میں داخل کرادیا گیا۔انہوں نے عادل کو بلانے کے لیے کہا لیکن اس کا فون بند تھا۔سلمٰی کو فون کیا گیا اور عادل کو جلد اطلاع کرنے کی تاکید کی گئی۔امی کو دل کا ہلکا سا ورہ پڑا اور وہ بے ہوش ہوگئیں۔کوئی ایک گھنٹہ بعد دوبارہ سخت دورہ پڑا اور دل کی حرکت بند ہوجانے کی وجہ سے ان کا انتقال ہوگیا۔

عادل نماز جنازہ پر قبرستان پہنچا۔

اب ابو اکیلے گھر پر تھے۔ابو نے کھانا پکانے اور گھریلو کام کاج کرنے کے لیے ایک آدمی رکھ

لیا۔کبھی کبھی عادل گھر پر آتا تھا اور کچھ وقت ابو کے ساتھ گزار کر چلا جاتا تھا لیکن ابو کبھی عادل کے فلیٹ پر نہیں گئے۔

ایک روز ابو بیمار پڑ گئے۔ہمسائے کا لڑکا طارق ایک ڈاکٹر کو بلا لایا۔ڈاکٹر نے نام پوچھا، جانچ کی اور نسخہ لکھنے لگا۔درمیان میں وہ بولا۔

''جسمانی طور پر آپ بالکل ٹھیک ہیں،البتہ ذہنی تناؤ کا شکار لگتے لگتے ہیں۔تنہائی سے تناؤ پیدا ہوتا ہے اور ذہن میں برے برے خیالات آتے ہیں۔آپ مصروف رہا کریں۔ذہنی تناؤ کو پاس پھٹکنے نہ دیں۔''

''بہتر ڈاکٹر۔''ابو بولے۔

''مسٹر سلیمان! کیا آپ اکیلے ہیں، بیوی..... بچے؟''

''بیوی چند ماہ پہلے چل بسی ڈاکٹر صاحب۔ایک بیٹا ہے۔وہ کینیڈا گیا تھا جہاں پہلے وہ ایک گوری لڑکی پر فریفتہ ہوا تھا اور پھر.....''

''سلیمان صاحب!''ڈاکٹر نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔

''اس شہر میں میں ایسے کئی آدمیوں کو جانتا ہوں جن کی اولادیں کینیڈا، امریکہ اور یوروپ میں ہیں۔ جہاں وہ حصول تعلیم اور تلاش معاش میں گئے تھے۔وہاں کسی سفید فام لڑکی سے شادی کی اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے وہیں کے ہو کر رہ گئے۔اور ان کے ماں باپ یہاں کس مپرسی کی حالت میں فوت ہو گئے۔آپ اکیلے نہیں ہیں سلیمان صاحب.....!''

''ڈاکٹر صاحب! میرا اکلوتا بیٹا کینیڈا میں نہیں ہے۔وہ یہاں سے صرف چند کیلومیٹر دور رہتا ہے اور اس کی بیوی کوئی سفید فام عورت نہیں ہے بلکہ ایک ہندوستانی لڑکی ہے۔

◀◀ ● ▶▶

"Yasmin"
Fort Road
Leh Ladakh-194101
+91 9419840050

نام کتاب: افکار شوریدہ — صنف: شاعری
مصنف: رضی الدین حیدر خاں حیدر — سن اشاعت: ۲۰۰۴
صفحات: ۱۶۰ — قیمت: ۱۰۰/روپے
رابطہ: رضیہ حیدر خاں، معرفت خرم خاں، لین نمبر۔۸، بی۔۱۲۹، سکنڈ فلور، شاہین باغ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔۱۱۰۰۲۵

● طلعت زہرہ

سیڑھیاں

آنگن میں سائیکل چلاتی تو اس کے سنہری بال ہوا میں لہراتے، سرخ ہوتے عارض پہ اتراتے تبسم کا پھیلاؤ، اس کی خوشبو چہار سو پھیلا دیتا۔ایسے میں بلڈنگ کا دراز قد منیجر، چوڑا چکلا ہڈ کاٹ، جھریوں سے بھرپور چہرے پہ خشخشی بال بھنویں اڑی اڑی، سفیدے کا زیرہ تمام بالوں مین نمایاں، اِس کو غور سے دیکھتا رہتا۔تیرہ سالہ پلویشا کا یہ ''اِترانا'' منیجر کو اتنا بھایا کہ تہذیب کی ساری سیڑھیاں نیچے اترتا ہوا، نازک پھول کو بلڈنگ کی بیسمنٹ میں لا کر مسل ڈالا۔

ایک ٹین ایجر کی دہائی بیسمنٹ کی دیواروں میں کان نہ بنا سکی۔کمرے کی بندشوں نے اس کی سسکیوں کو سینہ بند کر لیا۔ ریمنڈ روز ہی اترتا چڑھتا، پر جیسے پتھروں کی سیڑھیاں اس ظالم کے بوٹوں کی دھمک سے پتھرا ہی گئیں۔ادھر روتی سسکتی آہیں بھرتی پلویشا دروازے کی آواز سنتے ہی کوئی جائے پناہ ڈھونڈھنے کو بھاگتی۔اس ایک کمرے کے کس کونے میں جا کر سر چھپائے، کہاں ماں کا سایہ ڈھونڈھے۔ گھبرائی سہمی سی وہ دیوار کی جانب منہ ہاتھوں میں چھپائے سمجھتی کہ کبوتر کے آنکھیں بند کرنے سے بلی بھاگ جائے گی۔بڑا سا ہاتھ اس کا کندھا تھامتا، فریاد کرتی، آہیں بھرتی پلویشا کو گھسیٹتا تو پلویشا کا تڑپتا سسکتا کملایا سا وجود انہی دیواروں میں سر ٹکرانے لگتا۔

وہ تمام دن مجسمِ تصویر بنی ٹُکر ٹُکر دیواروں کو دیکھتی اب تو اس کی آنکھوں کی روشنی بھی جیسے زائل ہونے لگی تھی۔اسے جس اجالے کی تلاش تھی اس کے لئے وہ بارہا اندھیروں کے دروازوں سے سر ٹکرا چکی تھی۔اس کو تو صحیح سے یاد بھی نہ تھا کہ اس کے نقوش کیا ہیں۔کنگھی پٹی کرنے کے بجائے اپنے زخموں پر پٹیاں باندھتی۔معصوم پلویشا کرلائی سہمی سمٹی آنکھوں میں ویرانی لئے داغ رسیدہ جسم اور گھائل روح کو حسرت و یاس سے دیکھتی۔ایسے میں اسے اپنی وہ ٹیچر یاد آ جاتیں جن کی باتوں میں حلم اور نرماہٹ کی بو باس ہوتی تھی۔کبھی سکول میں معمولی زخم آنے پر فوری فرسٹ ایڈ کا انتظام کرتیں تھیں۔آج وہ کیوں ان کی پناہ میں نہیں ہے۔کیا

وہ بھی مجھے ڈھونڈ رہی ہوں گی۔ میری ساری سہیلیاں تو میرے سکول نہ آنے پر سخت برہم ہوں گی، لیکن شاید انہیں معلوم ہی نہ ہو۔ میں یہاں سے نکلتے ہی اپنی ٹیچر سے کہہ کر اس ''جن'' کو بوتل میں بند کروا دوں گی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ ایک دن سچ مچ ایک جن مجھے اپنی قید میں رکھ لے گا۔

یہی سوچتے سوچتے اس کی آنکھ لگ جاتی۔ خواب میں وہی دلدوز مناظر نظر آنے لگتے۔ کبھی ڈراؤنا چہرہ دکھائی دیتا تو کبھی ماں کی متجسس نگاہیں، وہ ہڑبڑا کر اٹھ جاتی جب اسے اپنے ہی سامنے اپنا آپ دکھائی دیتا۔

گھنٹوں اس پر فسوں طاری رہتا۔ یہ کیسا خواب ہے یہ کیسی حقیقت۔ معصوم ذہن اتنا الجھ جاتا کہ اس کے دماغ میں بہت سے شیر آپس میں لڑتے بھڑتے دکھائی دیتے۔ وہ ان سب کا مقابلہ نہ کر سکتی اور دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر لہولہان ہو جاتی تو وہی جن اس کے لہو کو چاٹ چاٹ کر صاف کر دیتا۔ کراہیت سے وہ اسے پرے دھکیلتی تو ناتواں ہاتھ اپنے ہی وجود کو مزید گندا کر دیتے۔ ریمنڈ سے ایسی بدبو آتی کہ اس مرے ہوئے چوہے کی بدبو اس کے دماغ میں پھیل جاتی جو ایک بار ماں نے کچن سے نکالا تھا۔ اس کی سڑاند کو اپنے کومل ریشمی ننگے بدن پہ محسوس کرتی تو ابکائیاں آنے لگتیں۔ بھاری بھرکم وجود بالوں سے بھرا ریچھ نما جانور، شکل ایسی منحوس کہ پلویشا کی سنہری پلکیں اسے نہ دیکھنے کی خاطر اپنی نگاہوں پہ پردہ کئے رکھتیں اور پھر کئی کئی دن یہ نگاہیں اس کے دل و دماغ کو سن کیے رہتیں۔

اسے کبھی خود پہ ترس آتا تو کبھی غصہ، کبھی دلگرفتہ ہوتی تو کبھی مایوسی کے عالم میں سارا دن گزار دیتی۔ ایسے میں ایک ماں ہی تھی جو اسے یاد آتی لیکن اس سے بھی اس کو رنجش پیدا ہونے لگی۔ کبھی کبھی وہ ماں کو موردِ الزام ٹھہراتی پھر خود ہی خیالوں میں اس کی گود میں سو جاتی۔

سخت زمین پر ایک بوسیدہ گدیلا جس کی ہر ہر تہہ میں پلویشا کے نامراد بچپن کی معصوم آرزوؤں کے کرم کلبلا رہے تھے۔ کہیں سفید تو کہیں سرخ دھبوں میں وہ اپنی ذات کا سراغ نہ ڈھونڈ پاتی۔ کھلے آسمان کی مردہ ہوتی یادوں کو زندہ کرنے کی کوشش میں چھت کو تکتی تو لوہے کی بلیوں میں زنجیروں کے آنکڑے دیکھ کر رہی سہی ہمت اس سے نظریں چرا لیتی۔ کبھی اکیلے میں دیواروں پہ نگاہ پڑ جاتی تو بیشمار آنکھیں اس پر جمی ہوتیں بالکل ایسے جیسے اس نے بچپن میں کہانی پڑھی تھی۔ خوف سے گھگھی بندھ جاتی تو گھٹنوں میں سر دے کر گھنٹوں ہی روتی رہتی۔ چیخ و پکار تو لاحاصل تھی کہ اب یہ فریاد کرنے کی سکت ہی کہاں رہ گئی تھی۔

سیڑھیاں اترنے اور دروازہ کھلنے کی آواز سنتے ہی وہ آج پھر کسی گوشے کی تلاش میں بھٹک رہی تھی۔

''باسٹرڈ، کدھر مر گئی۔ یہ تیرے باپ کا گھر نہیں ہے۔'' یہ کہتے ہوئے ریمنڈ نے ایک طنز آمیز

قہقہہ لگایا۔ وہ اور بھی سہم گئی، گورے گورے گال غم و غصہ سے سرخ ہو رہے تھے۔ شربتی آنکھوں میں رو رو کر ڈورے واضح نظر آنے لگے تھے۔ ریشمی بال الجھ کر چہرے پر بکھر رہے تھے۔ پلویشا نے بھاگ کر ایک کونے میں چھپنا چاہا لیکن ایک ہی تھپڑ نے اس کے حواس گم کر دیئے۔ ریمنڈ اسے گھسیٹتا ہوا گدیلے تک لایا، اور اپنی بھیانک آواز میں گرجا۔

''اب تو یہاں کی عادت ڈال لے، باہر کی دنیا والوں کے لئے تو اب مر چکی ہے''۔

پلویشا تو جیسے کسی انجانے جنگل کی سیر کر رہی تھی۔ اسے وہ کہانی یاد آ رہی تھی جس میں ایک بھیانک وحشی، جنگل میں ایک سنہری بالوں والی گڑیا کو لکڑی کے گھر میں قید کر لیتا ہے۔ وہ گڑیا تمام جتن کرتی ہے اور آخر کار اس کو ایک شہزادہ اس کی قید سے چھڑا لیتا ہے۔ لیکن میرا شہزادہ کون ہوگا؟ میں نے تو ابھی کوئی بوائے فرینڈ بھی نہیں بنایا تھا۔ یہ خیال آتے ہی اس کی امیدوں پہ پانی پھر گیا اور وہ ایک جھٹکے سے واپس اسی عقوبت خانے میں آئی جہاں ایسے ہی جھٹکوں نے اس کی زندگی اجیرن کی ہوئی تھی۔

اس کو یہاں آئے کتنے دن ہو گئے اس کا حساب تھا نہ شب و روز کا معلوم۔ یہ ایسا زندان تھا کہ جس کی کسی بھی دیوار میں ایک روزن تو کیا موا ایک شگاف تک نہ تھا۔ وہ اس اندھیرے کی باسی، یاسیت کا لبادہ اوڑھے، اسی گھٹن میں بڑھتی گھٹتی رہی۔ وہ ایک پتلون جو اس کی اپنی ہی وراثت سے اترتی چڑھتی رہی آج اسے تنگ تنگ محسوس ہو رہی تھی۔ پہلے تو وہ اپنی قے کرتی طبیعت کو تعفن و گند کا صلہ سمجھتی رہی لیکن آج اسے لگا کہ اس کے پیٹ پر یہ پتلون بھی نہیں سما رہی۔ جوں جوں دن گذرتے گئے اسے محسوس ہوا کہ وہ ایک گڑیا ہے جس پر اس جن کی چبھوئی ہوئی بیشمار سوئیوں سے وہ بھی جن بن جائے گی۔

پلویشا کی آنکھ شور کی وجہ سے کھل گئی۔ ریمنڈ دیوار سے پائپ جوڑ رہا تھا۔ اس کے پاس ہی ایک کموڈ اور منہ دھونے کے لئے بیسن پڑا تھا۔ ریمنڈ نے ان تمام چیزوں کو ایک کونے میں فکس کیا اور چھوٹا سا غسل خانہ بنا لیا۔ آج کے لئے اتنا ہی کافی تھا۔ وہ اپنے ساتھ کھانے کا ٹفن بھی لایا تھا۔ اس نے پلویشا کے بالوں میں پیار سے ہاتھ پھیرا تو پلویشا نے حقارت سے منہ دوسری طرف پھیر لیا اور سکڑ کر بیٹھ گئی۔ ریمنڈ نے انہی بالوں کو زور سے کھینچتے ہوئے اپنے غصے کا اظہار کیا۔

''میں کھانا لے کر آیا ہوں، پانی کا انتظام بھی کر دیا ہے منہ دھو کر کھانا کھا لینا'' یہ کہتے ہوئے وہ وہاں سے باہر نکل گیا اور پلویشا پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔

رفتہ رفتہ تہہ خانہ ایک گھر میں تبدیل ہونے لگا۔ کسی دن ریمنڈ اس میں گیس کی پائپ لائن میں اُون لگا دیتا تو کسی دن لکڑی کی الماری میں برتن سجا جاتا۔ پلویشا باوجود کوشش کے اس قید گاہ میں ایک سراغ

بھی ایسا نہ ڈھونڈ ھ پائی جہاں سے اس کی آواز کائنات کا کوئی ذرہ بھی اپنے اندر سمو لیتا۔ معصوم پلویشا کی ذہنی بالیدگی بانس کے پودے کی مانند بڑھتی گئی۔ روز مرتی اور پھر روز ہی مرتی پلویشا شب و روز کے اندھیروں اجالوں سے بے خبر ریمنڈ کے شجر کا بیج اٹھائے تیس سکوئر یارڈ میں دنیا سجائے بیٹھی تھی۔ یہ کیسی مامتا ہے جو ناگ کی طرح ڈستی رہتی ہے۔ ایک ہی سال میں اس کی کچلی ہوئی روح، گوشت کا لوتھڑا اوڑھے اس کے برابر لیٹی تھی۔ پلویشا نے منہ دوسری طرف کر لیا۔ تکئے میں جذب ہوتے آنسو اس کے جذبات کو ٹھنڈا کرنے کے بجائے، حدت کو بڑھاوا دے رہے تھے۔ اس کا جی چاہا کہ ابھی وہ نظر دوسری جانب کرے اور یہ اس کا وہی پرانا کمرہ ہو، جہاں باپ کے ہاتھوں مار کھا کر وہ آنسو بہاتی رہی ہے۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو ایک ان چاہا وجود آنکھیں جھپکائے بنا اسے دیکھ رہا تھا۔ ہو بہو اس کی طرح سنہری بال، کانچ سی بلوری آنکھیں اور نرم و نازک چھوٹے چھوٹے ہاتھ۔ وہ رفتہ رفتہ بچی کا جائزہ لے رہی تھی۔ اچانک اس بچی کے بڑے بڑے ناخن اُگ آئے اور آنکھوں میں جنوں کی سی وحشت لیے وہ اِس پر جھپٹی اور اِس کی کھال نوچ نوچ کر پھینکنے لگی۔ پلویشا نے خود کو چھڑانے کے لئے ہاتھ پاؤں چلائے تو اس کی آنکھ کھل گئی۔ اُف میں اپنی ہی بچی کو دیکھتے دیکھتے سو گئی تھی شاید۔

شام کو ریمنڈ آیا، اس نے بچی کو اٹھایا، اپنی اِس غلاظت پر پانی ڈال کر، اسے نہلایا اور کپڑے پہنائے۔ ساتھ ہی ساتھ اپنی غلاظت بھری گفتگو جاری رکھی، اس کے خیال سے ماں کو اپنا بچہ خود نہلانا چاہئے تھا جب کہ پلویشا تو اس کو ہاتھ لگانے کو بھی راضی نہ تھی۔

کئی دن ایسے ہی گذر گئے، شام کو ریمنڈ آتا تو بھوکی پیاسی بچی کے لئے دودھ لے کر آتا، پلویشا کو صلواتیں سناتا اور کہیں سے بچا کچھا لایا ہوا کھانا اس کے آگے ڈال جاتا۔

پلویشا غموں سے نڈھال تو تھی ہی، اس نئی آفت کو مار دینا چاہتی تھی۔ کسی کے سوچے سے کون مرا ہے۔ ماہ و سال گذرتے گئے۔

علیزہ اسی قید خانے میں اس کی دن رات کی ساتھی بن گئی۔ ریمنڈ اپنے ایک گناہ کو بیسمنٹ میں چھپاتے چھپاتے اب دو گھروں کا کفیل بن گیا تھا۔ دن بھر دفتر میں، جو کہ اسی بلڈنگ میں تھا، شام کو تہہ خانہ میں پلویشا اور علیزہ کے ساتھ اور رات کو بلڈنگ کے ہی ایک فلیٹ میں اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ رہنے لگا۔ مرتی کیا نا کرتی پلویشا کو علیزہ کی دیکھ ریکھ کرنی پڑی۔ اس نے بیسمنٹ میں ہی ایک جانب پردے ڈال کر علیزہ کا کمرہ بنا دیا۔ جیسے ہی ریمنڈ آتا وہ علیزہ کو اس کے کمرے میں بھیج دیتی۔ اس کے جانے کے بعد ماں بیٹی خوب گلے لگ کر روتیں۔

کچھ ہی برسوں میں اس ایک کمرے میں ایک سے دو اور پھر چار افراد کا کنبہ کلسنے لگا۔ پلویشا کی دنیا اب یہی تھی، اس کو یقین تھا کہ وہ اور اس کے بچے اب یہیں مر جائیں گے۔ اس نے باہر نکلنے کی امید کا چراغ پھونک دیا تھا۔

آج اس نے توے پر روٹی ڈالی ہی تھی کہ بڑی بیٹی علیزہ اس کے پاس آئی اور اپنا سرخ ہوتا جامہ دکھایا تو ماں کا دل وسوسوں سے بھر گیا۔ اس سے پہلے کہ تاریخ خود کو دہرائے اور پھر وہی باپ اپنی ہی تیرہ سالہ سگی بالغہ بیٹی/نواسی کو.....

اس خیال نے پلویشا کی چودہ سالہ ہمت کو یکجا کیا اور اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ وہ اپنے بچوں کو یہاں سے باہر نکالے گی۔

دوسرے ہی دن تمام اخباروں کی شہ سرخیوں میں خبر گرم تھی کہ ''قدیم ہولی رومن ایمپائر'' سے تعلق رکھنے والے اس شہر کی ایک بلڈنگ کے تہہ خانے میں چودہ سال سے بند اپنے ہی باپ کے ہاتھوں پائمال ہونے والی بیٹی نے چھوٹے بچے کی کلائیاں کاٹ کر اس کے کوٹ میں ایک پرچہ سی دیا۔ ہسپتال میں داخل ہونے پر یہی خط اس خاندان کی رہائی کی وجہ بنا۔

پولیس ریمنڈ کو ہتھکڑیاں ڈالے تہہ خانے کا دروازہ کھول اندر آئی اور پلویشا اپنے بچوں سمیت سینے میں لگائے ضبط کے پیڑ کی شاخوں کا سہارا لے کر بیسمنٹ کی سیڑھیاں چڑھ گئی۔

◀◀ ● ▶▶

1259-Shadeland Drive
Mississauga
Ontario L5C IP7 Canada

پیغام آفاقی کی کتابیں

نام کتاب: مکان		نام کتاب: درندہ
صنف: ناول		صنف: شاعری
سن اشاعت: ۲۰۰۴ء		سن اشاعت: ۲۰۰۱
صفحات: ۴۳۲		صفحات ۱۶۰
قیمت: ۲۰۰/روپے		قیمت: ۱۰۰/روپے
پتہ: فلیٹ نمبر۔ا، پولس اسٹیشن، راجوری گارڈین، نئی دہلی۔۱۱۰۰۲۷		

● شاهد جمیل احمد

ایک تھی بھوری کتیا

خوابوں کے بننے، ٹوٹنے، بکھرنے اور ظاہر ہونے کے عوامل بہت پیچیدہ اور کمپلیکس ہوتے ہیں، سگمنڈ فرائڈ کی دی ڈریمز سے بھی زیادہ پر پیچ اور مشکل ترین۔ کیا خبر کب اور کتنے برسوں بعد لاشعور کی تھپکی پر سینگ ٹیک کر سویا ہوا کجلا مینڈھا بیدار ہو اور اسے گلی گاؤں گھماتا بالآخر بند گلی کے پشتے سے چمٹی اس کی پسلیوں کو توڑتا گہری اندھیری کھائی میں گرتا چلا جائے اور ہڑبڑا کر اس کی آنکھ کھلے تو کپکپاتا جسم پسینے سے شرابور اور دل بلیوں اچھل رہا ہو۔ کچھ لوگوں کو بہت سرعت سے خواب آتے ہیں اور کچھ لوگوں کو بہت کم۔ جن لوگوں کو خواب نہیں آتے یا بہت کم خواب آتے ہیں وہ خواب آور دوائیوں کا فقط نام سن کر انہیں استعمال نہ کر بیٹھیں کہ ان سے فقط نیند آتی ہے خواب نہیں۔ خواب آئے تو صرف اپنی مرضی سے آتا ہے اور بعض اوقات تو آتا ہی چلا جاتا ہے۔ اسے بھی تین دن سے ایک ہی خواب آ رہا تھا۔ ایک بینر جس پر اس کی کتاب کا نام درج تھا۔ ایک کتاب جس پر بینر والا نام درج تھا۔ کتاب کے سرورق کے رنگ ابھی گیلے تھے۔ انہی رنگوں میں سرورق کے بالائی بائیں کونے میں آسمانی رنگ کے، برش سے ٹپکائے گئے تازہ چھینٹے۔ کتاب کے نام سے منسوب کتاب کے اندرونی صفحات پر بکھری ایک کہانی کہ جس کا حرف حرف اسے زبانی ازبر ہے- پھر خواب ٹوٹ جاتا ہے اور نیند سے جاگنے پر نہ کتاب کا نام یاد رہتا ہے، نہ ٹائیٹل اور نہ کہانی، کتنا رنجیدہ خاطر تھا وہ جیسے اس کے ہاتھ سے کوئی قیمتی متاع چھن گئی ہو۔ سارا لہو دماغ کی شریانوں میں مجتمع کرنے اور گھنٹوں سوچ بچار کے بعد اس کے ذہن میں کتاب کے نام کا پہلا حرف یعنی ''ڈھونڈ.....'' نمودار ہوا اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

اس کا نام پھاتو تھا اور ٹھیک سے یہ اندازہ لگانا بھی مشکل تھا کہ اس کا اصل نام کیا ہوگا۔ اس کا اصل نام کچھ بھی ہو مگر اس کی چنداں ضرورت نہ تھی نہ اس کا شناختی کارڈ بننا تھا اور نہ اس نے ووٹ کاسٹ کرنا تھا۔ اسے اس کے نام کے بارے میں کسی نے بتایا ہی نہیں تھا۔ بتاتا بھی کون؟ اس کا باپ تو زمینداروں کی سیپ

میں اس قدر رندھا ہوا تھا کہ کبھی کبھار ہی وہ اس کی شکل دیکھ پاتی تھی۔ ماں دائمی بیمار تھی، اس نے آس پڑوس کی عورتوں سے سنا کہ اس کے پیٹ میں پھوڑا ہے ورنہ ماں تو یہ بتانے کے قابل بھی نہیں تھی۔ ہر وقت پیٹ کے درد سے بلند آواز میں ہائے کلاپ کرتی رہتی اور جب رو رو کر اور چیخ چلا کر بے ہوش ہو جاتی تو کچھ لمحوں کیلئے گھر کے صحت میں قبل از مرگ کا سناٹا چھا جاتا اور پھر دوبارہ وہی ہائے کلاپ، چیخیں اور بین۔ یہ اس کا بچپن تھا، وہ بچپن جس کے بارے میں فرائڈ کہتا ہے کہ تمام عمر کی نفسیات اس میں پختہ کار ہو جاتی ہے۔ ایک دوپہر ماں نے درد کی شدت سے اپنے پیٹ میں زور کے مکے مارے تو مقعد کے رستے کچ لہو اور راد (پیپ) کی نہر بہہ گئی۔ ماں کو چند ثانیے سکون محسوس ہوا، پھوڑا پھوٹ گیا تھا۔ چند ثانیے میں یہ سکون سکوت میں بدلا، ماں کی آنکھیں پلٹ گئیں اور پھر اسے اس کی بیماری سے ہمیشہ کیلئے مکتی مل گئی۔ پھاتو کا چڑی جیسا دل ماں کی چیخوں اور درد بھری آہوں کے لئے منتظر کا منتظر رہ گیا۔ زمیندار کے پواڑے سے بھینسوں کو چارہ ڈالنے والی میلی چادریں پھوڑی پر بچھائی گئیں۔ زندگی میں پہلی بار اس نے سفید براق کورا لٹھا دیکھا جو ماں کے سرہانے رکھا تھا۔ ایک دو عورتیں بڑے دیگچے میں بیری کے پتے ڈال کر پانی گرم کر رہی تھیں۔ شام سے پہلے لوگ اس کی ماں کو لکڑی کی چارپائی پر ڈال کر لے گئے اور وہ گھر کی کچی دیوار سے توڑی کھروندتی کھڑی رہ گئی۔

ماں کو گھر سے گئے سوا مہینہ بھی نہیں ہوا تھا کہ ڈبی کتیا اپنے نومولود دو کالے پلوں اور ایک بھوری پلی کو لے آوارد ہوئی۔ اس نے صحن کے ایک کونے میں پرالی کے ڈھیر کے پاس مستقل ڈیرہ لگا لیا۔ بھوک لگتی تو کچھ وقت کیلئے کوڑے کے ڈھیروں کو پھرول آتی اور پھر مزے سے آنکھیں موند کر لیٹ جاتی اور بچے اس کی بھٹنیوں سے دودھ چسڑنے لگتے۔ دونوں پلوں کی آنکھیں بھی ابھی پوری طرح نہ کھلی تھیں کہ ساتھ والے گاؤں سے اس کی دیندار برادری کے بھائی بند وانہیں اپنی جھولیوں میں ڈال کر اپنے ساتھ لے گئے۔ شاید بھوری پلی کو بھی کوئی لے جاتا مگر وہ اس لئے بچ گئی کہ وہ مادہ تھی اور کتے پالنے والے مادہ کتیا سے الرجک تھے۔ مبادا وہ سو سو کر ان کے گھروں کو پلوں سے نہ بھر دے۔ اب بھٹنیاں چھ تھیں جبکہ دودھ پینے والی اکیلی بھوری کتیا۔ اس کے تو جیسے وارے نیارے ہو گئے تھے۔ اس پر وار پہ وار آنے لگا اور کچھ ہی مہینوں میں وہ اپنی ماں کے آدھے قد کے برابر ہو گئی۔ اب تو ماں نے اس کا دودھ بھی بند کر دیا تھا اور وہ اپنے آپ روڑی پھرولنے لگی تھی۔ اب اس کے پیدائشی بال لچھوں کی صورت میں اس کے جسم سے جھڑ رہے تھے اور اس کی گہری بھوری چمکیلی رنگت نمودار ہو رہی تھی۔

پھاتو کی دو بڑی بہنیں ہاتھ باندھے کھڑی تھیں اور شہر سے آئی ہوئی صاف ستھرے لباس میں ملبوس گورے رنگ کی شاہانی پیڑھی پر بیٹھی ان سے پھاتو کو اپنے ساتھ گھر کے کام کاج کے لئے شہر لیجانے کی

باتیں کر رہی تھی۔ وہ انہیں پھاتو کے کپڑے جوتی اور ماہانہ اجرت کا لالچ دے رہی تھی۔ لہو تھوکتے بڈھے باپ نے چارپائی پر بیٹھے ماہانہ مشاہرہ کی بات سنی تو اس کی آنکھوں میں روشنی کوند گئی اور اس نے دور ہی سے آواز لگائی! لے جائیں بی بی جی لے جائیں۔ پھاتو کیلئے دوسرا موقع تھا کہ اس کا چڑی جیسا دل ٹھک ٹھک اس کی پسلیوں سے بجتا تھا۔ اِس سے پہلے اُس کے ساتھ ایسا تب ہوا تھا جب اُس کی ماں مری تھی۔ وہ حسرت بھری نگاہوں سے اپنی بہنوں اور باپ کی طرف دیکھتی اور ہچکی کو اپنے گلے ہی سے واپس اپنے پیٹ میں دھکیل دیتی۔ موٹر کار کا ہارن بجا اور وہ چارو ناچار گوری میم کے پیچھے پیچھے چلتی پتہ نہیں کب اور کیسے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ چھ ماہ بعد جب وہ کچھ دِنوں کیلئے گاؤں واپس آئی تو اُس کی رنگت بھی بھوری لگ رہی تھی۔ اُس کے ہاتھوں اور پیروں سے جیسے کالک اتر گئی تھی۔ اُس کا قد بھی بڑا لگ رہا تھا اور اُس نے کپڑے بھی خوبصورت پہنے ہوئے تھے۔ ستر کی دہائی کے مقبُول فلمی گیت جیسے، گائے گی دُنیا گیت میرے اور ماہی وے گھر چھیتی آویں بھی زبانی یاد تھے۔ یہ گیت گانے کے دوران وہ ڈانس کے ایک دو پیر بھی اُٹھا لیتی تھی اور گاؤں کی گلیوں میں کلول کرتی پھرتی تھی۔

بھُوری کُتیا اب اکیلی رہ گئی تھی اور اُس کی ڈبّی ماں پر کسی نے پرانا کارتوس آزما لیا تھا۔ جب وہ صحن کے مخصوص کونے میں آ کر بیٹھتی تو اُس کی یادوں میں اُس کی ماں کی تصویر گھوم جاتی جو پہروں اپنی ٹانگیں بچھائے اُسے دودھ پلاتی رہتی۔ پھر اُس کی آنکھوں کے آگے اُس کی گھنگھروں جیسے بھائی اٹھکیلیاں کرتے نظر آتے۔ وہ ایک دوسرے کی گردنوں میں گردنیں گُھساتے، پنجے مارتے کبھی کبھی اُس کے اُوپر آ گرتے تو وہ ہنس کر ایک طرف ہو جاتی اور پھر سے اُنہیں اٹھکیلیاں کرتے دیکھنے لگتی - بھائیوں سے توجہ ہٹا کر وہ اپنی ماں کے اُوپر لِٹنے لگتی - اسے دیکھ کر اس کے بھائی بھی بھاگ آتے اور ماں سے لپٹ جاتے مبادا بہن ماں کو زیادہ نہ لے لے۔ ماں اپنی زبان سے ان سب کے پچھواڑے صاف کرتی اور وہ اپنی ماں کے پیٹ اور پنجوں کے بیچ دُبک کر سو جاتے۔ اب تو اُس کا کوئی بھی اُس کے پاس نہیں تھا۔ وہ سارا دن گاؤں کے خونخوار کُتوں اور ظالم انسانوں سے اپنا آپ بچاتی مغموم اِدھر اُدھر پھرتی رہتی۔ اپنی ماں اور بھائیوں کا انجام دیکھ کر تو اُسے اپنے سوئے میں بھی بالکل دلچسپی نہ رہی تھی مگر وہ جانور تھی، مجبور جانور اور شاید جانتی تھی کہ ایک روز اپنی قدرتی اور زبردستی کی بُو کے ہاتھوں گاؤں کے کُتوں میں دھر لی جائے گی جیسے اُس کی ماں چارو ناچار دھر لی گئی تھی۔ پھر وہی ہُوا جس کا ڈر تھا، اُس کی بھٹنیوں میں دودھ سرلانے لگا۔ اُسے اِس کیفیت کے بیچ اپنے بھائی یاد آنے لگے لیکن اب وہ اُسے پرالی کے ڈھیر پر نہیں بلکہ اپنے پیٹ میں اٹھکیلیاں کرتے دِکھتے تھے۔ پھر ایک دن اُس نے کسی گھر کے صحت میں پیڑھی پر پڑی کپڑے میں لِپٹی چیز کو دفعتاً سُونگھا تو

چاروں طرف سے شور برپا ہوا کہ بھُوری کُتیا بچے کو کھانے لگی تھی۔ کتنے ہی ڈنڈے، روڑے اُس کی طرف لپکے اور وہ بچتی بچاتی چاؤں چاؤں کرتی گاؤں کے باہر بھاگ گئی۔ شام کو ڈرتے ڈرتے واپس گاؤں آئی تو کسی نے آٹے کا پیڑا اُس کی طرف لڑھکا دیا جس میں کچلا تھا۔ وہ دوپہر سے بھُوکی تھی۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ اُس نے ایک دو بُڑک میں سارا آٹا پیٹ میں دھکیل دیا۔ آٹے کے پیٹ میں جانے کی دیر تھی کہ پہلے اُس کے پیٹ میں اٹھکیلیاں کرتے اُس کے بھائیوں (بچوں) کی حرکت بند ہوئی اور تھوڑی دیر بعد اس کے پیٹ میں اِتنی زور کا مروڑ اُٹھا کہ وہ کھیت سے گھاس کھاتی نظر آئی - کچھ ہی دیر میں اُس کی آنتیں کٹ کٹ کر باہر آنے لگیں۔ اور ایک رُوڑی پر لوٹتے لوٹتے اُس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔

پھاتو اِس بار شہر سے گاؤں آئی تو بھائی نے اُس کا قد بُت دیکھتے ہوئے اُس کے دوبارہ شہر نہ جانے کا حکم صادر کیا۔ کیا کِیا جاتا، بھائی کا حکم کون ٹال سکتا تھا..... وہ بھی اکلوتے بھائی کا۔ پھاتو پھر سے گاؤں کی بے کیف زندگی گذارنے پر مجبور ہو گئی۔ یہاں نہ ٹی وی تھا اور نہ ریڈیو، نہ گانے تھے اور نہ ڈانس مگر وہ کیا کر سکتی تھی۔ اس کی زندگی میں اُس وقت کچھ رنگ بھرا جب اُن کے دور پار کا ایک رشتہ دار اُن کے گھر مہمان بن کر آیا۔ کچھ ہی دُنوں میں اُس نے مہمان سے چوری چُھپے میں آنکھیں چار کرنا شروع کیں۔ وہ سوتے جاگتے اُس کے بارے میں سوچنے لگی۔ پھر دونوں میں میل ملاپ بڑھا اور دونوں نے ایک دِن گھر سے بھاگ جانے کا قصد کیا۔ پھاتو کے بھائی کی آنکھ کُھلی تو پھاتو اپنی چارپائی پر نہ تھی۔ اُس نے دفعتاً مہمان کی چارپائی کو دیکھا تو وہ بھی خالی تھی۔ گھر کے اندر باہر جائزہ لیا مگر وہ کہیں موجود نہ تھے۔ بھائی نے اپنے چچازاد بھائی کو ساتھ لیا اور شہر کی طرف جانے والے رستے پر کلہاڑیوں کے پیچ کستے ہوئے دوڑنے لگے۔ جھٹ پٹے میں کچھ دور انہیں دو سائے تیز تیز چلتے ہوئے دکھائی دیے۔ کچھ ہی ثانیے میں اُنہوں نے سایوں کو جا لیا۔ ایک سایہ تو گاؤں سے آتے لوگوں کو دیکھ کر تن تنہا سرپٹ بھاگ کر اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو گیا مگر پھاتوں کے پاس بھائی کی منت سماجت اور معافی مانگنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ بھائی اور بھائی کے چچازاد بھائی نے کلہاڑیوں کے پے در پے وار کیے اور اب دو چار دِلدوز چیخوں کے بعد ایک اور بھوری مری پڑی تھی۔

◀◀ ● ▶▶

House No:2,Block-F,Phase-2
Garden Town.Gojranwala,Pakistan
0321-6446037

● محمد علم اللہ

انکاؤنٹر

ہم چار مینار پولس اسٹیشن کے قریب اس کے لوٹنے کا انتظار کر رہے تھے۔ برآمدے کے دوسری جانب کا پٹ کھلا ہوا تھا۔ لیکن میری نگاہیں اس کا جائزہ بھی نہ لے پائی تھیں کہ ایک پولس والے نے اس کو بند کر دیا۔ اب کچھ نظر تو نہیں آ رہا تھا لیکن ہم کسی کے چیخنے کی آواز صاف سن سکتے تھے۔

''کچھ پوچھ تاچھ چل رہی ہے کیا؟'' میں نے قریب ہی کھڑے ایک آفیسر سے پوچھا۔ اس نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا، کئی افسران چائے پی رہے تھے اور کچھ اخبار بینی میں مصروف تھے۔

حیدر آباد آئے ہوئے یہ میرا پانچواں مہینہ تھا۔ بہت سارے سینئر صحافیوں سے دوستی ہو گئی تھی۔ دہلی چھوڑنے کا غم اب دھیرے دھیرے محو ہو رہا تھا۔ نئے لوگ نئی زندگی نئی راہیں، سب کچھ بدلا بدلا سا تھا۔ یوں بھی جب کسی چیز سے سمجھوتہ کرنا پڑے تو انسان کو نہ چاہتے ہوئے بھی بہت ساری چیزوں سے نباہ کرنا ہی پڑتا ہے۔

ریڈی میرا بہت عزیز دوست تھا۔ اس سے میری ملاقات حیدر آباد آنے کے بعد ہوئی۔ ہم دونوں ایک ہی محلّہ میں رہتے تھے۔ وہ ایک اچھا صحافی تھا اور بہت اچھا لکھتا تھا۔ شاید اسی وجہ سے اسے پورے صحافی حلقہ میں اس کی بڑی عزت تھی۔ اعلیٰ افسران سے لے کر نچلی سطح کے لوگوں تک، سبھی سے اس کے اچھے تعلقات تھے۔ اس نے ایک انجان شہر میں صحافتی دنیا میں تعلقات بنانے میں اس نے میری کافی مدد کی۔ میں اکثر تو نہیں لیکن کبھی کبھی اس کے ساتھ رپورٹنگ کے لئے چلا ہی جایا کرتا تھا۔ ہمارے میدان جسے صحافت کی اصطلاح میں بیٹ کہتے ہیں، الگ الگ تھے۔ وہ کرائم رپورٹر تھا ہے اور میرے ذمہ اقلیتی امور، ثقافت اور تعلیم کا شعبہ تھا۔ لیکن پھر بھی ہم دونوں بہت سے وقوعے ایک ساتھ کور کرتے تھے۔

آج جب ریڈی نے بتایا کہ وہ وجے سے ملنے جا رہا ہے۔ تو میری بھی خواہش ہوئی کہ اس کے ساتھ چلوں، وجے انکاونٹر اسپشلسٹ تھا۔ اچانک اور ناگہانی حالات میں بھی مورچہ کیسے سنبھالا جائے،

دہشت گردوں کا کس طرح مقابلہ کیا جائے، ان معاملات سے وہ اچھی طرح واقف تھا۔ ایسا اس کے بارے میں کہا جاتا تھا۔ لیکن وہ کچھ لوگوں کے نزدیک بدنام بھی تھا۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ جعلی انکاؤنٹر بھی کرتا رہتا ہے۔ ایسے ہی ایک الزام میں وہ پھنس گیا تھا اور اب وہ کل ہی عدالت سے بری ہو کر آیا تھا۔ وجے کے آفس پہنچنے سے پہلے ہی مٹھائی کے دو ڈبے آئے۔ اور مجھے بھی ایک بڑے ڈبے سے لڈو پیش کیا گیا۔ لیکن نہ میں نے اس میں سے کچھ لیا اور نہ ہی ریڈی نے۔ لڈو دیکھ کر ریڈی کچھ بڑبڑا رہا تھا وہ کیا کہنا چاہ رہا تھا میں نہیں سمجھ سکا، لیکن اس کے چہرے سے ناپسندیدگی جھلک رہی تھی۔ کئی ذمہ دار اور بااثر شخصیات کے آنے جانے کا سلسلہ لگا ہوا تھا۔ انتظار کی گھڑیاں بے قراری میں بدلنے لگی تھیں۔ میں نے ریڈی پوچھا۔

''کب آئے گا تمہارا وہ آفیسر؟'' وہ سمجھ گیا تھا کہ میں بور ہو رہا ہوں تو اس کی داستان سنانے لگا۔

''وہ ایک عزت دار آدمی تھا۔ وجے اور اس کے آدمیوں نے ایک چوراہے پر کار کو روکا اور اس کے خاندان والوں کو گاڑی سے نکال دیا گیا۔ گاڑی میں بہن، اس کا چھوٹا بھائی اور ڈرائیور کے علاوہ اس کے بوڑھے چچا بھی تھے۔ پولس کئی مرتبہ اس سے قبل اس کے گھر پر دبش مار چکی تھی، اس نے اس سے کہا تھا کیس واپس لے لو ورنہ انجام برا ہو سکتا ہے۔ اسے پتہ نہیں تھا کہ سرکاری بابو کے خلاف رٹ دائر کرنا اتنا مہنگا پڑ سکتا ہے۔ یہ رٹ آخر دائر بھی کی تھی تو کس کے لئے غریب نسروا کے لئے، جس کے ماں باپ مر جانے کے بعد کوئی بھی نہیں تھا۔ بابو اس کو ہڑپ کرنا چاہتے تھے، اس کے لئے کئی مرتبہ نسروا کو انھوں نے چھوٹی موٹی قیمت پر ٹھگنے کی بھی کوشش کی تھی۔ مگر ماسٹر کب یہ برداشت کر سکتا تھا۔ وہ بالکل اڑ گیا۔ شاید اس کی بہن جانتی تھی کہ کیا ہونے والا ہے۔ وہ اپنے بھائی سے لپٹ گئی۔ اور کہا اسے گولی مت مارو پولس نے اسے الگ کیا اور اسی چوراہے پر اس کے خاندان کے سامنے اسے گولی مار دی۔ ان میں سے پانچ نے اس جھوٹے مڈبھیڑ کے بارے میں گواہی دی۔ پولس نے مرنے والے کے گھر میں ایک سپاہی تعینات کر دیا اور فون میں ایک لاؤڈ اسپیکر لگا دیا جس سے فون کی گھنٹی پورے گھر میں سنائی دے۔ وہ اس کی بہن سے پوچھتے، تم اپنے چھوٹے بھائی کو بھی کھونا چاہتی ہو؟ وہ ایک عام آدمی تھا، اسکول کا ٹیچر، اسکول سے چھوٹتا تو سماجی کاموں میں مصروف ہو جاتا کبھی بسیرن بوا کی تیمارداری کرنے پہنچا ہوا ہے تو کبھی گھر گھر جا کر بچوں کو اسکول بھیجنے کی ترغیب دیتا۔ میں اسے ہمیشہ مصروف ہی دیکھا کبھی نظیر چچا کے بیٹے کے لئے خط لکھ رہا ہوتا، وہی نظیر چچا جو محلّہ میں چیخ چیخ کر صابن بیچا کرتے تھے۔ تو کبھی لڑائی جھگڑے میں صلح صفائی کراتا نظر آتا۔ پولس نے اس کو غلط پھنسانا چاہا تھا، اس کے اوپر کئی الزامات لگائے گئے تھے اور پولس نے کہا تھا کہ کئی مبینہ دہشت گردانہ حملوں میں اس کا ہاتھ ہے۔ اس دن وہ ایک شادی میں شرکت کے لئے جا رہا تھا۔ لیکن وجے اور اس کے ساتھیوں نے بیان دیا تھا کہ وہ لوگ بموں سے لیس تھے اور قریب

کے ایک مال میں دھماکا کر کے دہشت پھیلانے والے تھے کہ پولس نے ان پر کارروائی کی۔اور دہشت گردوں نے پولس پر گولیاں برسائیں،اوراس جوابی کارروائی میں وہ نوجوان مارا گیا۔''

ریڈی نے مجھے بتایا حالانکہ اس واقعہ کی تفتیش کرنے والی ٹیم کا خیال تھا کہ یہ مڈبھیڑ فرضی تھی لیکن عدالت نے وجے کو بری کر دیا تھا۔اس کی وجہ یہ تھی کہ متوفی کے بھائی،بہن سمیت سبھی گواہ اچانک اپنی گواہی سے مکر گئے۔

''جو ہم نے کہا تھا وہ ہم نے نہیں کہا تھا، جو ہم نے دیکھا تھا وہ ہم نے نہیں دیکھا تھا۔اچانک اس کے اس قدر قریبی رشتہ داروں کے اپنے بیان سے مکر جانے کی وجہ اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتی تھی کہ پولس نے ان کو ڈرایا اور دھمکایا ہوگا یا ان کی بھی خرید وفروخت ہوئی ہو۔''

ابھی ہماری بات جاری ہی تھی کہ ریڈی بولتے بولتے رک گیا۔پولس اسٹیشن میں اچانک ہلچل سی پیدا ہوئی۔انکاؤنٹر اسپیشلسٹ وجے آن پہنچا تھا۔پولس والے اسے مبارکباد دے رہے تھے۔اور وہ مسکراتے ہوئے سب کی مبارکبادیں قبول کرتا رہا تھا۔ایک نے تیلگو میں کہا۔

''وجے بہادر! کل سے کام شروع کر دو۔''

اس کے بعد ریڈی نے اس کا انٹرویو لینا شروع کیا۔وجے ریڈی سے اچھی طرح واقف تھا اور شاید دونوں میں کچھ بے تکلفی بھی تھی۔ریڈی سوالات کرتا رہا اور وجے نہایت اطمینان سے اس کے ہر سوال کا جواب دیتا رہا۔اور جب ریڈی اپنا انٹرویو ختم کر چکا تو میں نے بھی ایک سوال پوچھ ہی لیا۔

''وجے جی! آپ کتنی مڈبھیڑوں میں شامل رہے ہیں اور کس طرح کی بندوقیں استعمال کرتے ہیں؟''اس نے تھوڑی دیر کچھ سوچا اور پھر فخریہ انداز میں گویا ہوا۔

''اب تک بیس لوگوں کا انکاؤنٹر کر چکا ہوں۔''پھر اس نے دراز میں سے چمڑے کا ایک پاؤچ نکالا۔اسے کھولا اور پھر میرے ہاتھ میں تھما دیا۔یہ سکس شوٹر تھا جس کا ہنڈل بھورا اور بیرل اسٹیل کا تھا۔اس پر ٹائٹن ٹائگر کا لوگو بنا ہوا تھا اور اس کے نیچے 38 اور مایا ایف ایل کندہ تھا۔اس کے ہینڈل پر ڈاڑھی والا نارس گاڈ بنا ہوا تھا۔یہ 1950 کے زمانے کے ہالی ووڈ کی کسی فلم کے سین جیسا نظر آ رہا تھا۔میں نے بیرول کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر وجے سے پوچھا۔

''کبھی مڈبھیڑ کے بعد یا کسی کی زندگی لینے کے بعد آپ کو برا لگا؟''

''وہ انسان نہیں تھے۔''اس نے فوراً جواب دیا۔

''وہ جانور تھے سب کے سب۔ایک زندگی لینے سے پہلے سب سے پہلے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ مرنے والا انسان نہیں بلکہ ایک بیکار جانور ہے.....آپ کو پہلے یہ ماننا پڑے گا''اس نے جواب دیا۔

''کیا کبھی مڈبھیڑ کے دوران آپ نے خطرہ محسوس کیا؟''میرا اگلا سوال تھا۔میرا سوال سن کر وہ تھوڑی دیر کے لئے رکا۔پھر کہنے لگا۔

''کبھی نہیں،طریقہ یہ ہے کہ جوابی کاروائی سے پہلے نشانہ پر گولی داغ دو۔میں کوئی بہت اچھا نشانہ باز نہیں ہوں لیکن پھر بھی مجھے کبھی بھی پچیس فٹ سے زیادہ فاصل سے گولی چلانی نہیں پڑی۔''میں نے اس سے کہا۔

''ابھی فاضل جج نے حال ہی میں ایک فیصلہ کی بابت لکھا ہے کہ تعجب کی بات ہے کہ ملزم نے جدید ہتھیار اے۔کے 56 سے گولی چلائی،جس سے ایک منٹ میں چھ سو راونڈ گولیاں چلتی ہیں اور اس کی وار کرنے کی صلاحیت تین سو میٹر تک ہے مگر نہ معاون پولس افسران اور نہ ہی کمانڈر افسر کو ایک خراش تک لگی؟''ابھی میری بات مکمل بھی نہ ہوئی تھی کہ وجے نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور کہنے لگا۔

''بھیا ہم پولس والے ہیں۔''ریڈی نے اس کے خاندان کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ اس کی دس سال کی بیٹی ہے۔

''کیا آپ چاہیں گے کہ آپ کے بچے پولس میں شامل ہوں۔''میرا اگلا سوال تھا۔

اس نے اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''نہیں!''گفتگو کے ساتھ ساتھ میرا صحافیانہ ذہن کچھ اور چیزیں بھی دیکھ رہا تھا،گفتگو کے دوران مبارکباد دینے والوں کا سلسلہ جاری تھا۔ایک سینئر انسپکٹر نے کہا کہ وہ مڈبھیڑ میں حصہ لینے والے ٹیم کے ہر رکن کو اکٹھا کریں گے اور جشن منائیں گے،شراب کا دور چلے گا اور رنڈیاں بھی نچوائیں گے۔میرا سر چکرانے لگا تھا۔میں بہت جلد یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا میں نے ریڈی کو ایک ٹہوکا دیا۔

''اب چلو.....بہت دیر ہو چکی ہے۔''وجے نے مسکراتے ہوئے اجازت دی۔ہم اپنی کار میں بیٹھ چکے تھے۔میرا ذہن نہ جانے کہاں کھویا ہوا تھا اور ریڈی بولے جا رہا تھا۔

''تم کرائم رپورٹنگ میں شاید پہلی مرتبہ آئے ہو،یار میں بھی جانتا ہوں یہ سب غلط ہے۔لیکن کیا کریں کرنا پڑتا ہے یہ سب۔میں نے ایسے بہت سے واقعات دیکھے اور سنے ہیں۔اور مین ایک راز کی بات بتاؤں؟ مجھے اس واقعہ کی ایک پولیس افسر کے ذریعہ سن گن مل گئی تھی۔یہ میرے لئے بہت بڑی خبر تھی،اور میں چاہتا تو ایک انسان کی جان بچ سکتی تھی،لیکن میں نے اس پر کوئی فالو اپ نہیں کیا۔اس کا قلق آج تک مجھے ہے۔اس واقعہ کو میں آج بھی نہیں بھول سکتا اور بلکہ اب بھی جب کبھی مجھے وہ واقعہ یاد آتا ہے میرا دل دہل جاتا ہے۔میں نے اس واقعہ کو دیکھا،بہت قریب سے دیکھا،بلکہ اسے تم ایک کامیاب اسٹنگ آپریشن بھی کہہ سکتے ہو۔میں نے اس دن اس آدمی کو زندگی کی بھیک مانگتے ہوئے دیکھا تھا۔اسے مڈبھیڑ کہنا غلط

ہوگا۔ وہ جان بوجھ کر ایک قتل کا معاملہ تھا پولس اس کو وقت سے پہلے ہی نمٹا دینا چاہتی تھی۔ اس بے چارے کو اس کے کھڑے ہونے کی جگہ دکھا دی گئی تھی۔ اور کہا گیا تھا کہ یہاں سے ہلنا مت۔ تمہیں گولی لگ سکتی ہے۔'' بولتے بولتے ریڈی جذباتی ہو گیا تھا۔ لیکن اس نے اپنی بات جاری رکھی۔

''اس دن رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ پولس کے جوان جائے وقوعہ پر پہنچے۔ اس آدمی کو پتہ تھا کیا ہونے والا ہے۔ وہ ڈر سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اور اپنی زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا۔

''میر ھوٹے چھوٹے بچے ہیں سر! پلیز مجھے بخش دیں! میں کچھ بھی کروں گا۔ میں انفارمر بن جاوں گا۔'' جب وہ اپنی زندگی مانگ رہا تھا تو ایک پولس والے نے اپنی بندوق اٹھائی اور گولی چلانا شروع کر دیا۔ الگ الگ زاویے سے الگ الگ شاٹ۔ پہلے سے بنائی گئی ایک منظّم سازش کے تحت۔ س طرح ایک پولس والا ایک مخصوص جگہ پر کھڑا ہوگا اور دوسرا دوسری جگہ پر۔ اس بات پر سمجھوتہ ہو چکا تھا۔ اور اس شخص پر لگ بھگ چھ سات راونڈ گولیاں چلائی گئیں۔ گولی چلاتے ہوئے وہ اسے گالیاں دے رہے تھے۔ ان پولس والوں کے چہرے پر کوئی افسوس نہیں تھا۔ جب آدمی زمین پر گر گیا تو انہوں نے ساتھ لائے رومال میں لپٹے ریوالور کو مردہ آدمی کے ہاتھ میں رکھ کر اس سے دو گولیاں داغ دیں۔ جو بھی عام لوگ جائے وقوعہ پر تھے پہلے ہی پولس کی آواز سن کر بھاگ گئے تھے۔ پولس نے پینتالیس منٹ تک انتظار کیا کہ اس میں زندگی کی ایک رمق بھی باقی نہ رہے۔ پھر اسے اسپتال لے کر گئے۔ میں اس رات تین بجے تک نہیں سو سکا۔ اور تین دن کھانا نہیں کھایا۔ میں نے پہلی مرتبہ کسی کو اس طرح مارے جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس واقعہ کے بعد سے پولس سے میرے تعلقات بدل گئے۔ میں ان سے نفرت کرتا ہوں۔ یہ سب سالے حرامی ہیں! کتے ہیں سالے! اگر مجبوری نہ ہوتی تو سالا کب کا اس پیشہ سے توبہ کر لیتا۔'' ریڈی بولے چلا رہا تھا۔

''لیکن مجھے افسوس ہے بھائی میں نے اس واقعہ کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ ایک سطر بھی نہیں۔ پولس مڈبھیڑ کے بارے میں جو بھی خبریں چھپتی ہیں وہ بکواس ہوتی ہیں۔ آج کا انٹرویو بھی جھوٹا تھا۔ ہم صحافی نہیں اسٹینوگرافر ہیں اسٹینوگرافر! ہم پولس کے منشی ہیں۔'' میں نے ریڈی کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں اور چہرہ کسی پتھر کی طرح بے جان نظر آ رہا تھا۔

◀◀ ● ▶▶

E-26,Abulfazal Enclave
Jamia Nagar,Okhla,New Delhi-110025
+91 9911701772

- **ناول کا پہلا باب**
- **اقبال حسن خاں**

راج سنگھ لاہوریا

''ان انگریزوں کی ماں کو ہٹلر لے جائے.....''

کھرنجے کے فرش کی جگہ جگہ سے اُکھڑی اینٹوں والی گلی سے سائیکل پر گزرتے ہوئے میں جیرے کی بات کا اتنا ہی حصہ سن سکا۔ میں جلدی میں تھا اور ٹوٹی اینٹوں والی گلی میں سائیکل چلانا یوں بھی دشوار تھا۔ میں نے ہینڈل کے ساتھ وہ بالٹی لٹکا رکھی تھی جس میں، میں اماں کی جھڑکیاں سننے کے بعد اُس گرم دوپہر، نہ چاہتے ہوئے بھی بازار سے دہی لے کر گھر لَوٹ رہا تھا اور دہی چھلکنے کا خوف مجھے کسی اور بات پر دھیان نہیں دینے دے رہا تھا۔

جیرے کا نام نذیر احمد تھا اور سنا تھا کہ وہ پہلے سری نگر میں کسی انگریز کا بٹلر تھا، پھر اُس نے خان ساماں سے دوستی کی بنا پر کچھ اُلٹا سیدھا پکانا بھی سیکھ لیا۔ جب تک جوانی رہی کشمیر کی سردی برداشت کرتا رہا لیکن ادھیڑ عمر میں اُس نے کشمیر چھوڑ کر مشرقی پنجاب کے اپنے آبائی شہر کے اس محلے میں ایک چھوٹا سا ہوٹل کھول لیا۔ اس کے ہوٹل پر کھانا تو بس واجبی سا ہی ہوتا تھا لیکن چائے وہ بہت عمدہ بناتا تھا چنانچہ دن بھر اور رات گئے تک وہاں چائے پینے والوں کا ہجوم رہتا تھا۔ میں بھی اکثر اس ہجوم کا حصہ بنا کرتا تھا۔

اس ہوٹل پر بیٹھنے والوں کا تعارف کروانے سے پہلے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس ہوٹل کی لکڑی کی بنی اُن بنچوں کا تذکرہ ضرور کروں جن میں، میرے اندازے کے مطابق دنیا کے توانا ترین کھٹمل، وہاں بیٹھنے والے ادیبوں، شاعروں، مصوروں اور پہلوانوں کے خون پر پل کر اتنے دلیر ہو چکے تھے کہ اب تو میزوں پر بھی ٹہلتے دکھائی دیتے تھے۔

جیرے کے ہوٹل پر ہر چیز گاہک کی نگاہوں کے سامنے تیار کی جاتی تھی۔ مطلب یہ ہے وہاں علیحدہ سے کسی باورچی خانے کا کوئی اہتمام ہی نہ تھا۔ ہوٹل کی کل عمارت ایک بارہ، پندرہ فٹ کے کمرے پر مشتمل تھی، جس کے اگلے حصے میں مٹی کا چبوترہ بنا کر اُس میں دو چار انگیٹھیاں بنا دی گئی تھیں۔ ایک پر سالن کا دیگچہ، دوسرے

پر چائے کے لئے اونٹنے والا پانی اور تیسرا پر پتہ نہیں کیا الا بلا پکا کرتی تھی۔ سردیوں میں لوگوں کی کوشش ہوتی تھی کہ پنجاب کی برفاب ہوا سے بچنے کے لئے اندر بیٹھیں اور مسلسل بھرے ہوئے دھوئیں سے اپنی آنکھیں اور گلے خراب کروائیں اور کھانس کھانس کر ہر قسم کے موضوعات پر گفتگو کریں۔

گرمیوں میں ہوٹل کی جائے مستعملہ کا دائرہ خود بخود نصف گلی تک پھیل جایا کرتا تھا اور ہم لوگ گندی نالی پر پڑے بنچوں پر اطمینان سے بیٹھ کر چائے پیتے اور سگریٹ پیتے وقت احتیاطاً وہ ہاتھ بنچ کے نیچے رکھتے جن میں ہم نے سگریٹ تھام رکھے ہوتے تھے کہ گلی سے گزرتے محلے کی کسی بزرگ کی نگاہ نہ پڑے۔ اُس زمانے میں کسی پر شبہ بھی ہو جاتا تھا کہ وہ بزرگ ہے تو لوگ غلو کی حد تک احترام کو اپنا فریضہ جانتے تھے۔ گلی محلے میں کوئی شادی ہوتی اور لاہور یا امرتسر سے مجرے کے واسطے طوائفیں بلوائی جاتیں تو شوقین مزاج بزرگ ناچ دیکھتے وقت، نوجوانوں کی نظروں میں اپنا احترام برقرار رکھنے کو چہروں پر مفلر وغیرہ جیسا کوئی کپڑا لپیٹ کر فرض کر لیا کرتے تھے کہ کوئی اُنہیں نہیں پہچانے گا، لیکن صاف پہچانے جاتے تھے مگر کسی کی جرات نہیں ہوتی تھی کہ اگلی صبح ان کی تماش بینی کا چرچا کرے۔

کچھ تو اپنی طبیعت کی بنا پر جو سیاسی معاملات کریدنے میں انتہائی چوکس تھی اور کچھ ہوٹل پر بیٹھنے والے لوگوں کی سیاسی گفتگو سن کر، جیرا سیاسی معاملات پر اپنے ٹپیکل انداز میں تبصرے کیا کرتا تھا۔ وہ سارا دن گاہکوں کو بھگتاتے ہوئے عموماً اپنے مٹی کے بنچ چبوترے کے پیچھے ہی کھڑا رہا کرتا تھا اور گاہکوں سے پیسے وصول کرتے یا ہزارہ سے تعلق رکھنے والے اپنے دونوں ملازمین کو گالیاں دیتے وقت بھی ایک کان ہوٹل میں ہونے والی سیاسی گفتگو پر لگائے رکھتا تھا۔ میں اُس کی اس صلاحیت پر تب بھی حیران تھا اور آج بھی ہوں کہ جب کبھی گفتگو اُس کی مرضی کی ہو رہی ہوتی یا وہ سمجھتا کہ فریق مخالف جس کا وہ طرفدار ہے، ذرا بھی ہیٹا پڑ رہا ہے تو وہ مٹی کا چبوترہ چھوڑ کر اُس بنچ پر آن بیٹھتا جہاں یہ گفتگو زوروں پر ہوتی اور دلائل دینے لگتا۔

ہمارا گھر، جسے میرے ابا جی کے بقول، ہمارے سکڑ دادا نے مغلوں کی فوج سے نوکری چھوڑ کر جب یہاں بنوایا تھا تو یہ جگہ ایک ویرانہ تھی، گلی کے تقریباً آخری گھروں میں یوں شمار ہوتا تھا کہ اس سے ایک منٹ کی پیدل مسافت پر گلی ختم اور وہ بڑی سڑک شروع ہو جایا کرتی تھی جہاں صبح سے لے کر رات گئے تک کسی بھی بازار والی رونق رہا کرتی تھی۔ اُس زمانے میں کلب تھے، نہ ہی بڑے ہوٹل یا دوسرے ایسے مقامات جہاں لوگ اپنی فرصت کے اوقات کاٹتے تو اکثریت سڑکوں کے کنارے، اُن دکانوں کے تھڑوں پر بیٹھی باتیں کرتی یا تاش واش کھیلتی دکھائی دیتی جو مغرب کی اذان ہوتے ہی بند ہو جایا کرتی تھیں۔ یہ بھی بتاتا چلوں کہ چونکہ اُس زمانے کے مولوی اپنے کام سے کام رکھا کرتے تھے، یعنی نماز، جنازہ اور نکاح پڑھانے تک ہی محدود تھے

اور اُنہیں جمہوریہ یا اسلام وغیرہ کا زیادہ علم نہیں تھا چنانچہ کسی بھی قسم کی تفریح کو حرام قرار نہیں دیا گیا تھا۔ قیام پاکستان سے پہلے کا معاشرہ ایک کھلا معاشرہ تھا اور ہر کوئی دوسرے کی عزت، مال اور جان کا احترام کرنے کے بعد اپنی مرضی کیا کرتا تھا چنانچہ نہ نمازیوں کو گولیاں ماری جاتی تھیں اور نہ ہی لوگ بندوقوں کی چھاؤں میں نماز پڑھا کرتے تھے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اُسی زمانے سے متصل وقت میں، جب کی یہ کہانی ہے، اقبال ممولے کو شہباز سے لڑنے کا مشورہ دے چکے تھے لیکن ممولے اتنے احمق تھے اور نہ ہی شہباز کو کسی سے لڑنے بھڑنے کا شوق تھا چنانچہ دونوں اپنی اپنی فضا میں اطمینان کا سانس لئے پرواز کیا کرتے تھے۔

تقسیم سے پہلے چونکہ ہندوستان بھر کے شہروں میں ہر مذہب کے ماننے والے رہا کرتے تھے تو ہمارے شہر میں بھی مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندو اور سکھ کثیر تعداد میں آباد تھے بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ سکھوں کی تعداد زیادہ تھی۔

وہ ان معنوں میں ایک پرسکون دَور تھا کہ ابھی آبادی بہت حد تک قابو میں تھی، قناعت بھی تھی اور لوگ پیسے سے زیادہ اقدار کی فکر کیا کرتے تھے۔ کسی بھی ذات یا گوت سے تعلق رکھنے والا ہو، اُسے اپنی اور اپنے پرکھوں کی عزت کا بڑا خیال رہتا تھا۔ آج کوئی یقین نہیں کرے گا کہ میں نے اُس زمانے میں، ہندوستان میں نیچی سمجھی جانے والے ذاتوں جیسے نائی دھوبی وغیرہ پر بھی لوگوں کو فخر کرتے سنا تھا۔ ایک مرتبہ ہمارے محلے کے نائی کا لڑکا، عبدل جو میرے ہی سکول میں پڑھا کرتا تھا جوا کھیلتا پکڑا گیا تھا، اُس کے باپ نے گلی میں اُس کی سرعام مرمت کرتے ہوئے بار بار کہا تھا کہ اس کمبخت نے نائیوں کی ناک کٹوا دی!

میں اپنے دوستوں کے ساتھ ہوٹل کے اندرونی حصے میں بیٹھا تھا کیونکہ مارچ کا آخر ہونے کے باوجود شامیں ابھی خاصی خنک تھیں۔

''میں کہتا ہوں پاکستان بن گیا تو سارے مسلمان ہندوستان چھوڑ کر پاکستان چلے جائیں گے۔''

یہ آواز عبدالحلیم خلشؔ کی تھی۔ خلشؔ ہوٹل پر بیٹھنے والوں میں سب سے زیادہ پڑھا لکھا سمجھا جاتا تھا۔ اُس نے نجانے کس مضمون میں ایم اے کر رکھا تھا اور ابھی دو سال پہلے ہی شملے کے فوجی دفتر میں کلرک بھرتی ہوا تھا۔ اِس سے پہلے اُس نے بڑی کوشش کی تھی کہ اُسے اُس کی تعلیم کی بنیاد پر کوئی اچھی ملازمت مل جائے لیکن وہ ناکام رہا تھا اور اکثر حسرت سے کہتا تھا۔

''یار میں نے دسیوں امتحانات پاس کئے اور انٹرویو دیئے مگر یہ جو بھینچو ہندو ہیں نا، سالوں نے ایکا کر رکھا ہے۔ کسی مسلمان کو آگے آنے ہی نہیں دیتے''۔

خلشؔ جیسا کہ اُس کے تخلص سے ظاہر ہے، شاعر بھی تھا۔ اُس زمانے میں مجھے اور وہاں بیٹھنے

والے میری عمر کے لڑکوں کو بس اختر شیرانی کی شاعری ہی اچھی لگتی تھی کیونکہ وہ براہ راست محبوبہ سے مخاطب ہوتا تھا۔ہم اکثر، یہی وہ وادی ہے ہمدم جہاں ریحانہ رہتی تھی قسم کی نظمیں ایک دوسرے کو سنایا کرتے تھے۔خلش کی شاعری میں توپ، تیر، آتش، آہن اور بغاوت وغیرہ کی باتیں ہوتی تھیں جو ہمارے سروں پر سے گزر جاتی تھیں۔بعد میں کسی نے بتایا کہ خلش کا فیض صاحب کے پاس آنا جانا بھی تھا اور اُس کی شاعری اُن کی شاعری سے اسی لئے متاثر تھی لیکن فرق یہ تھا کہ فیض صاحب توپ تلوار کے ساتھ عارض ورخسار کی باتیں بھی کرتے تھے جبکہ خلش محض تلوار چلایا کرتا تھا۔

''تم دیکھ لینا انگریزوں کے جانے کے بعد یہ سالے ہندو مسلمانوں کو تگنی کا ناچ نچادیں گے۔''

خلش کو یقین تھا۔

لیکن ایسا نہیں تھا کہ وہاں سبھی خلش سے متفق تھے۔مجھے لمبے بالوں اور دھنسے ہوئے گالوں والا اپنا محلے دار انور خوب یاد ہے جو تحریک پاکستان اور جناح صاحب کا مخالف تھا اور دو قومی نظریہ کا بھی، چنانچہ وہ چائے کی پیالی میں گھٹیا سگریٹ بجھا کر کہتا۔

''ایک ہزار سال زبردستی مقامی لوگوں پر حکومت چلانے کے بعد اچانک مسلمانوں کو یہ خیال کیسے آ گیا کہ ان کا ایک علیحدہ وطن ہونا ضروری ہے؟ اگر ہندو اتنے ہی برے تھے تو سالو، تمہیں پانچسو سال پہلے ہی خیال کیوں نہیں آیا؟''۔

ہوٹل میں شور مچ جاتا اور خلش طنزیہ لہجے میں بولتا۔

''ضرورت نہیں تھی کیونکہ اُس وقت یہ غاصب انگریز جو نہیں تھے جو ہمیں آسان شکار بنا کر ہندوؤں کے سامنے ڈال کر جا رہے ہیں کہ ہمیں جیسے چاہیں چچوڑیں۔''

اس بات کا جواب سننے کے لئے جیرا اپنے کاؤنٹر پر ہزارے والے دونوں بیروں میں سے کسی کو متعین کرتا اور وہیں آ جاتا۔جیرا خود بھی پاکستان بننے کے خلاف تھا اور انور کو اسی لئے بہت پسند بھی کرتا تھا۔انور بات جاری رکھتا۔

''دیکھو میری جان۔تم نے اگر مسلمانوں کو مٹی کا مادھو سمجھ رکھا ہے تو بات اور ہے۔اس وقت یہ ملک ہندی آئین کے تحت نہیں چل رہا۔سن پینتیس کے ایکٹ کے تحت لشٹم پشٹم چل رہا ہے۔جب آئین بنے گا تو اُس میں مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ ہوگا۔بھلا ہندوستان کی اتنی بڑی طاقت، ان مسلم لیگی لیڈروں کی موجودگی میں مسلمانوں کے حقوق کے خلاف کوئی قانون بننے دے گی؟''۔

اب سبھی خلش کی طرف متوقع نگاہوں سے دیکھتے۔خلش مسکراتا اور کہتا۔

''ابے گھامڑ۔ہندوستان کا نظام جمہوری ہوگا اور جمہوری طریقے سے آئین میں جب چاہو تبدیلی کرلو۔اس میں کیا دیر لگتی ہے؟'' انور نفی میں سر ہلاتا اور یوں مسکرا مسکرا کر چاروں طرف دیکھنے لگتا جیسے ہوٹل میں موجود اپنے سبھی مخالفین کو اُلو کا پٹھا سمجھ رہا ہو۔وہ سگریٹ سلگاتا اور ماچس کی تیلی کو انگلی اور انگوٹھے کی مدد سے ہوا میں اُچھال کر یہ دیکھنے کی کوشش بھی کرتا کہ وہ کہاں گری تھی۔پھر ایک طویل کش لگاتا اور کہتا۔

''یہ تمہارے جناح صاحب جن علاقوں میں پاکستان بنانے جا رہے ہیں، وہ انتہائی پس ماندہ ہیں، کوردیہہ ہیں۔مجھے نہیں پتہ لاہور تمہیں ملتا ہے یا نہیں، لاہور کو چھوڑ دو اور بقیہ پاکستان کو دیکھو تو وہاں ایسی قوم بستی ہے جو انگریزوں سے بھی پہلے کی غلام چلی آ رہی ہے۔میں پنجاب، سندھ اور بلوچستان کی بات کر رہا ہوں۔غلامی کبھی صحت مند سوچ پیدا نہیں کرتی۔ان علاقوں کے لوگ عملاً جاگیرداروں اور سرداروں کے غلام ہیں۔انگریز نیا پنی تمام تر اُس جمہوریت پسندی کے باوجود، جو اُس نے اپنے ملک کے لئے مخصوص کر رکھی ہے، اس طرف سے آنکھیں یوں بند کر رکھی ہیں کہ یہ عمل اُس کی حکومت چلانے میں معاون ہے۔''

کبھی کبھی یہ بحثیں آدھی رات تک جاری رہتیں۔

خلش جب بھی شملے والے فوجی دفتر سے چھٹی پر آتا، ہوٹل میں چھوٹا موٹا مشاعرہ ہوتا۔اُس شام جیرا اپنے چبوترے کے پیچھے کھڑا، گاہکوں کو بھگتاتے اور ملازمین کو گالیاں دیتے وقت اپنی تمام تر توجہ شاعروں کی طرف مبذول کئے رہتا اور جب کسی شعر کو اپنی فہم سے قریب پاتا تو زور سے نعرہ لگا کر خوشی کا اظہار کرتا لیکن جب کوئی باریک استعارہ یا تشبیہ اُس کی سمجھ سے بالا ہوتی تو یوں مایوسی سے نفی میں سر ہلاتا جیسے شاعر کی کوتاہ خیالی پر افسوس کر رہا ہو۔یہ مشاعرے رات گئے تک جاری رہتے کیونکہ ہر شاعر اپنی دو دو تین تین تخلیقات سنانے پر مصر ہوتا۔

چونکہ میں ان دنوں گھر پر نہیں رہتا تھا تو میری ہمہ وقت چھت پر پڑی چارپائی اماں نے اُٹھوا دی تھی اور مجھے مارچ کی دھوپ میں بیٹھنا اچھا لگتا تھا تو میں نیچے سے ایک کرسی اُٹھا لایا کرتا تھا اور جب کبھی میرے دو چار دوست جمع ہو جاتے تو ہم اپنی اپنی کرسیوں بیٹھک سے اُٹھا لاتے اور جاتے وقت وہیں واپس بھی رکھ دیتے۔

☆☆☆

میں ایک ایسے ہی وقفے میں گھر آیا ہوا تھا تو اُنہی دنوں مجھے کلثوم سے محبت ہوگئی۔

یہ محبت کبھی نہ ہوتی لیکن چونکہ ہر کام کے ہونے کا قدرت نے اپنی کتابوں میں ایک وقت مقرر کر رکھا ہے تو وہ ایسے اسباب پیدا کر دیتی ہے کہ وہ کام خود بخود انجام پا جاتا ہے۔میں سوچتا ہوں کہ اگر اُس دن

مجھے سردی نہ محسوس ہوتی اور میں چھت پر کرسی بچھا کر نہ بیٹھتا، کلثوم کی ماں اُس دن گیلے کپڑے چھت پر پھیلانے کو کلثوم کی نہ بھجواتی، ہوا سے ایک کپڑا اُڑ کر ہماری چھت پر نہ آتا اور کلثوم یہ سوچ کر کہ ماسی یعنی میری ماں کی چھت پر کوئی نہیں ہوتا، چھتوں کے درمیان بنی چھوٹی سی دیوار پھاند کر، کپڑا اُٹھانے ہماری چھت پر نہ کودتی اور وہاں مجھے بیٹھا پا کر حیران نہ رہ جاتی تو ہمیں ایک دوسرے سے محبت کیسے ہوتی؟ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب اللہ میاں نے ہر کام کے ہونے کا ایک وقت مقرر کر رکھا ہے، سب کچھ طے کر رکھا ہے اور اُس کے مطابق ہی سب کچھ سرانجام دیا جاتا ہے تو پھر لوگ تقدیر کے چکر میں کیوں پڑے رہتے ہیں؟ بہر حال کلثوم چھت پر سہمی سی کھڑی تھی اور مجھے دیکھ رہی تھی اور محبت کا اولین شگوفہ ہمارے دلوں میں پھوٹ رہا تھا۔

یوں نہیں تھا کہ میں نے کلثوم کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا بلکہ یوں تھا کہ میں نے کلثوم کو پہلی مرتبہ محبت کی نظر سے دیکھا تھا اور اسے محبت کی نظر سے دیکھنے میں میرے ارادے کو کوئی دخل نہیں تھا۔ بھلا محبت ارادہ کر کے کب کی جاتی ہے؟ ارادہ کر کے تو برائی یا نیکی کی جاتی ہے۔ تو مجھے کلثوم سے اچانک ہی محبت ہو گئی۔ اُس وقت تک مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ کلثوم کو بھی مجھ سے محبت تھی یا نہیں۔ کلثوم نے مسکرا کر مجھے دیکھا اور کپڑا اُٹھا کر چھت کی دیوار کو یونہی پھاند کر اپنی چھت پر چلی گئی، جیسے وہ ہماری چھت پر آنے کو پھاندی تھی۔

وہ سارا دن اور اگلی ساری رات میں سوچتا رہا کہ اب اگر محبت ہو ہی گئی تھی تو مجھے کلثوم کے سامنے اس کا اظہار بھی کر دینا چاہئے تھا۔ محبت کے معاملے میں یہ بڑی خرابی ہے کہ جب یہ ہو جائے تو جب تک دونوں فریقوں میں سے کوئی اس کا اظہار نہ کر دے، کسی پل چین نہیں آتا۔

ہماری گلی بلکہ محلے میں اور کچھ ہوتا ہو یا نہ ہوتا ہو، جوانیوں کی پہرے داری بڑی کڑی ہوا کرتی تھی۔ محلے کے اکثر مردوں اور تمام تر عورتوں کی انتہائی چوکس نگاہیں اُنلڑ کوں اور لڑکیوں کو شیر کی نگاہوں سے دیکھا کرتی تھیں جن کے بارے میں اُنہیں ذرا سا شبہ بھی ہو جاتا تھا کہ اُن کا سابقہ بلوغت سے پڑ چکا تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ ہمارے محلے میں کبھی کوئی عشق طشت از بام ہوا ہو۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا تھا جب شیخوپورے سے ہمارے شہر میں تبدیل ہو کر آئے اور کرائے پر مکان لے کر رہنے والے ایک چھوٹے موٹے سرکاری افسر کی بیٹی سے ہمارے محلے کے ایک طرح دار نوجوان ناصر نے پینگیں بڑھالی تھیں لیکن یہ پینگ عین اُس وقت ٹوٹ بھی گئی تھی جب ناصر اور وہ لڑکی، ایک تاریک رات لڑکی کے گھر کی ڈیوڑھی میں کھڑے پیار کے جھولے پہ جھول رہے تھے۔ محلے والوں نے اسے اپنی ہتک جانا تھا اور ناصر اور لڑکی کو تین چار دن بعد نکاح کی صورت سزا دے کر ہمیشہ کو ایک کر دیا تھا۔ جس وقت میری اور کلثوم کی محبت والا قصہ شروع ہوا ہے، اس واقعے پر کئی سال گزر چکے تھے اور ناصر مجھے کبھی کبھی اپنے دونوں بچوں کو سائیکل پر بٹھائے، بازار سے گزرتا دکھائی دیا کرتا

تھا۔ میں فی الحال کلثوم سے محبت کرنا چاہتا تھا اور میرا پروگرام بچوں کو سائیکل پر سیر کرانے کا بالکل بھی نہیں تھا۔

جو حالات میں نے اُوپر بیان کئے ہیں، اُن سے یہ بات بہ آسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ ہمارے محلے میں عشق کرنا کس قدر مشکل کام تھا۔ محلے میں میرے بچپن کے چار چھے دوست تھے لیکن میں بھروسہ ایک ہی پر کر سکتا تھا۔ یہ ججی تھا۔ نام تو اعجاز تھا لیکن اُسے سب پیار سے ججی کہا کرتے تھے۔ اصل نسل کشمیری ججی انتہائی خوبصورت جوان تھا اور اُس نے میٹرک کا امتحان نہیں دیا تو پھر تعلیم ہی چھوڑ دی تھی۔ ججی مجھ سے کوئی دو سال بڑا رہا ہوگا۔ اُس سال جب اُسے میٹرک کا امتحان دینا تھا، وہ اپنی ماں کے ساتھ اپنی خالہ کے گھر کلکتہ گیا تھا جہاں اُس کا خالو کشمیری قالینوں یا شالوں وغیرہ کا کاروبار کرتا تھا۔ ججی کو پڑوس میں رہنے والی ایک بنگالی ہندو لڑکی سوسن سے محبت ہو گئی تھی۔ بلکہ سچ تو یہ تھا کہ پہلے محبت کا اظہار سوسن نے ہی کیا تھا۔ ججی نے مجھے بعد میں بتایا۔

''یہ ٹھیک بات ہے کہ میں نے جب اُسے پہلی مرتبہ دیکھا تو وہ مجھے عام سی لڑکی لگی پر جب اُس نے مجھ سے اظہار محبت کیا تو میرے لئے وہ دنیا کی سب سے خاص لڑکی بن گئی۔ دراصل محبت کا اظہار کرتی عورت دنیا کی سب سے حسین عورت یوں بن جاتی ہے کہ اُس کے وجود میں سچ لہریں لے رہا ہوتا ہے اور تجھے پتہ ہے سچ کا اپنا ایک حُسن ہوتا ہے۔''

ججی کی محبت کی بیل منڈھے نہیں چڑھ سکی اور اس کی کئی وجوہات میں سے ایک وجہ ججی کا مسلمان اور سوسن کا ہندو ہونا بھی تھا۔ سوسن کا باپ سمجھدار آدمی تھا تو اُس نے اس بات کو جاہلوں کی طرح مشہور نہ کر کے ہندو مسلم فسادات کا شاخسانہ نہیں بنایا بلکہ سوسن کو کلکتے سے سینکڑوں میل دُور اپنے گاؤں بھجوا دیا۔ ججی کی محبت کملا گئی۔ وہ کلکتے سے واپس آیا تو ہر وقت اُداس رہنے لگا اور پھر اُس نے میٹرک کا امتحان نہ دیا اور تعلیم ہی چھوڑ دی۔ ججی کی داستان محبت یہیں ختم نہیں ہوئی۔ اُسے اپنے شہر آئے چند ماہ ہوئے تھے کہ اُس کی خالہ نے اُس کی ماں کو خط لکھ کر بتایا کہ سوسن نے گاؤں کے تالاب میں کود کر خودکشی کر لی کیونکہ اُس کا باپ اُس کی شادی کہیں اور کرنا چاہتا تھا۔ یہ خبر ججی تک پہنچی تو ججی کتنے ہی دنوں تک نیم پاگل سا رہا لیکن بہر حال اب وہ ٹھیک تھا اور اپنے باپ اور بڑے بھائیوں کے ساتھ اپنے خاندانی کام کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ ججی کے باپ کی اُس کے دادا کے وقت سے شہر کے چوک میں درزی کی مشہور اور قدیمی دکان تھی، ججی حساب کتاب رکھا کرتا تھا۔ دکان پر اُس کا باپ اور بڑے بھائی تو کام کرتے ہی تھے، اُنہوں نے چند کاریگر بھی رکھ چھوڑے تھے۔

میں ججی کی تلاش میں اُس کی دکان پر گیا تو اُس کے باپ نے مجھے بتایا کہ وہ کوئی گھنٹہ بھر پہلے دکان سے نکل چکا تھا۔ اُس کے باپ کو چونکہ علم تھا کہ ججی میرا دوست تھا تو اُس نے مجھ سے ملتجیانہ لہجے میں کہا کہ میں ججی کو کہیں شادی پر رضامند کر لوں لیکن پھر اُس کا رویہ اور لہجہ جارحانہ ہوتا چلا گیا۔

''میں کہتا ہوں اُس بنگالن کے پاس ایسی کون سی چیز تھی جو اس کنجر کے بچے کو کوئی دوسری عورت نہیں دے سکتی؟''

ججی کے باپ نے قینچی سے ایک فحش اشارہ کر کے اپنی بات مزید واضح کی۔

''یہی ہونا ہے نا تو کہیں بھی ہو سکتا ہے۔ ٹھیک کہا نا میں نے؟''

میں نے شرماتے ہوئے اقرار کیا کہ ایسا ہی تھا۔ وہ مسکرایا اور اُس نے انتہائی صفائی سے پان کی پیک گلی میں تھوکی۔ اس کے پیچھے یہ کام کرنے کا اُس کا برسوں کا تجربہ یوں بول رہا تھا کہ ایک چھینٹ بھی اِدھر اُدھر نہ پڑی۔ برسوں بعد مجھے تجربہ ہوا کہ یہ کام صرف ججی کا باپ ہی نہیں کر سکتا تھا۔ ماسٹر شفیع یہ کام کرنے میں ججی کے باپ سے بھی دو ہاتھ آگے تھا لیکن ماسٹر شفیع کا واقعہ میں بعد میں سناؤں گا۔ ججی کا باپ ججی کی محبت کی برابر توہین کرتا رہا لیکن ایک تو اُس کا احترام اور دوسرے اس حقیقت سے واقفیت کہ ججی کے باپ نے کبھی محبت نہ کی تھی، میں خاموش رہا لیکن اُس نے مجھے اُس وقت تک وہاں سے ہلنے نہیں دیا جب تک یہ وعدہ نہیں لے لیا کہ میں ججی کو سوسن کو بھول کر اپنی ہی برادری کی ایک لڑکی سے شادی پر رضامند کرنے کی کوشش کروں گا۔ یہ لڑکی آٹھویں جماعت فیل تھی اور بقول ججی کے باپ کے امور خانہ داری میں ماہر بھی وغیرہ۔

ججی کے باپ نے مجھے یہ بھی بتایا کہ اگر ججی شادی پر آمادہ نہ ہوا تو وہ اُسے گھر سے نکال دے گا۔ اُس نے ججی کو ایسی گالیاں بھی دیں جن سے ججی کی ماں کا فاحشہ ہونا ثابت ہوتا تھا جبکہ وہ ایک انتہائی نیک اور خلیق عورت تھی مگر ججی کا باپ غصے میں تھا تو کیا کِیا جا سکتا تھا؟

میں ججی کی تلاش میں نکلا۔ وہ جیرے کے ہوٹل پر نہیں تھا۔ کسی نے مجھے بتایا کہ ججی کو اُس نے باغ کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ ہمارے وقتوں میں اُسے باغ کہتے تھے، جسے آج پارک کہتے ہیں۔ ججی مجھے وہاں مل گیا۔ وہ سیاہ شلوار قمیص میں ملبوس تھا اور چیڑھ کے ایک پرانے درخت کے سہارے بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرایا اور بولا۔

''کسی نے بتایا تھا کہ تم تین چار دن سے آئے ہوئے ہو۔ ہوٹل پر نہیں دیکھا تمہیں؟''۔

میں ججی کے قریب بیٹھ گیا اور میں نے اُسے فوراً ہی بتا دیا کہ مجھے کلثوم سے محبت ہو گئی تھی اور یہ کہ میں کلثوم کو یہ بات بتانا چاہتا تھا کیونکہ اظہار کے بنا محبت کیسی؟

ججی کلثوم کو جانتا تھا۔ اُس کے دونوں بھائیوں اور والد سے بھی اُس کی پہچان تھی۔ اُس نے میری اور کلثوم کی محبت والی بات پر کسی حیرت کا اظہار نہیں کیا اور قدرے اطمینان سے پھیل کر بیٹھا اور بولا۔

''ہاں یہ بات ٹھیک ہے، جب محبت ہو جاتی ہے تو اظہار بھی ہونا چاہئے۔''

وہ یہ کہہ کر طویل وقت کے لئے خاموش ہو گیا تو مجھے اُلجھن ہونے لگی۔ میں نے تنگ آ کر کہا۔

''یہی تو میں تم سے پوچھنے آیا ہوں کہ مجھے اُس سے کیسے اظہار محبت کرنا چاہئے؟''

ججی نے اثبات میں سر ہلایا اور خلا میں کچھ دیکھنے لگا۔ جب وہ کافی دیر تک کچھ نہ بولا تو میں نے خود ہی اُس زمانے کا مجرب اور مروج طریقہ پیش کیا لیکن ایسے انداز سے جیسے میں ججی کا مشورہ بھی شامل کرنا چاہتا تھا۔

''خط لکھ دوں؟ یہ خط اُسے دینا کچھ بھی مشکل نہ ہوگا۔ وہ ہر روز کتنی ہی مرتبہ چھت پر آتی ہے۔''

ججی نے مجھے ایک نظر دیکھا اور اُس کے چہرے پر ناپسندیدگی کے تاثرات اُبھرے اور وہ بولا۔

''یار تم کالج میں پڑھتے ہو۔ مجھے اُمید نہیں تھی کہ تم ایسے احمقانہ طریقے سے اظہار محبت میں یقین رکھتے ہو گے۔'' میں ججی کا طریقہ سننے پر مستعد ہوا تو اُس نے کہا۔

''اب جب وہ ملے تو اُس کا ہاتھ پکڑ کر کہنا کہ کلثوم مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے اور میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں، بس۔''

شادی کا تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ میں نے حیرت سے کہا۔

''شادی؟''

ججی نے مجھے غور سے دیکھا اور بولا۔

''تو کیا تم اُس سے شادی نہیں کرنا چاہتے؟'' یہاں سے میری فکر کا دوسرا دروازہ کھلا اور میں نے کہا۔

''یہ تو میں نے سوچا ہی نہ تھا۔'' ججی کی نگاہوں میں شبہ جاگا اور بولا۔

''تم انگریزوں والی دوستی رکھنا چاہتے ہو اُس سے؟'' میں جانتا تھا کہ ،،انگریزوں،، والی دوستی کیا ہوتی تھی تو میں نے دونوں کان پکڑ کر کہا۔

''توبہ توبہ کیسی باتیں کر رہے ہو یار؟ مجھے واقعی اُس سے محبت ہو گئی ہے۔'' ججی نے اس مرتبہ اپنی بات کہنے میں وقت نہیں لیا اور بولا۔

''تو پھر ٹھیک ہے، اُس سے اظہار محبت کر دو اور دنیا سے مت ڈرو۔ لیکن یاد رکھنا محبت کرنا آسان اور نباہنا بہت مشکل کام ہوتا ہے۔ اس میں جان کا خطرہ بھی ہوتا ہے۔ تمہیں تو میری سٹوری کا پتہ ہی ہے۔''

مجھے ججی کی سٹوری کا پتہ تھا۔ میں ججی کے پاس سے اُٹھا تو میں نہ صرف کلثوم سے اظہار محبت بلکہ شادی تک کا فیصلہ کر چکا تھا۔

بہت سے قدیم پنجابی خاندانوں کی طرح ہمارے خاندان میں بھی لڑکے یا لڑکی کی پیدائش کے ساتھ ہی رشتہ طے کر دینے کی منحوس رسم چلی آ رہی تھی اور مجھے پتہ تھا کہ جب میری ماموں زاد گلزار بی بی، جسے

پیار سے سب گلو کہتے تھے، پیدا ہوئی تھی تو اُسے میرے لئے مانگ لیا گیا تھا۔ میرا ماموں احمد دین، ہمارے شہر سے کوئی چار سو میل دور رہتا تھا اور اُس کا ذکر میں آگے چل کر کروں گا، فی الحال اتنا بتا رہا ہوں کہ وہ شخص مجھے بوجوہ پسند نہیں تھا۔ اُن لوگوں سے ملنا جلنا بہت ہی کم ہوتا تھا تو میں نے آخری دفعہ گلو کو اُس وقت دیکھا تھا جب وہ کوئی بارہ تیرہ برس کی رہی ہوگی۔ کشمیری ہونے کے ناطے وہ گوری چٹی تو تھی مگر چہرے کے نقوش معمولی تھے۔ اگر چند لفظوں میں بات کی جائے تو اُسے حسین لڑکیوں میں شمار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ کلثوم سے شادی والی بات ہمارے گھر میں ایک قیامت کھڑی کر دے گی مگر کیا کیجئے کہ محبت چیز ہی ایسی ہے۔

میرے کالج واپس جانے میں ایک دن باقی تھا۔ میں پابندی سے صبح و شام ایک طویل وقت چھت پر گزارتا تھا مگر لگتا تھا کہ کلثوم کی ماں نے کپڑے دھونے ہی بند کر دیئے تھے کہ وہ اس دوران ایک مرتبہ بھی چھت پر کپڑے پھیلانے نہیں آئی۔ خط لکھنے کو ججی نے منع کر دیا تھا اور زبانی اظہار محبت کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ اُن دنوں میں بہت پریشان تھا۔ پریشانی کی ایسی ہی ایک سہ پہر جب کہ میں چھت پر بیٹھا ایک کتاب پڑھ رہا تھا، مجھے کلثوم کی چھت پر آہٹ محسوس ہوئی۔ میں کھڑا ہو گیا۔ بلا شبہ وہ کلثوم ہی تھی لیکن وہ اس وقت چھت پر کپڑے نہیں پھیلا رہی تھی بلکہ اپنے بھائیوں میں سے کسی کے پالے ہوئے کبوتروں کی چھتری کے نیچے کھڑی اُنہیں باجرہ ڈال رہی تھی اور ساتھ ہی منہ سے عجیب و غریب آوازیں بھی نکال رہی تھی۔ کبوتروں سے کلثوم کی محبت دیکھ کر لمحہ بھر کو میرا جی چاہا کہ کاش میں بھی کوئی کبوتر ہوتا لیکن یہ احمقانہ خیال تھا۔ کلثوم شاید ابھی ابھی نہا کر چھت پر آئی تھی کیونکہ اُس کے گیلے بال اُس کی پشت پر کھلے ہوئے تھے اور اُس کی قمیص پر پانی کے اُجلے نشانات صاف دِکھ رہے تھے۔ میں منڈیر کے قریب گیا اور میں نے کھنکھار کر کہا۔

''بڑے اچھے کبوتر ہیں؟'' کلثوم چونک کر گھومی اور جلدی سے دوپٹہ درست کرنے لگی۔ پھر وہ مسکرائی اور بولی۔

''ہاں یہ مجھے بھی اچھے لگتے ہیں مگر ان کا بہت خیال بھی رکھنا پڑتا ہے۔'' وہ غالباً اپنے ساتھ لایا ہوا سبھی باجرہ ختم کر چکی تھی تو اُس نے اپنی ہتھیلیاں جھاڑیں اور ایک مرتبہ پھر کبوتروں کی چھتری کو دیکھنے لگی۔ مجھے لگا جیسے اُسے میرا یہاں کھڑا ہونا اچھا لگ رہا تھا اور وہ تبھی اپنا کام ختم کرنے کے باوجود یہاں جمی ہوئی تھی۔ ہمارے درمیان خاموشی کا وقفہ طویل ہوا تو میں نے فیصلہ کیا کہ میں اپنے دل کی بات کہہ دوں۔ میں نے اُس کا نام لے کر اُسے پکارا تو وہ میری طرف گھومی اور مجھے دیکھنے لگی۔ میرا دل میری پسلیوں اور کبھی میرے حلق میں دھڑک رہا تھا۔ میں نے ہم دونوں کے درمیان حائل دیوار پر ہاتھ رکھا اور کہا۔

''کلثوم میں کل صبح اپنے کالج واپس چلا جاؤں گا لیکن میں جانے سے پہلے تم سے ایک بات کہنا

چاہتا ہوں۔'' میرا خیال تھا کہ وہ میری بات سننے کو قریب آئے گی لیکن ایسا نہ ہوا۔ وہ بس اپنی جگہ کھڑی ٹکر ٹکر مجھے دیکھتی رہی۔ میں نے دیوار کا سہارا لے کر کہا۔

''کلثوم بات یہ ہے کہ اُس دن جب میں نے تمہیں چھت پر کپڑے دھوپ میں پھیلاتے دیکھا تھا تو مجھے لگا تھا جیسے.....'' میری اتنی ہی بات سن کر کلثوم کے چہرے پر جیسے شفق سی جاگی اور اُس نے مسکرا کر مجھے دیکھا اور اُسی لمحے آنگن سے اُس کی ماں کی کراری آواز سنائی دی۔

''کلثوم! نی کلثومے!!''

لیکن اُس وقت شاید میرے چہرے پر بھی محبت کی ایک ایسی شفق اُتری ہوئی تھی جو کلثوم نے بھی پہلی بار ہی دیکھی تھی تو اُس نے اپنی ماں کی آواز پر بالکل بھی کان نہ دھرا اور سرگوشی کے انداز میں بولی۔

''کیسا لگا تھا تمہیں حامد باؤ؟'' میں ابھی اظہار محبت کے الفاظ ڈھونڈنے کے گورکھ دھندے میں اُلجھا ہی ہوا تھا کہ کلثوم کی ماں کی آواز پھر سنائی دی۔

''کدھر مر گئی ہے کوٹھے ٹپنی؟ یہ ہانڈی دیکھ ذرا۔ میں حاجی صاحب کے گھر جا رہی ہوں۔''

مگر کلثوم یہ جاننے کو بے چین تھی کہ میں کیا کہنا چاہتا تھا۔ اُس نے جلدی سے اپنا سوال دہرایا تو میں نے کہا۔

''کلثوم مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ کرو گی مجھ سے شادی؟''

میں نے شاید کلثوم پر اُس کی برداشت سے زیادہ بوجھ ڈال دیا تھا۔ مجھے لگا جیسے کلثوم ان لفظوں کے وزن تلے لڑکھڑا سی گئی ہو۔ اُس کی آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں، ہونٹ خشک تھے اور مجھے یوں بھی لگا جیسے وہ مجھے نہیں، میرے پیچھے کسی چیز کو دیکھ رہی ہو۔ اُس کی مسکراہٹ غائب تھی اور جب وہ بولی تو اُس کی آواز مانو صدیوں کا سفر طے کر کے اُس کے حلق سے نکلی۔

''مجھ سے محبت کرتے ہو؟ شادی کرو گے مجھ سے؟ سچ؟'' میں نے سچ ہی کہا تھا تو میں نے اثبات میں سر ہلا کر بلا تکلف قسم کھائی۔

''قسم قرآن پاک کی۔ میں سچ بول رہا ہوں۔''

تیسری مرتبہ کلثوم کی ماں کی آواز میں نے سنی تو وہ مجھے دُور سے آتی کوئی ایسی آواز لگی جس کی قطعاً پروا نہیں کی جاتی۔ جیسے رات گئے کوئی تانگہ سڑک سے ٹپ ٹپ کرتا گزر جاتا ہے تو کوئی بھی اُس پر دھیان نہیں دیتا۔ کلثوم قریب آئی اور اُس نے اپنا سرد ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ کر کہا۔

''رات کو جب سب سو جائیں گے تو میں چھت پر آ کر تمہیں اس سوال کا جواب دوں گی، ٹھیک؟''

پھر وہ میرا جواب سننے کو اس لئے نہیں رکی کہ سیڑھیوں پر کسی کے چڑھنے کی آواز آنے لگی تھی۔ میں جلدی سے اپنی چھت پر بیٹھ گیا اور دیر تک کلثوم کی ماں کی بک بک سنتا رہا۔

راتیں قدرے خنک تھیں اور اُن دنوں چوری کی ایک دو وارداتیں بھی ہوئی تھیں تو اماں نے مجھے بطور خاص تاکید کر رکھی تھی کہ میں زینے کا دروازہ بند کر کے اُس میں تالا لگاؤں اور چابی اپنے پاس رکھوں۔ میں نے کبھی اس ہدایت کی پروا نہیں کی تھی لیکن اُس رات جب میں کھانا کھا کر چھت پر اپنے کمرے میں سونے کے لئے آیا تو میں نے تالا لگا کر اس خطرے سے نجات حاصل کر لی کہ میرے گھر سے بھی کوئی چھت پر آ سکتا تھا۔

جوں جوں رات گہری ہوتی جا رہی تھی اور شہر سناٹے کی چادر تلے سوتا جا رہا تھا، مجھے دُور و قریب کی ہر آواز صاف سنائی دینے لگی تھی۔ پہلی آواز بشیرے زرگر کی تھی جو شراب پی کر نصف شب کے قریب گھر آتا اور پابندی سے اپنی بیوی کی ٹھکائی کیا کرتا تھا۔ یہ ہنگامہ آدھ پون گھنٹے تک چلتا تھا۔ پھر گلی سے نوازا تانگے بان اپنے گھوڑے کے ساتھ گزرتا تھا۔ تانگہ وہ بڑی سڑک پر کہیں کھڑا کرتا تھا۔ گھوڑے کے قدموں کی ٹپ ٹپ گلی میں گونجی تو میں سمجھ گیا کہ نوازا بھی اپنے گھر جا چکا تھا۔ چند لمحوں بعد محلے کے چوکیدار نے جاگتے رہو اور گھروں کے تھڑوں پر ڈنڈا بجانے کا شور مچایا تو میں نے گھڑی دیکھی۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ میں نے چھت والے کمرے میں بچھی اپنی چارپائی کا رخ تبدیل کر دیا تھا۔ اب کلثوم کی چھت پر کوئی بھی آتا تو مجھے بخوبی پتہ چل سکتا تھا۔ رات گزرتی رہی۔ چوکیدار شور مچاتا رہا لیکن کلثوم نہ آئی۔ میں نے اس دوران کوئی دس سگریٹ پھونک ڈالے تھے۔ میں مایوس ہو کر سونے ہی والا تھا کہ مجھے کلثوم کی چھت پر کسی کے چلنے کی آہٹ سنائی دی۔ میں سپرنگ لگے کسی کھلونے کی طرح اپنے بستر سے نکلا اور چھت پر چلا گیا۔ وہ کلثوم ہی تھی۔ اُس نے شاید کوئی تیز خوشبو بھی لگا رکھی تھی۔ میں ملگجی روشنی میں اُس کا سفید طباق سا چہرہ دیکھ سکتا تھا۔ وہ مجھے دیکھ چکی تھی تو وہ دیوار کے قریب آئی اور بولی۔

''مجھے دیر ہو گئی۔ ابا وظیفہ پڑھ رہے تھے۔ وہ، آج کل ہماری دکان ٹھیک نہیں چل رہی نا۔''

مجھے کلثوم کے چھت پر آنے کی بڑی خوشی تھی اور مجھے اُس کے باپ یا وظیفے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی تو میں نے اُس کے دیوار پر رکھے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''کوئی بات نہیں میری جان۔ ایسا ہی ہوتا ہے۔ ابے وظیفے پڑھتے رہتے ہیں اور اُن کی لڑکیاں عشق لڑاتی رہتی ہیں۔'' کلثوم مسکرائی تو نیم تاریکی میں مجھے اُس کے دانتوں کی قطار اچھی لگی۔ پھر وہ بولی۔

''بچپن سے تمہیں دیکھی آئی ہوں حامد باؤ۔ اچانک تم مجھے کیوں اچھے لگنے لگے؟'' میں کلثوم کو

فرائیڈ کا نظریہ سمجھا سکتا تھا اور نہ ہی بلوغت کے ہارمونز کے بارے میں کچھ بتا سکتا تھا تو میں نے کہا۔

''بس پیار ایسے ہی ہو جاتا ہے۔ اچانک۔ کبھی بھی۔ کہیں بھی اور ہمیں ایک دوسرے سے پیار ہو گیا ہے۔'' کلثوم سر جھکا کر چند لمحوں تک سوچتی رہی اور پھر سر اُٹھا کر بولی۔

''مگر میں نے سنا ہے کہ تمہاری بچپن سے کہیں منگنی طے ہو چکی ہے۔ مجھ سے شادی کرو گے تو وہ منگنی تو توڑنا پڑے گی، ہے نا؟'' یقیناً ایسا ہی تھا اور کلثوم کو پانے کے لئے مجھے یہی کرنا تھا۔ میں نے کہا۔

''میں تمہیں پانے کے لئے کچھ بھی کروں گا کلثوم۔ تم اس کی فکر مت کرو۔'' کلثوم کا سرد اور بے جان ہاتھ جیسے میری بات سن کر میرے ہاتھ کے نیچے انگڑائی لے کر بیدار ہوا اور اُس نے میرا ہاتھ گرمجوشی سے دبا کر کہا۔

''ہاں مجھے یقین ہے۔'' ہم دونوں وہاں اپنی اپنی چھت پر کھڑے عہد و پیماں کرتے رہے اور اور ہمارے سروں پر پھیلا تاروں کا اُفق تا اُفق پھیلا غبار دھندلا گیا۔

وہ ڈیڑھ سال ایسے گزرا کہ پتہ ہی نہ چلا۔ کلثوم اب مجھے کبھی کبھی میرے ہوسٹل کے پتے پر خط بھی لکھتی۔ چونکہ وہ صرف چار پانچ جماعتیں پڑھی ہوئی تھی اس لئے اُس کے خطوں میں شاعری واعری تو خاک بھی نہیں ہوتی تھی، بس خبریں ہوا کرتی تھیں جیسے بھائی کا لقہ کبوتر مر گیا، سوداں ماسی کے داماد کو جوئے کے الزام میں جیل ہو گئی، میری سہیلی رمن کور کی شادی ہو گئی وغیرہ۔ کچھ بھی تھا مجھے کلثوم کے خط پا کر بڑی خوشی ہوا کرتی تھی۔ میں جواب نہیں دے سکتا تھا کیونکہ ایسا کرنا محفوظ نہیں تھا۔ جب کبھی میں اپنے شہر چھٹیوں پر آتا، کلثوم وہ ساری راتیں میرے ساتھ چھت پر گزارا کرتی۔ ہم دونوں اپنی اپنی چھت پر گھنٹوں کھڑے باتیں کرتے رہتے۔ بس ایک مرتبہ میرے بے حد اصرار پر وہ میرے ساتھ کہیں باہر جانے کو تیار ہو گئی تھی۔ اُس زمانے میں فلم جگنو کی بڑی دھوم تھی تو میں نے کلثوم کو اپنے ساتھ جا کر یہ فلم دیکھنے پر بمشکل آمادہ کیا تھا۔ کلثوم کالے برقعے میں ملبوس ہو کر فلم دیکھنے گئی تھی اور اس کے ساتھ اُس کی ایک سہیلی بھی تھی۔ مجھے کباب میں یہ ہڈی اچھی نہیں لگی تھی مگر مجبوری یہ تھی کہ اسی سہیلی کے گھر جانے کا بہانہ کرنے کلثوم میرے ساتھ فلم دیکھنے گئی تھی۔

مئی کے آخری دن تھے جب مجھے ہوسٹل کے پتے پر کلثوم کا خط ملا۔ خط بہت مختصر تھا۔

''حامد باؤ۔ چھے تاریخ کو میری شادی ہو رہی ہے۔ کچھ کر سکتے ہو تو کر لو۔ مجھے یہاں سے نکال کر کہیں دُور لے جاؤ ورنہ میں مر جاؤں گی۔''

اُس کا خط مجھے چھ تاریخ کی دوپہر ملا تھا۔ میں نے آندھی طوفان کی طرح سفر کیا لیکن جب میں گلی میں پہنچا تو محلے کے لڑکے کلثوم کی ڈولی گھر کی ڈیوڑھی سے نکال رہے تھے۔

☆☆☆

اماں اور ابا میرے اس طرح اچانک گھر آنے پر حیران تھے لیکن میں نے اچانک پڑنے والی چند چھٹیوں کا بہانہ کر دیا۔ اماں کو میرے اس طرح آنے کی بڑی خوشی تھی اور میرے ابا ہمیشہ سے ایسے تھے کہ اُنہیں کبھی غم کے اظہار کا طریقہ آیا اور نہ خوشی پر کسی ردعمل کا۔ وہ اپنی سفید ہوتی مونچھوں کے نیچے اپنے ہر ردعمل کو چھپا لیا کرتے تھے۔ میرا جی کھانے کو چاہ رہا تھا نہ پینے کو مگر اماں نے رات کو زبردستی مجھے کچھ کھلا پلا دیا اور جب ابا دھوتی ٹانگوں کے بیچ دبا کر حقہ پینے کو بیٹھے تو اماں نے سامنے والی چارپائی پر بیٹھ کر کہا۔

''بڑا بوجھ ہوتی ہیں بیٹیاں۔ سراج علی کے شانے ہلکے ہو گئے آج اور تم لڑکی کا نصیب تو دیکھو۔ بیاہ کر دلی گئی ہے۔ سنا ہے لڑکے کے باپ کا کارخانہ ہے برتنوں کا اور دو دکانیں بھی ہیں۔ اللہ سب کی بچیوں کے نصیب اچھے کرے۔ میں تو کہتی ہوں سراج علی کی بیوی کی دعاؤں کا اثر ہے سب۔ بہت نیک لوگ ہیں''۔

ابا نے ایک طویل کش لے کر حقہ ایک طرف رکھا اور سر کی پشت پر دونوں ہاتھ باندھنے سے پہلے اچھی طرح کھنکھار کر کچے صحن کے گوشے میں تھوکا اور بولے۔

''اور دیکھو رشتہ کتنی جلدی طے ہوا؟ حیرت ہوتی ہے۔ تین دن میں لڑکی رخصت بھی ہو گئی۔ یعنی کہ کمال ہی ہو گیا بھئی!''

کلثوم کی شادی کے حوالے سے ابا نے میری شادی کا قصہ چھیڑا لیکن میں اس کے شروع ہوتے ہی چھت پر چلا گیا اور کلثوم کے بارے میں سوچتے ہوئے ٹہل ٹہل کر سگریٹ پھونکنے لگا۔ اُس نے لکھا تھا کہ اگر میں کچھ کر سکتا تھا تو مجھے کر لینا چاہئے تھا۔ وہ جانتی تھی کہ تین دن بعد رخصت ہونے والی لڑکی کو صرف اغوا ہی کیا جا سکتا تھا۔ اغوا تو میں نے ویسے ہی لکھ دیا۔ مطلب یہ ہے کہ وہ گھر سے میرے ساتھ فرار ہونے تک کو تیار تھی۔ میں جتنا سوچتا مجھ اپنے پر اُتنا ہی غصہ آتا لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ کلثوم جا چکی تھی اور اس وقت غالباً وہ ریل کے ڈبے میں کسی برتن بنانے اور بیچنے والے دکاندار کے ساتھ دلی کا سفر کر رہی تھی اور میں چھت پر ٹہل ٹہل کر سگریٹ پی رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ جب بھی کلثوم کبھی ملے گی میرے گلے لگ کر، پھوٹ پھوٹ کر ہماری محبت کے غم میں آنسو بہائے گی اور مجھ سے ایک بار پھر اپنے اغوا کرنے پر غور کرنے کو کہے گی۔

مگر میرا خیال غلط تھا۔

یہ اُس وقت کی بات ہے جب میں بی اے کا امتحان دے کر گھر واپس آ چکا تھا اور نتیجے کا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے پتہ چلا کہ کلثوم اپنی ماں کے گھر آئی ہوئی تھی۔ آتی تو وہ اس سے پہلے بھی رہی ہو گی لیکن چونکہ میں گھر پر نہیں ہوتا تھا تو اس سے میری کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اُس روز میں جیسے ہی چھت پر گیا، میں نے کلثوم کو دیکھا۔ اُس کا جسم قدرے بھاری ہو گیا تھا اور وہ ایک بچے کو گود میں لئے چھت پر ٹہلتے ہوئے اُس

سے پیار دلار کی باتیں توتلی زبان میں کر رہی تھی۔ میں بے دھڑک دونوں چھتوں کو جدا کرنے والی دیوار کے قریب چلا گیا اور میں نے اُسے پکارا۔ کلثوم نے مجھے چونک کر دیکھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کسی اور ردعمل کا اظہار کرتی، ایک گہرے سانولے رنگ کا آدمی جس کے آدھے سے زیادہ سر کے بال اُڑے ہوئے تھے اور جس نے لمبی لمبی قلمیں رکھی ہوئی تھیں، اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ پہلے سے چھت پر بچھی چارپائی پر بیٹھا یا لیٹا رہا ہو گا۔ آدمی کی آنکھوں میں میرے لئے پسندیدگی نہیں تھی اور میں خود بھی گھبرا گیا تھا۔ تب کلثوم نے بات سنبھالی اور بچے کو ایک سے دوسرے پہلو میں منتقل کرتے ہوئے قریب آ کر بولی۔

''کیسے ہو حامد بھائی؟''

مجھے یہ انداز تخاطب ذرا پسند نہ آیا لیکن لمبی قلموں والے آدمی کے چہرے کے کسے ہو عضلات کچھ ڈھیلے پڑتے میں دیکھ سکتا تھا۔ پھر وہ اُس آدمی سے مخاطب ہوئی۔

''یہ حامد بھائی ہیں۔ ہم بچپن سے ساتھ کھیل کے بڑے ہوئے ہیں۔ یہ کالج میں پڑھتے ہیں۔''

آدمی نے انتہائی بدتمیزی سے اپنے خصیے کھجائے، یہ کام سرانجام دینے والی اُنگلیوں پر نجانے کیوں پھونک ماری اور بے تکلفی سے بولا۔

''اماں! پھر تو یہ اپنے سالے صاب ہوئے؟ ہے نا؟''

اپنی بات پر وہ خود ہی ہنسا تو میرا جی چاہا کہ جس جگہ سے دونوں چھتوں کو ملانے والی دیوار قدرے ٹوٹی ہوئی تھی، اُس میں سے ایک اینٹ نکال کر اُس کے سر پر مار دوں لیکن وہ ایسا کرنے کا موقع نہیں تھا چنانچہ میں زبردستی مسکرا کر رہ گیا۔ کلثوم اب اپنے خاوند کے عقب میں کھڑی تھی۔ وہ بچے کو بہلانے کی خاطر اپنے جسم کو مسلسل ہلا رہی تھی اور کبھی کبھی بچے سے سمجھ میں نہ آنے والی زبان میں باتیں بھی کرتی تھی۔ کلثوم کا خاوند قریب آیا اور اُس نے اُس پان کے بچے کھچے اجزا، جو وہ چبا رہا تھا، اپنی لپ لپاتی زبان سے یکجا کر کے، منہ موڑ کر گلی میں تھوکے اور مسکرا کر بولا۔

''اماں کبھی دیکھی ہے دلی؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ دراصل میں اس آدمی سے زیادہ بات ہی نہیں کرنا چاہتا تھا اور فوراً سیڑھیاں اُتر کر گھر کے اندر چلا جانا چاہتا تھا۔ وہ ہنسا اور بولا۔

''اماں دلی نئیں دیکھی تو پھر تم نے کیا دیکھا؟ کبھی آؤ دلی۔ عیش کروا دیں گے قسم قران مجید کی''۔

میرے کوئی جواب دینے سے پہلے کلثوم کا چھوٹا بھائی اُنہیں یہ اطلاع دینے چھت پر آ گیا کہ کھانا تیار ہو گیا تھا اور اُن کا انتظار ہو رہا تھا۔ کلثوم کا خاوند یہ اطلاع ملتے ہی مجھ سے کسی بھی قسم کے رخصتی کلمات

کہے بغیر، کلثوم کے بھائی کے ساتھ چھت سے نیچے اُتر گیا۔ اب میں اور کلثوم چھت پر تنہا تھے۔ میں نے محسوس کیا جیسے کلثوم کسی قسم کی بے چینی کا شکار تھی۔ میں نے کہا۔

''اس اُلو کے پٹھے سے تمہاری شادی ہوئی ہے؟ اسے بات کرنے کی تمیز تک نہیں ہے''۔

میرا خیال تھا کہ کلثوم مجھ سے اتفاق کرے گی لیکن میری بات سن کر اُس کی تیوری چڑھ گئی اور وہ تلخ لہجے میں بولی۔

''کیوں؟ کیا خرابی ہے اُن میں؟ اچھے بھلے تو ہیں؟''

میں کلثوم کی بات سن کر لمحے بھر کو جیسے سُن رہ گیا۔ مجھے اُس لڑکی سے اس جواب کی اُمید نہیں تھی جس نے اپنی شادی سے پہلے مجھے خط لکھ کر خود کو بھگا لے جانے کی تجویز دی تھی اور جس کی جدائی کا داغ میرے دل سے کسی طرح جاتا ہی نہ تھا۔ وہ مجھ سے اس طرح بات کرے گی، یہ بات دور دور تک میرے گمان میں نہ تھی۔ میں نے کہا۔

''کلثوم، تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ یہ میں ہوں۔ حامد۔ تم سب بھول گئیں اتنی جلدی؟''

کلثوم نے ایک نظر چھت سے نیچے جانے والے راستے کو دیکھا اور مزید تلخی سے بولی۔

''کیا تھا ہمارے بیچ؟ میری اپنی حماقت اور کچھ بھی نہیں۔ دیکھو اب میں شادی شدہ ہوں۔ ایک بچے کی ماں ہوں۔ میں اب یہ سب نہیں کر سکتی۔ حامد تم اچھے لڑکے ہو۔ کہیں شادی وادی کر لو۔ شادی کے بعد سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔ میں چلوں اب؟''

وہ مجھے اپنے اس تجربے میں شامل کر کے کہ شادی کے بعد سب ٹھیک ہو جاتا ہے، اپنے بچے کو بہلاتی ہوئی چھت سے نیچے اُتر گئی۔ میں وہیں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ میں شاید کچھ دیر اور کھڑا رہتا لیکن اماں نے مجھے آوازیں دینا شروع کر دیں اور میں نیچے صحن میں چلا گیا جہاں اماں اور ابا کھانے پر میرا انتظار کر رہے تھے۔

اب جبکہ میں بی اے کا امتحان دے چکا تھا اور مجھے کامیابی کی پوری اُمید تھی بلکہ بہت اچھی ڈویژن کی اُمید تھی اور اس کے بعد پی ڈبلو ڈی میں نوکری کی بھی، جس کا بندوبست ابا جی نے پہلے ہی کر رکھا تھا تو اماں میری اور گلزار بی بی عرف گلو کی شادی فوراً کر دینا چاہتی تھیں۔

میں ابھی ابھی چھت پر سے محبت کا ایک نیا چرکا دل پر لگوا کر نیچے اُترا تھا اور مجھے کسی پل چین نہیں تھا تو مجھے یہ موضوع بالکل بھی اچھا نہیں لگا۔ میں نے دو چار لقمے زہر مار کئے اور گھر سے باہر نکل آیا۔ اُس وقت میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے؟ ہنسنا چاہئے، رونا چاہئے یا پھر چپ چاپ یونہی چلتے رہنا چاہئے جیسے میں اس وقت چل رہا تھا۔ یہ تو میری سمجھ میں اُس وقت آیا جب میں باغ کی ایک پتھریلی بنچ

پر بیٹھ کر سگریٹ سلگا چکا کہ مجھے رونا چاہئے۔ چنانچہ میں سر جھکا کر روتا رہا۔ دن کے اس وقت باغ میں اکا دکا لوگ ہی دکھائی دیتے تھے اور اس وقت اتفاق سے وہ بھی نہیں تھے تو میں اطمینان سے روتا رہا۔ اُس وقت تک رویا جب تک میری آنکھیں خشک نہ ہو گئیں اور بس وہ ایک آدھ سسکی میرے وجود میں باقی نہ رہ گئی جو میرے جسم کو کبھی کبھی ہلا دیتی تھی۔

رونے سے مجھے بہت سکون ملا۔ اب میں سوچتا ہوں کہ اگر میں کلثوم کے شادی والے دن اس سے آدھا بھی رو لیا ہوتا تو یہ تین برس اتنی بے قراری میں نہ گزرتے۔ اب جبکہ یہ طے ہو گیا تھا کہ میری محبوبہ میری زندگی سے ہمیشہ کے لئے جا چکی تھی، اطمینان کی ایک لہر دل کی پھانس کی چبھن کو کم کرتی محسوس ہو رہی تھی۔

جب میں گھر سے نکلا تھا تو مجھے لگ رہا تھا جیسے میرے شانوں پر ایک بوجھ تھا، ایک ایسا بوجھ جسے لئے چلنا میرے لئے ناممکن تھا لیکن اس تھوڑی دیر کے رونے نے اس بوجھ کو میرے شانوں سے اُٹھا کر مجھے اتنا سبک کر دیا تھا کہ مجھے حیرت ہو رہی تھی۔ پھر میں نے اپنی اور کلثوم کی محبت کا تجزیہ کیا تو مجھے لگا جیسے وہ سب میری حماقت تھی لیکن یہ سوچنا مجھے ذرا بھی اچھا نہ لگا۔ اگر وہ میری حماقت تھی تو میں اتنے برسوں اُس حماقت کے ساتھ جیتا رہا؟ مجھے بڑا عجیب سا لگ رہا تھا۔ میں ماہر نفسیات نہیں ہوں اور نہ ہی مجھے زندگی کے بارے میں اُس وقت اتنا پتہ تھا لیکن مجھے بار بار لگ رہا تھا کہ میری اور کلثوم کی محبت کے بیچ کچھ ایسا ضرور تھا جسے ہم دونوں نہ سمجھ سکے یا کم از کم میں تو بالکل بھی نہ سمجھ سکا۔ میں بیٹھا رہا، اُلجھتا رہا اور سگریٹ پھونکتا رہا۔ جب سورج مغربی پیڑوں کے پیچھے دھیرے دھیرے چھپنے لگا تو میں وہاں سے اُٹھا اور یونہی ایک طرف چل دیا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ مجھے کدھر جانا تھا لیکن میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ میں جیرے کے ہوٹل کے سامنے کھڑا تھا۔

جون کا مہینہ شروع ہو گیا تھا تو جیرے کے ہوٹل کی بنچیں آدھی گلی تک پھیلی ہوئی تھیں۔ جیرا اپنے مٹی کے چبوترے پر کھڑا حسب دستور نصیحتوں میں ملی گالیاں یا گالیوں سے بھرپور نصیحتوں کا پنڈارا اپنے دونوں ملازموں پر کھولے کھڑا تھا۔ اُس نے مسکرا کر میرا استقبال کیا اور بولا۔

''میں نے سنا ہے اب پکے پکے آ گئے ہو؟ نوکری ملنی بڑی مشکل ہے آج کل اور یہ سب اُس ہٹلر کی انگریزوں سے جنگ کی وجہ سے ہوا ہے اور اس میں ان ماں یاوے سیاسیوں کا بھی ہاتھ ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ یہ مسلم لیگ اور کانگریس اور یہ انگریز جائیں اپنی.....''۔

وہ دیر تک پتہ نہیں کیا کیا بکتا جھکتا رہا۔ میں ہوٹل میں داخل ہوا تو کسی دوسرے شہر سے آیا ہوا کوئی شاعر، جسے میں نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا ترنم سے اپنا کلام پڑھ رہا تھا۔ حاضرین میں مجھے ججی بھی دکھائی دیا۔ ججی کے بالوں کو دیکھ کر مجھے لگا جیسے وہ بہت دنوں سے نہایا نہ ہو۔ ہم دونوں ہوٹل سے باہر بچھی کرسیوں

پر جا بیٹھے۔ جیرے کے ہوٹل پر اُس وقت اُس زمانے کا مقبول گیت یہاں بدلہ وفا کا بے وفائی کے سوا کیا ہے، چل رہا تھا۔ مجھے لگا جیسے یہ گانا کسی نے میری محبت کی ناکامی کو سامنے رکھ کر لکھا ہو۔ ججی نے بتایا کہ وہ مسلم لیگ میں شامل ہو گیا تھا۔ سگریٹ کی راکھ طشتری میں جھاڑ کر اُس نے کہا۔

''انگریز جا رہا ہے اور یہ ہندو اب اس ملک میں مسلمانوں کا جینا حرام کر دیں گے۔ جناح صاحب ٹھیک کہتے ہیں۔ ہمیں پاکستان بنانا ہی پڑے گا''۔

میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مجھے اُس وقت ہندوستان، پاکستان، جناح صاحب یا ہندوؤں اور انگریزوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ بھلا تین چار گھنٹے پہلے جس آدمی کے سینے پر اُس کی محبوبہ آرے چلا چکی ہو اور ایک گنجے، بدتمیز اور صورت سے منحوس لگنے والے اپنے شوہر کی تعریف بھی کر چکی ہو، اُسے کسی سیاست سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ میں نے کہا۔

''ججی یار میری طرف سے یہ سب جائیں جہنم میں۔ کلثوم نے مجھے ٹھکرا دیا ہے۔ میں ہمیشہ یہ سوچتا تھا کہ جب میری تعلیم مکمل ہو جائے گی تو میں کسی بھی طریقے سے اُس سے شادی کروں گا چاہے اس کے لئے مجھے اپنی جان ہی کیوں نہ دینی پڑے''۔

ججی نے ایک طویل سانس لی جو مجھے اُس وقت ایسی آہ لگی جو کسی عاشق کے سینے سے ہی نکل سکتی تھی لیکن وہ آہ نہیں تھی، طویل سانس ہی تھی۔ اُس نے ایک کش لیا اور آدھے سگریٹ کو گھورتے ہوئے بولا۔

''دیکھ یار۔ میرا تجربہ کہتا ہے کہ کوئی لڑکی بے وفا نہیں ہوتی۔ مرد البتہ بے وفا ہوتے ہیں۔ لڑکیاں مجبور ہوتی ہیں اور کلثوم نے جو بھی کہا وہ کسی مجبوری کے تحت ہی کہا''۔

یہ فلسفہ میری سمجھ سے بالا تھا تو میں نے تلخی سے کہا۔

''کیسی مجبوری؟ شادی والی؟ بچے والی؟ وہ ذرا سا حوصلہ کرتی تو میں اُسے بچے سمیت قبول کر لیتا''۔

ججی نے میرا ہاتھ تھپکا اور مسکرا کر بولا۔

''مردوں میں بڑی خرابی یہ ہے کہ وہ اپنے بارے میں ہی سوچتے ہیں۔ یار اُس کے ساتھ پورا خاندان ہے۔ اُس کی عزت ہے۔ لوگوں کی باتیں ہیں۔ دراصل تُو ان احمقوں میں سے ہے جن کو محبت کرنے آداب ہی نہیں آتے۔ اب دیکھ سوسن کو۔ جب اُس نے ہر راستہ بند پایا تو اپنے والدین کو بدنام نہیں کیا، موت کو گلے لگا لیا، مگر سوسن جیسے لڑکیاں روز روز پیدا نہیں ہوتیں''۔

میں ججی کے پاس اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے آیا تھا مگر اُس نے اپنا قصہ چھیڑ دیا۔ میں بدمزہ ہو کر وہاں سے اُٹھا اور گھر چلا آیا۔ کھانے کے بعد اماں پھر وہی کہانی لیکر بیٹھ گئیں کہ اب چونکہ میری تعلیم ختم ہو چکی

تھی تو مجھے فوراً گلزار بی بی سے شادی کر لینی چاہئے تھی۔

''وہ کتنی مرتبہ مجھ سے اشاروں اشاروں میں پوچھ چکے ہیں''۔

اماں نے یہ بات رازداری سے کہی حالانکہ اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اباجی نے حقے کا ایک لمبا کش لگایا اور سنبھل کر بیٹھتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

''پھر تیرا کیا پروگرام ہے کاکا؟''

کلثوم سے ملاقات اور اُس کی بے اعتنائی کے بعد میرا کوئی بھی پروگرام نہیں تھا، میں نے کہا۔

''اباجی میں آگے پڑھنا چاہتا ہوں''۔

چودہ جماعتوں یعنی بی اے کے بعد بھی کوئی پڑھائی ہوتی تھی، یہ بات اباجی کو تو پتہ تھی مگر اماں نے اُسی وقت مجھ سے سنا تھا چنانچہ اُنہوں نے شہادت کی اُنگلی اپنے ہونٹوں پر رکھ کر حیرت سے کہا۔

''ہا، ہئے! چوداں جماعتوں کے بعد کون سی پڑھائی ہوتی ہے بھلا؟''

اماں جی نے اپنی بات کی تائید کی اُمید میں اباکو دیکھا۔ وہ مسکرائے اور اپنے چہرے پر ایسی مسکراہٹ طاری کر کے، جس سے اماں کی جہالت اور کم علمی پر افسوس کا اظہار بھی ہو رہا تھا، بولے۔

''اوئے ہوتی ہے اس کے بعد بھی ایک پڑھائی۔ تُو ان باتوں کو نہیں سمجھے گی۔'' اماں تڑخ کر بولیں۔

''میں بس ایک ہی بات سمجھتی ہوں کہ احمد دین نے لڑکی کو ہمارے آسرے پر بٹھا رکھا ہے۔ جب وہ پیدا ہوئی تھی تو ہم نے اُسے مانگا تھا۔ اب یہ ہماری ذمہ داری بنتی ہے کہ اپنی بات پر قائم رہیں''۔

اماں کا اصرار بڑھتا جا رہا تھا۔ میں کھڑا ہوا اور میں نے کہا۔

''اماں کہا نا میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتا۔ جب کرنی ہوگی بتا دوں گا'' مگر اباجی اب پوری طرح اماں کے ہمنوا بن کر بولے۔

''جب کرنی ہوگی کا کیا مطلب ہے اوئے؟ مجھ سے زیادہ بکواس مت کرنا۔ تیری عمر میں تو میں دو بچوں کا باپ بن گیا تھا'' یہ بات غالباً اماں کو پسند نہیں آئی تو اُنہوں نے اباجی کو ڈانٹا۔

''فضول باتیں مت کرو۔ کام کی بات کرو'' شاید اس فخر نے کہ وہ میری عمر میں دو بچوں کے باپ بن گئے تھے، اباجی کو قدرے لاپروا کر دیا تھا تو وہ بولے۔

''نہیں ہے یہ سچ؟''

اماں جی کھڑی ہوئیں اور برامدے میں رکھے چولہے کی طرف دیکھ کر بولیں۔

''میں دودھ چھینکے میں رکھ کر آتی ہوں مگر سن لو۔ آج اس کا فیصلہ ہو کر رہے گا''۔

یہ بڑی مشکل صورت حال تھی۔ میری ماں بہت سادہ اور انتہائی نرم خُو عورت تھیں مگر جب کسی بات پر اڑ جاتی تھیں تو پھر اپنی منوا کر ہی چھوڑتی تھیں۔ یہ میں بھی جانتا تھا اور ابا جی بھی۔ ابا جی نے اشارہ کیا اور میں پھر بیٹھ گیا۔ مجھے اس گفتگو سے شدید اُلجھن ہو رہی تھی۔ اماں اپنا کام ختم کر کے اور دوپٹے کے پلو سے ہاتھ خشک کرتی ایک مرتبہ پھر ہمارے قریب آئیں اور بولیں۔

''موسم ذرا ٹھیک ہو تو میں کوئی تاریخ مانگ لیتی ہوں۔ ٹھیک ہے نا؟'' ابا جی نے شد و مد سے اثبات میں سر ہلایا اور حقے کی چلم اُٹھا کر اُس کی راکھ میں پھونکیں مارتے ہوئے بولے۔

''یہ کیسا بھینچو تما کو ہے۔ دو دم لگانے سے ہی ختم ہو جاتا ہے'' پھر جب چلم کے تہہ میں پڑی تمبا کو خوب روشن ہو گئی تو اُنہوں نے دو تین بھرپور کش لگائے اور اماں سے مخاطب ہوئے۔

''اور اچھی طرح سن لے۔ ولیمہ کا کھانا مشتاق پکائے گا۔'' یہ بات اماں سے یہ یوں کہی گئی تھی کہ اماں کا ایک دور پار کا بھائی خلیل بھی باورچیوں والا کام کرتا تھا اور ابا جی اُسے پسند نہیں کرتے تھے۔ اماں نے تلخی سے کہا۔

''کیوں پکائے گا مشتاق؟ خلیل مر گیا ہے کیا؟ ہر بات میں اپنی مرضی چلانے کی کوشش مت کیا کرو۔''

اب موضوع تبدیل ہو گیا تھا۔ میں اُٹھا تو اماں یا ابا میں سے کسی نے مجھ سے تعرض نہیں کیا کیونکہ مشتاق یا خلیل کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے وہ غالباً میری شادی گلزار سے اپنی پسند کی تاریخوں میں کرنا طے کر چکے تھے۔

میں دیر تک چھت پر ٹہلتا اور سگریٹ پیتا رہا۔ پھر میں نے تصور میں کلثوم کے لمبی قلموں اور گنجے سر والے میاں کو اُس کے ساتھ خرمستیاں کرتے دیکھا تو میرے بدن میں آگ لگ گئی۔ میرا جی چاہا کہ ہماری چھتوں کو جدا کرنے والی یہ دیوار پھاند کر کلثوم کے گھر کے زینے سے اُتر کر اُس کے کمرے میں جاؤں اور اُس کے شوہر کے پیٹ میں چھرا گھونپ دوں۔

مجھے اس صورت حال سے باہر آنے میں کافی وقت لگا۔ میں اُن دنوں کچھ نہیں کر رہا تھا صبح شام جیرے کے ہوٹل پر بیٹھا اُداس کر دینے والے فلمی گیت سنتا اور چائے کی پیالیاں خالی کرتا رہتا یا پھر وہاں ہر روز بیٹھنے والے شاعروں ادیبوں کی باتیں سنتا اور سیاست پر اُن کے تجزیوں پر حیرت کرتا رہتا۔ سیاسی ماحول جب زیادہ گرم ہوتا تو اُن میں سے کئی ایک دوسرے کے سر کھولنے پر اُتر آتے۔

''میں کہتا ہوں تمہارا جناح انگریزوں کا ایجنٹ ہے۔''

''بکواس بند کرو۔ گاندھی نے جنگ میں انگریزوں کا ساتھ دینے کی بات کی ہے۔ ایک نمبر فراڈ

ہے یہ آدمی۔''

''یہ مولانا آزاد کہیں مل جائے تو میں.....''

''مان لیا بن گیا پاکستان۔ بٹ گیا ہندوستان۔ اب کروڑوں مسلمان اِدھر رہتے ہیں۔ اُدھر اتنی جگہ ہو گی تمہارے پاکستان میں؟''

''اب کسی دلے نے جناح صاحب کو کچھ کہا تو میں اُس کی.....''

ایک مرتبہ یہ ہجوم چیختا چلاتا گلی میں آ گیا۔ بات بڑھ گئی۔ لوگوں نے ہوٹل سے سوڈا واٹر کی بوتلیں اُٹھا کر ایک دوسرے پر چلا دیں۔ معاملہ تھانے تک گیا مگر چونکہ سبھی ایک ہی محلے کے تھے تو بات وہیں ختم کروا دی گئی۔ اس واقعے کے بعد جیرے نے کاؤنٹر کے عقب میں، دیوار پر، جہاں ہوٹل میں نشہ کر کے آنا منع ہے اور بڑے نوٹ والے حضرات پہلے کاؤنٹر سے معلوم کریں، لکھوایا تھا وہیں یہ بھی لکھوا دیا کہ ہوٹل ہٰذا میں سیاسی گفتگو کرنا منع ہے۔ لیکن کون ایسی تحریر کو خاطر میں لاتا تھا چنانچہ یہ بحثیں ایک آدھ دن کے وقفے کے بعد دوبارہ جاری ہو گئیں۔

خلش کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے باجود شملہ کے کسی فوجی دفتر میں کلرکی کر رہا تھا۔ اُس نے یہ ملازمت اس اُمید پر قبول کی تھی کہ وقت گزرنے کے ساتھ کچھ ترقی بھی مل جائے گی مگر وہاں اُس بیچارے کے گرد سازشوں کا وہ جال بُنا گیا کہ ملازمت چھٹے سال میں داخل ہو گئی تھی مگر وہ کلرک کا کلرک ہی تھا۔ باپ پہلے ہی مر چکا تھا اور بوڑھی ماں گزشتہ برس اُس کی شادی کی حسرت لئے دنیا سے جا چکی تھی۔ خلش سیاست میں کھلم کھلا دلچسپی نہیں لے سکتا تھا کہ سرکاری ملازم تھا لیکن جب بھی وہ چھٹیوں پر اپنے شہر آتا، جیرے کے ہوٹل پر بیٹھ کر دل کے پھپھولے پھوڑتا۔

''مسلم لیگ بہت اچھا کر رہی ہے جو پاکستان بنوا رہی ہے۔ میں کہتا ہوں اگر ایسا نہ ہوا تو انگریزوں کے جانے کے بعد یہ سالے ہندو یہاں ہمارا جینا دُوبھر کر دیں گے۔ تم دیکھ لو، ذرا سا موقعہ ملا ہے تو انہوں نے مسلمانوں کا ناطقہ بند کر دیا ہے۔ کھل کر کھیلنے کا وقت آئے گا تو یہ کیا نہیں کریں گے؟''

میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ وہاں اگر پاکستان کے حامی موجود تھے تو مخالفین کی بھی کمی نہیں تھی۔ انہی مخالفین میں ایک گوگی بٹ بھی تھا۔ گوگی کا نام تو پتہ نہیں کیا لیکن وہ اسی عرفیت سے پہچانا جاتا تھا۔ وہ پکا کانگریسی تھا اور گاندھی جی کا معتقد بھی۔ وہ گرج کر کہتا۔

''بکواس بند کراوئے۔ ہندوستان سے انگریزوں کے جانے بعد کیا مسلمان کُھسرے ہو جائیں گے کہ کسی بھینچو کے ظلم پر خاموش رہیں گے۔ ہم صدیوں سے ہندوستانی ہیں۔ ہم دیکھیں گے کہ کوئی دلا

ہمارے ساتھ کیسے ظلم کرتا ہے؟ پاکستان بننے سے تم مسلمانوں کی طاقت دوملکوں میں بانٹ دو گے (اُس وقت بنگلہ دیش نہیں بنا تھا ورنہ وہ تین ملک کہتا)، یہی نہیں یہاں سے پڑھے لکھے مسلمان اگر پاکستان چلے گئے تو میرے جیسے مسلمانوں کا کیا بنے گا کیوں کہ میں کبھی پاکستان نہیں جاؤں گا اور میری طرح کے کروڑوں دوسرے بھی۔اب بول کیا کہتا ہے؟''

جیرا جو اس گفتگو کو بہت غور سے سن رہا ہوتا، اپنی جگہ چھوڑتا اور وہیں آن کر بیٹھ جاتا جہاں یہ گفتگو جاری ہوتی اور دونوں ہاتھ اپنی دھوتی سے پونچھ کر بولتا۔

''میں کہتا ہوں یہ انگریز بہت بڑے دلے ہیں۔انہوں نے لڑوا دیا ہے ہندوؤں اور مسلمانوں کو۔ان کے جانے کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا۔یار یہ پاکستان والا چکر پتہ نہیں کیوں چلا دیا تمہارے جناح صاحب نے؟''

خلش بوجوہ جیرے سے بگاڑنا نہیں چاہتا تھا۔اس،،بوجوہ،، کا اہم نکتہ اُس کی رشتے کی ایک خالہ تھی جس سے جیرے نے شادی کر رکھی تھی اور وہ جیرے کو اپنے بزرگوں میں شمار کرتا تھا۔پھر بھی وہ ایک صلح آمیز لہجے میں کہتا۔

''یہ بہت اُوپر کی سیاست ہے،تم ابھی نہیں سمجھو گے۔یہ ہندو انگریزوں کے جانے کے بعد ہمیں کچا چبا جائیں گے۔تم دیکھ لینا۔''

پھر وہ کانگریسی حکومتوں کے دوران ہونے والی اُن زیادتیوں کا مفصل تذکرہ کرتا جن میں مسلمانوں کے ساتھ ترجیحی سلوک کے ترتیب وار حوالے ہوتے۔جیرا سیاسی آدمی نہیں تھا۔وہ تو اخبار بھی پڑھوا کر سنا کرتا تھا لیکن بہر حال مسلمان تھا۔وہ خلش کی باتوں سے بتدریج متفق ہوتا جاتا۔مخالف پارٹی جب دیکھتی تو اپنے زور دار دلائل دیتی تو وہ ان ''میری طرف سے تمہارے ہندو، مسلمان، انگریز سب جائیں.....'' اس پر ایک قہقہہ بلند ہوتا اور بات آئی گئی ہو جاتی۔

میں نے بہت بعد میں تجزیہ کیا تو مجھے علم ہوا کہ پاکستان کے حوالے سے مسلمانوں میں ایک وقتی جوش اور جذبہ ضرور تھا۔وہ ایسے اسلامی نظام کے قیام کے خواہاں تھے جس کے بارے میں اُنہوں نے فقط سنا تھا یا کتابوں میں پڑھا تھا۔ہندوستانی مولویوں نے برصغیری مسلمانوں کو ہمیشہ اسلام کا،،عرب ورژن،، ہی دکھایا تھا۔مذہب کے حوالے سے اعتقاد اور ایمان ایک علیحدہ بات ہے اور کسی بھی ملک کا کلچر اور تہذیب ایک بالکل الگ موضوع۔ہندوستان میں ایک عورت کے لئے نقاب لگا کر گھر کی چار دیواری میں رہ کر گھریلو کام کاج اور بچے پیدا کرنے کے بعد ذمہ داریاں ختم ہونے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا اور نہ ہی آج

پاکستان میں یہ ممکن ہے۔عورت مرد کے ساتھ برابر کی کھیت مزدور ہوتی تھی اور ہوتی ہے۔وہ ایک بڑا سا برقعہ اوڑھ کر یا طویل چادر میں خود کو چھپا کر پانی کے تین گھڑے سر پر اور ایک پہلو پر رکھ کر ہندوستانی مولویوں کا اسلامی تصور کسی صورت حقیقت میں نہیں ڈھال سکتی تھی۔تب بھی اور اب بھی۔عورت کے کھیت سے پیداواری عمل سے نکل جانے کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا کہ پیداوار گھٹ کر اُس حد تک پہنچ جائے جہاں سے فاقوں کی عملداری شروع ہوتی ہے۔

جس زمانے میں پاکستان والا غلغلہ مچا تھا، غیر منقسم ہندوستان میں بات صرف ایک مطالبے پر ختم ہوتی تھی کہ ہمیں ہندوستان میں سے ہمارا حصہ دو۔جذبات ہمیشہ سوچ پر روک لگاتے ہیں۔جذبات نے سوچ پر روک لگائی اور بات صرف اور صرف مطالبہ پاکستان پر اٹک کر رہ گئی۔اس کے بعد کیا ہونا ہے، یہ کسی نے نہ سوچا اور نتیجتاً وہ حالات پیدا ہوئے جنہوں نے پچیس برس کے اندر اندر اس ملک کا ایک بازو توڑ دیا اور ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ ملکی بقا ہمیشہ خطرے میں رہنے لگی اور سیاستدانوں کا پسندیدہ بیان سننا کوئی چونکانے دینے والی بات نہ رہی کہ ملک خطرے میں ہے!

میری توقع تو فرسٹ کی تھی لیکن میں نے بی اے کا امتحان سیکنڈ ڈویژن میں پاس کر لیا۔اُسی زمانے میں میری زندگی کا ایک خوش گوار ترین واقعہ پیش آیا۔میری منگیتر گلزار بی بی نے کہیں عشق کر لیا اور ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ میرے ماموں کو اُس کی شادی اُس کے عاشق سے کرنا پڑ گئی۔

ایک دن میں سارا دن کی آوارہ گردی کر کے جب گھر لوٹا اور کھانا کھا کے چھت پر جا کر سونے کی تیاری کرنے لگا تو صحن میں حقہ پیتے میرے ابا جی نے کھنکھار کر ایک کیاری میں تھوکا اور بولے۔

''اوئے کاکا تیرے پاس کوئی ڈھنگ کا پتلون کوٹ ہے؟ کل تجھے 'اِلٹر ویو' کے لئے جانا ہے۔'' ابا جی انٹرویو کو ہمیشہ 'الٹرویو' بولتے تھے۔

میں وہیں رک گیا کیونکہ میں نے کسی بھی جگہ نوکری کے لئے ابھی تک یوں درخواست نہیں دی تھی کہ جنگ کی وجہ سے سرکاری بھرتیوں پر جو پابندی تھی وہ برقرار تھی اور اُس دور میں کسی کو نوکری مل جانا ایک معجزہ سے کم نہ تھا۔میں نے کہا۔

''انٹرویو؟ کہاں؟'' ابا جی مسکرائے اور حقے کی نَے سے اپنی مونچھوں کو اُوپر کر کے بولے۔

''اصغر علی نے بلوایا ہے اپنے دفتر میں۔''

میں اصغر علی کو جانتا تھا۔وہ ابا جی کے واحد دوست تھے جن سے اماں پردہ نہیں کرتی تھیں۔سنا تھا ابا جی جب کبھی دو چار سال کے لئے سکول گئے تھے تو وہ ابا جی کے ہم جماعت تھے۔تب مجھے یاد آیا کہ ابا جی مجھ

سے ہمیشہ کہتے تھے کہ میں بی اے کا امتحان پاس کرلوں تو پی ڈبلوڈی میں میری نوکری میرا انتظار کررہی ہے۔

میں نے جھجک کر کہا۔

''مگر میں آگے پڑھنا چاہتا ہوں۔'' چونکہ میری ماں کو ابھی تک شبہ تھا کہ بی اے کے بعد کوئی پڑھائی نہیں ہوتی تھی تو اُنہوں نے برتن دھوتے ہوئے وہیں سے آواز لگائی۔

''ہو چکی پڑھائی۔اب سیدھی طرح نوکری کر۔تیرے ساتھ کے دو دو بچوں کے باپ بھی بن گئے۔ہم بھی اولاد کی خوشیاں دیکھیں۔''

اولاد کی خوشیاں سے مراد میری شادی اور بعدازاں ڈھیر سارے بچے تھے۔میں نے کہا۔

''اماں،بس مجھے دو سال اور دے دو۔پھر میں.....'' اس مرتبہ اباجی بولے اور سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے بولے۔

''بس بہت ہو گیا۔اب کوئی پڑھائی نہیں ہوگی۔کل کوٹ پتلون پہن کر گیارہ بجے تک اصغر علی کے دفتر پہنچ جانا۔وہاں کوئی ماں یا وہ گورا تجھ سے اِلٹر ویو کرے گا۔سب سوالوں کے ٹھیک ٹھیک جواب دینا۔اصغر علی نے کہا ہے ایک سو پچیس روپے تنخواہ ہے اور دس روپیہ سال کے حساب سے ترقی۔میں کہتا ہوں ایک سو پچیس روپے تھوڑے نہیں ہوتے۔''

اباجی نے اپنی بات کی تائید کے لئے اماں کی طرف دیکھا جو دوپٹے کے پلو سے ہاتھ پونچھتی ہمارے قریب آچکی تھیں۔

اماں نے خوشی اور حیرت سے کہا۔

''ایک سو پچیس روپے؟'' اباجی یوں مسکرائے جیسے یہ تنخواہ انہی نے مقرر کی ہو اور پھر دو چار کش لگا کر بولے۔

''بالکل۔میں تو دو چار حرامی قسم کے ماشٹروں کی وجہ سے اپنی تعلیم مکمل نہیں کر سکا تو میری بڑی آرزو تھی کہ میرا بچہ کہیں افسر لگ جائے اور دیکھ لو کبھی کبھی کی سوچی ہوئی بات کیسے پوری ہوتی ہے''۔

(جاری)

◀◀ ● ▶▶

C/O : Dr. Rehana Iqbal
Hazara Road, Hasan Abdal
Dist: Attock 47000 (Pakistan)

- **کتاب ''ڈیوٹی'' کا ایک باب**
- **رابرٹ ایم۔ گیٹس**
- **ترجمہ: یونس خان**

ڈیوٹی

جنگ میں مصروف ایک سیکریٹری کی داستان

پہلا باب

ڈیوٹی پر طلبی

میں اگست ۲۰۰۲ء میں ٹیکزیس (Texas) اے اینڈ ایم یونیورسٹی کا صدر بنا تھا اور اکتوبر ۲۰۰۶ء تک میں اپنے پانچویں سال میں وہاں ٹھیک کام کر رہا تھا۔میں وہاں بہت خوش تھا،وہاں تمام تو نہیں لیکن یونیورسٹی کے طالب علموں،سابقہ طالب علموں (Aggies) اور اساتذہ کی ایک اچھی خاصی اکثریت کا خیال تھا کہ میں یونیورسٹی کے تقریباً تمام پہلوؤں کے بارے میں (فٹ بال کے علاوہ) اہم اصلاحات لا رہا ہوں۔میں نے وہاں پانچ سال رہنا تھا جس کے لئے میں مصروف عمل تھا جب کہ میں ۲۰۰۹ء کے موسم گرما تک سات سال کے لئے اسکی توسیع پر اتفاق کر چکا تھا۔میرا خیال تھا کہ اس کے بعد میں اور میری بیوی،بیکی ،اپنے گھر شمال مغربی پیسیفک واپس لوٹ جائیں گے۔

۱۵/اکتوبر ۲۰۰۶ء کا ہفتہ،ایک ایسا ہفتہ جو میری زندگی کو تبدیل کرنے جا رہا تھا،معمول کے مطابق میں نے کئی ملاقاتوں کے ساتھ شروع کیا۔پھر میں نے ایک ایسے سفر کا اغاز کیا جس کا اختتام ڈی موئنی (MoinesDes)،آئیوا میں ہوا ،جہاں میں نے ۲۰ تاریخ بروز جمعہ ایک تقریر کرنا تھی۔

اسی دن ابھی گھڑی پر ایک بجا تھا جب میں نے اپنے سیکرٹری،سینڈی کرافرڈ کی جانب سے ایک ای میل موصول کی جس میں کہا گیا تھا کہ صدر بش کی قومی سلامتی کے مشیر،سٹیو ہیڈلی،ایک سے دو گھنٹے

کے اندر مجھ سے فون پر بات کرنا چاہتے ہیں۔ ہیڈلی کے اسسٹنٹ کا ''شدید اصرار'' تھا کہ یہ پیغام فوری طور پر مجھے پہنچایا جائے۔ میں نے سینڈی کو کہا کہ وہ اسسٹنٹ کو مطلع کر دے کہ میں ہفتہ کی صبح کو اسے فون کروں گا۔ مجھے قطعاً اندازہ نہیں تھا کہ سٹیو مجھ سے کیوں بات کرنا چاہتا ہے۔ میں تقریباً نو سال وائٹ ہاؤس میں نیشنل سیکورٹی کونسل کے سٹاف کے طور پر، چار صدور کے ماتحت، گزار چکا تھا۔ میں جانتا تھا کہ ویسٹ وِنگ اکثر فوری جوابات کا مطالبہ کرتا ہے جس کی انہیں فوری ضرورت ہوتی ہے۔ ۱۹۷۴ء کے موسم گرما میں، میں اور ہیڈلی پہلی دفعہ نیشنل سیکورٹی کونسل کے سٹاف کے طور پر ملے تھے، اس کے باوجود کہ ہمارا کبھی کبھار ہی رابطہ ہوتا تھا، ہم دوست تھے۔ جنوری ۲۰۰۵ء میں، سٹیو نے، بُش کے دوسرے دور حکومت میں، جارج ڈبلیو بُش کے قومی سلامتی کے مشیر کے طور پر کونڈولیزا رائس کے جانشین کی حیثیت سے عہدہ سنبھالا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ میں اس پہلے ڈائریکٹر نیشنل انٹیلی جنس کے عہدہ کو سنبھالنے پر غور کروں جسے پچھلے سال قانون سازی کر کے تخلیق کیا گیا تھا.....قانون سازی.....اور عہدہ.....جس کے ناقابل عمل ہونے کے سلسلہ میں، میں شدید مخالفت کر چکا تھا۔ جناب صدر اور سینئر مشیر چاہتے تھے کہ مَیں اس عہدہ کو قابل عمل بناؤں۔ میں، ہیڈلی اور وائٹ ہاؤس کے چیف اُف سٹاف اینڈی کارڈ کو افتتاحی ہفتہ میں پیر کے روز واشنگٹن میں ملا۔ ہم نے ڈائریکٹر نیشنل سیکورٹی کے اختیارات اور عہدہ کو صدارتی طور پر بااختیار بنانے کے سلسلہ میں تفصیلی گفتگو کی۔ ہفتے کے اختتام تک وہ اور میں اس بات پر متفق ہو گئے تھے کہ مجھے یہ عہدہ سنبھال لینا چاہئے۔

مجھے آنے والے پیر تک کارڈ کو کیمپ ڈیوڈ میں اپنے فیصلے سے آگاہ کرنا تھا۔ ہفتہ کے اختتام تک فیصلہ کرنے کے لئے مجھے اپنے ساتھ کشتی لڑنا پڑی۔ ہفتہ کی رات کو میں اپنے بستر پر لیٹا ہوا جاگ رہا تھا، میں نے بیکی سے کہا کہ وہی ہے جو مجھے فیصلہ کرنے میں مدد دے سکتی ہے، میں جانتا تھا کہ وہ ٹیکزیس اے اینڈ ایم کو کتنی اہمیت دیتی ہے، اس نے تو صرف یہی کہنا تھا کہ وہ واپس واشنگٹن ڈی سی جانا نہیں چاہتی۔ اس کی بجائے اس نے کہا۔

''ہمیں وہی کچھ کرنا چاہئے جو کچھ تم کرنا چاہتے ہو۔ میں نے اسے کہا۔

''میں تمہارا شکر گزار ہوں۔''

اتوار کی رات کے آخری پہر میں مَیں نے کیمپس کے گرد سگار پیتے ہوئے چکر لگایا۔ جیسے ہی میں ماضی کے معروف مقامات کو علیحدہ کرنے والے امتیازی نشانوں اور عمارتوں کے قریب سے گزرا، میں نے یہ فیصلہ کیا کہ مجھے ٹیکزیس اے اینڈ ایم کو نہیں چھوڑنا چاہئے، یہاں ابھی بہت کچھ ایسا تھا کہ جس کی میں تکمیل چاہتا تھا اور حقیقت میں میں واقعی حکومت میں واپس جانا نہیں چاہتا تھا۔ اگلے دن میں نے اینڈی کو فون کیا اور کہا کہ وہ

جنابِ صدر کو کہہ دے کہ میں اس عہدہ پر کام کرنا نہیں چاہتا۔ ایسا محسوس ہوا کہ وہ یہ سن کر ششدر رہ گیا ہے۔ وہ یہ سوچ سکتا تھا کہ میں نے اسے مصیبت میں ڈال دیا ہے، جس کے لیے میں نے اس سے معذرت کی، لیکن یہ واقعی آخری منٹ میں کیا گیا فیصلہ تھا۔ یہاں ایک تسلی کی بات بھی تھی۔ میں نے بیکی سے کہا۔

''اب ہم محفوظ ہیں۔ بُش انتظامیہ اب مجھے کبھی بھی کچھ اور کرنے کے لئے نہیں کہے گی۔'' لیکن میں غلط تھا۔

اب ہفتہ کے روز نو بجے صبح، تقریباً دو سال بعد، میں نے سٹیو سے دوبارہ رابطہ کیا۔ اس نے بغیر وقت ضائع کئے براہ راست ایک سادہ سے انداز میں سوال کرتے ہوئے کہا۔

''اگر جناب صدر آپ کو سیکریٹری اُف ڈیفنس بننے کا کہیں تو کیا آپ یہ عہدہ قبول کر لیں گے؟'' میں نے ششدر ہوتے ہوئے لیکن سادہ تر انداز میں براہ راست بغیر کسی ہچکچاہٹ کے جواب دیتے ہوئے کہا۔

''دو جنگوں میں ہمارے بچے مر رہے ہیں۔ اگر جناب صدر سمجھتے ہیں کہ میں ان کی مدد کر سکتا ہوں تو، میرے پاس اس کے علاوہ کوئی اور چارہ نہیں ہے کہ میں ہاں کہہ دوں۔ وہاں فوجی اپنی ذمہ داری پوری کر رہے ہیں۔ میں اپنی ذمہ داری کیوں ادا نہ کروں؟'' یہ کہہ کر میں منجمد حالت میں اپنے میز پر بیٹھ گیا۔

''اے خدا، میں نے کیا کر لیا؟'' میں نے اپنے آپ کو یہ سوچتے ہوئے پایا۔ میں جانتا تھا کہ شادی کے تقریباً چالیس برس بعد، بیکی میرے فیصلے کی تائید کرے گی اور ہمارے دونوں بچے بھی یقیناً اس بات کی حمایت کریں گے، اس کے باوجود میں اسے بتانے سے گھبرا رہا تھا۔

جَوش بولٹن جو مینجمنٹ اور بجٹ کے دفتر کا ایک سابق ڈائریکٹر تھا نے کچھ دن بعد یہ یقین دہانی حاصل کرنے کے لئے فون کیا کہ کیا میں اپنے ارادے پر قائم ہوں۔ اس نے سال کے شروع میں کارڈ کی جگہ پر وائٹ ہاؤس میں چیف اُف سٹاف کا عہدہ سنبھالا تھا۔ اس نے مجھ سے یہ پوچھا کہ کیا مجھے کوئی سماجی مسئلہ تو نہیں ہے جو میرے لئے پریشانی کا باعث بن سکے جیسا کہ غیر قانونی تارکین وطن کی خدمات بطور ہاؤس کیپر حاصل کرنا یا بچوں کی آیا کے طور پر رکھنا۔ میں نے ازراہ مذاق اسے کہا کہ ہم نے ایک نان سٹیزن نوکرانی رکھی ہوئی ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ ایک لمبا سانس لینا شروع کرتا، میں نے اس سے کہا اس کے پاس گرین کارڈ ہے اور وہ شہریت کے راستے پر صحیح چل رہی ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس نے میرے اس مزاح کی تعریف کی ہوگی۔

پھر بولٹن نے کہا کہ جناب صدر کے ساتھ میرے لئے ایک نجی انٹرویو کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔

میں نے اپنی طرف توجہ مبذول کروائے بغیر اسے کہا کہ میرا خیال ہے کہ میں اتوار ۱۲ر نومبر کو واشنگٹن میں ڈنر کے وقت پہنچ سکتا ہوں۔ لیکن جناب صدر زیادہ جلدی چاہتے ہیں۔ جوش نے مجھے ۳۱ اکتوبر کو ای میل کی کہ کیا میں اتوار ۵ نومبر کو الصبح کرافورڈ، ٹیکزیس کے قریب بُش فارم میں ملاقات کے لئے پہنچ سکتا ہوں۔

وائٹ ہاؤس کے ڈپٹی چیف اُف سٹاف، جوئیگن، نے ٹھیک ٹھاک انتظام کر رکھے تھے۔ اس نے مجھے ای میل کی اور کہا کہ میں صبح ساڑھے اٹھ بجے، رانچ (وسیع وعریض چراہ گاہ) سے بیس منٹ کے فاصلہ پر، میک گریگر، ٹیکزیس میں صدر صاحب سے مل سکتا ہوں۔ میں انہیں بروک شائر گروسری سٹور کے پارکنگ لاٹ میں داخلی دروازے کے دائیں طرف کھڑی گاڑی ڈُج ڈورَینگو میں ملوں گا۔ لباس میں ''رانچ کیجوئل'' سپورٹس شرٹ، خاکی ٹراوزر یا جین ہوگی۔ میں نے اپنے آپ کو بہلاتے ہوئے پیچھے کی طرف دیکھا، سی آئی اے میں میرے دہائیوں پر محیط طویل کیریئر میں، صدر بُش اور منتخب صدر اوبامہ کے ساتھ انٹرویوز، سب سے زیادہ پرفریب پوشیدگی اور راسراریت لیے ہوئے تھے۔

میں بیکی کے علاوہ کسی کو بھی بتا نہیں سکتا تھا کہ کیا ہو رہا ہے ماسوا جنابِ صدر کے والد، سابق صدر ایچ ڈبلیو بُش (اکتالیسویں صدر) کے، جن سے میں مشورہ کرنا چاہتا تھا۔ ان کی وجہ سے ہی میں پہلی مرتبہ ۱۹۹۹ء میں، جارج ایچ ڈبلیو بُش کالج اُف گورنمنٹ اینڈ پبلک سروس سکول کے عبوری ڈین کی حیثیت سے ٹیکزیس اے اینڈ ایم آیا تھا۔ اس کو کیا کہا جائے کہ نو ماہ کی پابندی، ہر ماہ کے چند روز دو سال بن جائیں گے اور یہ مجھے براہ راست ٹیکزیس اے اینڈ ایم کے صدر بنانے کی طرف لے جائیں گے۔ جنابِ بُش مجھے افسوس ہے کہ میں یونیورسٹی چھوڑ کر جا رہا ہوں، آپ جانتے ہیں کہ ملک پہلے آتا ہے۔ اور میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ اسے خوش ہونا چاہئے کہ اس کا بیٹا میرے تک پہنچ گیا ہے۔

صدر کے ساتھ اپنے انٹرویو کی خودسر براہی کے لیے میں تقریباً پانچ بجے اپنے گھر سے نکلا۔ آپ مجھے پرانی وضع کا کہہ سکتے ہیں، میں نے صدر کے ساتھ اس ملاقات کے لئے سپورٹس شرٹ اور جین کی بجائے پتلون اور بلیزر کو پہننا زیادہ مناسب سمجھا۔ اتنی سویرے ابھی سٹاربکس کی کافی شاپس نہیں کھلی تھیں، جب کہ ڈھائی گھنٹے کی ڈرائیو کے پہلے حصے کے لیے میری آنکھیں واضح طور پر چندھیائی ہوئی تھیں۔ تمام راستے میں ان سوالات کے متعلق سوچتا رہا جو پوچھے جانے تھے اور ان کے جوابات جو دینا تھے، چیلنج کا حجم، ہماری یعنی میری اور میری بیگم کی زندگی میں کیا تبدیلی آسکتی ہے اور کس طرح دفاع کے سیکریٹری کے طور پر کام سے رجوع کرنا ہے۔ میں بلاشک وشبہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ مجھے یاد نہیں ہے کہ اس صبح فارم تک ڈرائیو کے دوران میں میں کیا محسوس کر رہا تھا، شاید یہ عکاسی کرتا تھا کہ میں نے کس حد تک صورت حال کی سنگینی کو بہت

چھوٹا سمجھا تھا۔ تاہم میں یہ جانتا تھا کہ ایک چیز ہے جو میرے لیے کی جا رہی تھی، زیادہ تر لوگوں کو کم ہی توقع تھی کہ عراق میں جنگ کو اور واشنگٹن میں رُت کو تبدیل کرنے کے لئے کچھ کیا جا سکتا ہے۔

دوران سفر میں یہ بھی سوچتا رہا کہ اس انتظامیہ میں شامل ہونا مجھے کتنا عجیب لگے گا۔ اس سے پہلے صدر کے ساتھ میری کبھی بھی بات چیت نہیں ہوئی تھی۔ نہ ہی میں نے 2000ء کی الیکشن مہم میں کوئی کردار ادا کیا تھا اور نہ ہی مجھے ایسا کرنے کے لئے کہا گیا تھا۔ بُش کے پہلے دور میں انتظامیہ میں کسی کے ساتھ بھی عملی طور پر میرا کوئی رابطہ نہیں تھا۔ میں تو اس وقت دہشت زدہ ہو گیا تھا جب میرا دوست اور میرا استاد، برنٹ سکوکروفٹ، اس وقت ایک عوامی تنازع میں گھاؤ کھا گیا تھا جب اس نے انتظامیہ سے عراق کے ساتھ جنگ کے معاملہ پر مخالفت کی تھی۔ جب کہ میں رائس، ہیڈلی، ڈک چینی اور بہت سارے دوسرے لوگوں کو سالوں سے جانتا تھا۔ میں لوگوں کے ایک ایسے گروپ میں شامل ہونے جا رہا تھا جو ۹/۱۱ کے زمانے سے اکٹھے کام کر رہے تھے، جو دو جنگیں لڑ رہے تھے، اور یہ لوگ چھ سال سے ایک ہی ٹیم میں شامل تھے۔ جب کہ میں یہاں اجنبی تھا۔ میں نے میک گریگور میں اپنی طے شدہ خفیہ ملاقات کو بغیر کسی دشواری کے پورا کیا۔ جب ہم رانچ پر پہنچے تو میں ۹/۱۱ کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے سیکورٹی کے فرق کو دیکھ سکتا تھا۔ میں نے دوسرے صدور کی رہائش گاہوں کو بھی دیکھا ہے انہیں ہمیشہ ہی بہت زیادہ محفوظ بنایا گیا ہوتا ہے لیکن اس طرح کا نہیں۔

مجھے گھر کی مرکزی عمارت سے کچھ دور کشادہ لیکن سادگی سے سجائی ہوئی ایک منزلہ عمارت میں صدر کے دفتر میں اتار دیا گیا۔ اس عمارت میں صدر کے لئے ایک فراخ دفتر اور سٹنگ روم، ایک کچن اور سٹاف کے لئے دو دفتر بمعہ کمپیوٹر شامل تھے۔ میں صدر سے پہلے وہاں پہنچا (ہمیشہ اچھا پروٹوکول) کافی کا ایک کپ لیا (قطعی)، میں نے اردگرد دیکھا چند منٹ بعد پورے نو بجے صدر بھی وہاں پہنچ گئے۔ (انہوں نے ہمیشہ غیر معمولی طور پر وقت کی پابندی کی)۔ انہوں نے معذرت کی کہ اس کے دوستوں کا ایک بڑا گروپ اور اہل خانہ اس کی بیوی لورا کی ساٹھویں سالگرہ منا رہے تھے۔ ہم نے باہم خوشی کا اظہار کیا اور پھر انہوں نے اصل امور پر بات چیت کا اغاز کیا۔ سب سے پہلے انہوں نے عراق میں کامیابی کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ موجودہ سٹریٹیجی کام نہیں کر رہی جب کہ اب ہمیں ایک نئی سٹریٹیجی اپنانے کی ضرورت ہے۔ انہوں نے کہا کہ وہ بڑی سنجیدگی سے بغداد کی سیکورٹی بحال کرنے کے لئے امریکی افواج میں واضح اضافہ کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے میرے عراق سٹڈی گروپ کے بارے میں تجربے کے متعلق پوچھا (بعد میں) اور کہا کہ افواج کے اس اضافے کے متعلق میرا کیا خیال ہے۔ انہوں نے کہا کہ ان کا خیال

ھے کہ ہمیں عراق میں نئی ملٹری لیڈرشپ چاہئے اور اس سلسلے میں وہ ڈیوڈ پیٹریاس کا قریب سے جائزہ لے رہے ہیں۔عراق یقیناً ان کی پہلی ترجیح تھا لیکن اس کے باوجود انہوں نے افغانستان کے بارے میں بھی اپنے سروکار کا ذکر کیا۔ بہت سارے دوسرے نیشنل سیکورٹی چیلنجز بشمول ایران، واشنگٹن کا ماحول، کاربار مملکت چلانے کا اس کا اپنا طریقہ کار، بشمول سینئر مشیروں کے کھرے پن پر اصرار جیسے موضوعات بھی زیر بحث آئے۔ جب انہوں نے خاص طور پر ذکر کیا کہ ان کے والد صاحب ہماری اس ملاقات کے بارے میں لاعلم ہیں تو مجھے کچھ بے چینی ہوئی لیکن میں نے اس کا اظہار نہیں کیا۔اس بات سے بالکل واضع تھا کہ انہوں نے اس ممکنہ تقرری کے بارے میں اپنے والد سے مشورہ نہیں کیا تھا بعد کے قیاس کے برعکس اکیالیسویں صدر کا اس تقریری میں کوئی کردار نہ تھا۔

انہوں نے پوچھا کہ کیا کوئی سوال یا مسئلہ تو نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ میرے ذہن میں پانچ موضوع ہیں۔ پہلا عراق کے متعلق ہے۔ میں جو کچھ عراق سٹڈی گروپ سے جان پایا تھا کی بنیاد پر کہا کہ میرا خیال ہے کہ فوج کی تعیناتی میں اضافہ ضروری ہے لیکن اس اضافے کی مدت کے تعین کو عراقی حکومت کی طرف سے کئے جانے والے مخصوص عمال (ایکشنز) کے ساتھ منسلک کر کے کیا جانا چاہئے۔خاص طور پر فرقہ وارانہ مفاہمت اور قومی یکجہتی کو مضبوط بنانے کے لئے اہم قانون سازی کی تجاویز کی منظوری۔ دوئم، میں نے افغانستان کے معاملے میں گہری تشویش اور اپنے احساس کو ظاہر کرتے ہو کہا کہ اس بات کو نظر انداز کیا جا رہا ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک ایسی اہل مرکزی حکومت بنانے کی طرف بہت زیادہ توجہ دی جا رہی ہے جو کہ بنیادی طور پر پہلے سے موجود نہیں ہے جبکہ صوبوں، اضلاع اور قبیلوں کی طرف بہت کم توجہ دی جا رہی ہے۔ سوئم، میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ نہ تو آرمی اور نہ ہی میرین کو اتنی زیادہ ہے کہ جو انہیں کہا جا رہا ہے وہ انہیں کریں، ان میں اضافہ ہونا ضروری ہے۔ چہارم، میں نے یہ تجویز دی کہ ہم نیشنل گارڈ اور ریزورز کو غلط طور سے استعمال کر رہے ہیں جب کہ زیادہ تر مردوں اور عورتوں نے خاص طور پر ماہانہ ٹریننگ سیشن اور موسم گرما کے تربیتی کیمپ پر جانے کی توقع پر گارڈ میں شمولیت کی تھی تا کہ انہیں قدرتی آفات اور قومی بحران کے موقع پر بلایا جا سکے، جب کہ اس کے برعکس وہ ایک ایسی اپریشنل فورس بن گئی ہے کہ جس کی ایک یا ایک سال سے زائد عرصہ کے لئے ایک فعال اور خطرناک جنگ میں متوقع طور پر ایک سے زائد بار تعیناتی کی جا سکے۔ میں نے صاحب صدر سے کہا میرا خیال ہے کہ یہ تمام چیزیں ان کے خاندانوں اور ان کو بھرتی کرنے والوں پر منفی اثرات پیدا کر رہی ہیں جن کو حل کرنے کی ضرورت ہے۔انہوں نے گارڈ کے متعلق میرے کسی بھی نقطے سے اختلاف نہیں کیا۔آخر میں میں نے انہیں کہا کہ میں اگرچہ میں پوری طرح ماہر نہیں ہوں اور نہ ہی میں پوری طرح آگاہ ہوں لیکن جو کچھ

میں نے سنا ہے اور پڑھا ہے اس کی بنا پر میرا پختہ یقین ہے کہ پینٹا گون بہت زیادہ مقدار میں وہ اسلحہ خرید رہا ہے جو کہ اکیسویں صدی کے تقاضوں کی بجائے سرد جنگ کے دور کے لیے مناسب تھا۔

تقریباً ایک گھنٹہ اکٹھے وقت گزارنے کے بعد صدر صاحب آگے کو جھکے اور مجھ سے پوچھا کہ کیا کوئی اور سوال بھی ہے۔ میں نے جواب دیا نہیں۔اس کے بعد وہ ایک خاص طرح سے مسکرائے اور کہا۔

''چینی؟'' جب کہ میں بھی ایک خاص طرح سے مسکرایا اور انہوں نے کہنا شروع کیا۔

''اس کی ایک آواز ہے، ایک اہم آواز لیکن اکیلی آواز۔'' میں نے انہیں کہا کہ میرے چینی سے اس وقت سے بہت اچھے تعلقات ہیں جب وہ سیکریٹری اُف ڈیفنس ہوا کرتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ یہ تعلقات کام کریں گے۔تب جناب صدر نے کہا کہ وہ جانتے ہیں کہ میں کس حد تک ٹیکزیس اے اینڈ ایم سے محبت کرتا ہوں جب کہ ملک کو میری زیادہ ضرورت ہے۔انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں سیکریٹری کی ملازمت کے لئے تیار ہوں۔ میں نے کہا جی ہاں۔ وہ میرے حوالے سے بہت ساری چیزوں کے متعلق، بشمول اپنے وائس پریزیڈنٹ کے، بہت واضح تھے۔انہوں نے میری طرف سے صاف گوئی سے کیے جانے والے موازنے کی حوصلہ افزائی کی۔ جب میں ان سے علیحدہ ہوا تو میرا یقین تھا کہ اگر میں سیکرٹری بن گیا تو وہ یقیناً توقع کریں گے اور چاہیں گے کہ میں انہیں ویسا ہی بتاؤں گا جیسا کہ میں سوچتا ہوں اور میں جانتا تھا کہ ایسا کرنے میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہوگی۔

یونیورسٹی واپس آتے ہوئے میں ایک سراسیمگی میں تھا۔ دو ہفتوں کے دوران میرے سیکریٹری دفاع بننے کے امکانات پیدا ہو گئے تھے، میری آدھی امید تو یہی تھی کہ ایسا ہو نہیں پائے گا۔انٹرویو کے بعد صدر نے مجھے سامان باندھنے کے لئے نہیں کہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ میرے سامنے کیا پڑا ہوا ہے۔

اسی شام تقریباً ساڑھے پانچ بجے میں نے بُش اکتالیس کی طرف سے ایک ای میل موصول کی۔

''یہ سب کیسا جا رہا ہے؟'' میں نے جواب دیا۔

''ممکن ہے میں اپنی بنیاد چھوڑ دوں، میرا خیال ہے کہ غیر معمولی طور پر یہ ٹھیک ہوگا۔ یقیناً میں ان تمام معاملات سے مطمئن ہوں جنہیں اُٹھایا گیا (بشمول ان معاملات کے جن پر ہم نے بحث کی تھی)۔ اگر میرا اندازہ غلط نہیں ہے تو یہ چیز آگے بڑھنے کے لیے ہے۔'' میں نے مزید کہا مسٹر پریزیڈنٹ میں ممکنہ طور پر اے اینڈ ایم کو چھوڑے جانے کی وجہ سے اداس ہوں، لیکن اس کے ساتھ ہی میں بہت اچھا محسوس کر رہا ہوں کہ میں ایک مشکل وقت میں مدد کرنے کے لیے واپس جا رہا ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ جب وہ ٹیکزیس کا گورنر تھا میں نے اس سے ایک دفعہ ہاتھ ملایا تھا اس کے علاوہ میں نے کبھی اپ کے بیٹے کے ساتھ وقت

نہیں گزارا۔ آج ہم نے ایک گھنٹہ تنہائی میں گزارا اور میں نے جو کچھ دیکھا اسے پسند کیا۔ شاید میں اس کی مدد کرسکوں۔'' میں نے ان سے کہا کہ جتنا کچھ آپ جانتے ہیں اس کے متعلق محتاط رہئے گا۔ اس کا انہوں نے فوری جواب دیا۔

''میں یہ بات لیک نہیں کروں گا! میرے لب سلے ہوئے ہیں۔ یہ میں بہت خوشی سے کہہ رہا ہوں۔''

ادبی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ چند منٹ بعد بولٹن نے یہ کہنے کے لئے مجھے فون کیا کہ صدر نے آگے بڑھنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ ایک بجے شام بدھ ۸ نومبر کے لئے ایک پریس اناؤنسمنٹ کا فیصلہ کیا گیا ہے اس کے بعد ساڑھے تین بجے اُووَل آفس میں سیکریٹری رمزفیلڈ اور میرے ساتھ ٹی وی پر صدر کی آمد ہوگی۔

چَینی جیسا کہ اس نے اپنی یادشتوں میں لکھا ہے کہ اس نے رمزفیلڈ کی تبدیلی کی مخالفت کی تھی جو کہ اس کا پرانا دوست، کولیگ اور استاد تھا۔ میں اس وقت تک بے یقینی کا شکار رہا جب تک کہ بولٹن میرے پاس سے یہ کہتے ہوئے نہیں گزرا کہ سیکرٹری اف سٹیٹ رائس میری اس تقرری پر بہت زیادہ جوش وخروش میں ہے اور یہ کہ وائس پریزیڈنٹ نے کہا ہے کہ ''میں ایک اچھا آدمی ہوں'' اور یہ کہ بولٹن نے چَینی کی طرف سے آتے ہوئے کہا کہ اس نے بہت زیادہ تعریف کی ہے۔

میں نے بیکی کو ان تمام باتوں سے باخبر رکھا۔ میں اس کے علاوہ کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ مجھے یقین تو نہیں ہے لیکن میرا خیال ہے کہ یہ سب کچھ اتوار تک تکمیل پا جائے گا۔ اس وقت تک بُش انتظامیہ کی عوامی ساکھ میں بہت زیادہ کمی آچکی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔

''مجھے یہ ذمہ داری نبھانا ہے لیکن میں یہ امید رکھتا ہوں کہ اس انتظامیہ سے باہر نکلتے وقت میری ساکھ برقرار رہے گی۔''

اعلان

پیر کے روز سے ایک اہم تصدیقی عمل کے بھاری بھرکم پہیئے متحرک ہوگئے تھے لیکن یہ سارا عمل ابھی تک صیغہ راز میں تھا۔ میرا پہلا رابطہ وائٹ ہاؤس کے وکیل مائریٹ مائرز کے ساتھ ہوا جس نے مجھ سے گفتگو کا آغاز کارپوریٹ بورڈ اُف ڈائریکٹرز کی ممبر شپ، میری سرمایہ کاری اور دیگر معاملات سے متعلق اخلاقی قسم کے سوالات پوچھنے سے کیا۔ سیاسی حوالے سے تصدیق کا عمل منگل کو شروع ہوا جب مجھے کانگریس کے ارکان کی فہرست مہیا کرنے کے لئے کہا گیا میرا خیال تھا کہ یہ ایک مثبت قدم ہے کہ اس سے موجودہ اور اس کے ساتھ ساتھ سابق حکام، صحافیوں اور دیگر لوگوں کو میری تقرری کے متعلق خیر خواہی پر مبنی تبصرہ کرنے میں آسانی ہوگی۔ آٹھ تاریخ کو دوپہر ہونے سے پہلے مجھے وائٹ ہاؤس پہنچنے کے لئے کہا گیا۔ مجھے بغیر

نشان والے ائیر فورس کے گلف سٹریم جیٹ میں واشنگٹن لایا گیا اور میں انڈریوائیر فورس بیس پر اترا جو کہ واشنگٹن سے تھوڑا ہی باہر ہے جہاں جہاز نے ایک دور کے ائیر فیلڈ میں ٹیکسی کیا۔ یہیں جوئیگن مجھے لینے آیا۔

میرے وائٹ ہاؤس پہنچنے کے چند منٹ بعد ہی مجھے ویسٹ وِنگ کے بیسمنٹ میں ایک چھوٹے سے دفتر میں پہنچا دیا گیا جہاں سے میں کانگریس کے پارلیمانی لیڈرز، کانگرس کے اہم عہدہ داروں، اور واشنگٹن اور واشنگٹن سے باہر اہم لوگوں کو خیر مقدمی فون کال کرسکتا تھا۔ میرا ڈیوڈ بروم سے تعارف کروایا گیا یہ نوجوان، وائٹ ہاؤس کی قانون سازی کا اسسٹنٹ اور میرا ''ہینڈلر'' تھا اس نے اپنی محافظت میں میرا تصدیقی عمل مکمل کروایا۔ واشنگٹن میں کانگرس کے رہائشی حصے کیپیٹول ہل کا میرا کچھ ذاتی تجربہ بھی تھا لیکن ڈیوڈ، کیپیٹول ہل کا بہت ہوشیار، عملی اور زیرک مبصر اور اس کے ساتھ ہی یو۔ایس مارِین کور کا ایک اچھا ریزرو افیسر بھی تھا۔ اس کے ساتھ میں نے اپنے آپ کو بڑا آرام دہ پایا۔ میں نے کافی لوگوں سے فون پر رابطہ کیا۔ میری آئندہ ہونے والے تقرری پر غالب اکثریت کی رائے مثبت تھی۔ میں نے یہ جانا کہ عراق کے معاملے پر ری پبلیکن بہت زیادہ نروس ہیں اور وہ جنگ کے متعلق موجودہ نقطہءنظر میں تبدیلی کے خواہاں ہیں جب کہ ان میں سے ایک بڑی اکثریت نے عوام کی جنگ کے خلاف بڑھتی ہوئی مخالفت کو الیکشن میں ان کی پارٹی کا کانگرس میں ہونے والے نقصان کی وجہ قرار دیا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ عراق پر کہاں سے تنقید شروع کی جائے، اس کے باوجود سب لوگوں نے مجھے خوش آمدید کہا۔ ڈیموکریٹس بھی کافی پرجوش تھے۔ ان کا خیال تھا کہ میری تقرری سے جنگ کسی نہ کسی طور جلد ختم ہوجائے گی۔ اگر فون کرنے سے پہلے میرا یہ خیال تھا کہ واشنگٹن میں ہر شخص کو یہ یقین ہے کہ بحیثیت سیکریٹری میرا ایک ہی ایجنڈا ہے تو اسے ان فون کالوں نے مسترد کردیا تھا۔

ٹیکزیس کے معیاری وقت کے مطابق کوئی ڈھائی بجے صدر نے ایک پریس کانفرنس میں ڈیفنس میں تبدیلی کا اعلان کیا۔ میں نے ایک ای میل تیار کی جس کو کہ کوئی پینسٹھ ہزار طلباء، اساتذہ اور ٹیکزیس اے اینڈ ایم کے سٹاف کو ایک ذاتی پیغام کے ساتھ بھیجا جانا تھا۔ میرے لیے سب سے مشکل یہ بات لکھنا تھی کہ:

''میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ دو سال پہلے میں نے گورنمنٹ کی طرف واپس لوٹ جانے کی بجائے ٹیکزیس اے اینڈ ایم کا چناؤ کیا تھا تب سے اب تک دنیا میں اور یہاں بہت کچھ تبدیل ہو چکا ہے۔ میں ٹیکزیس اے اینڈ ایم سے بہت گہری محبت کرتا ہوں لیکن میں ملک کو اس سے کہیں زیادہ چاہتا ہوں، یونی فارم میں ملبوس بہت سارے طالب علموں کی طرح، میں اپنے فرائض ادا کرنے کے لئے مجبور ہوں۔ اس لیے مجھے جانا ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ اپ کو اندازہ ہے کہ میں کتنی تکلیف میں ہوں لیکن میں آپ کے ساتھ

ساتھ امریکہ کے اس منفرد ادارے کی کمی کو بھی محسوس کروں گا۔''

تقریباً دو گھنٹے بعد یہ شو ٹائم تھا۔ صدر کے پرائیویٹ ڈائننگ روم میں، میری جناب صدر اور رمز فیلڈ سے ایک مختصر ملاقات ہوئی، پھر رمز فیلڈ اُوول آفس کے طرف بڑھے اس کے بعد جناب صدر اور پھر میں۔ تقریباً چودہ سال بعد میں اوْ وَل آفس میں موجود تھا۔ جناب صدر نے یہ کہہ کر گفتگو کا اغاز کیا کہ امریکہ کی حفاظت کے لئے ضروری ہے کہ ہم عراق اور افغانستان پر جارحانہ رویہ اپنائے رکھیں۔ انہوں نے سیکریٹری اُف ڈیفنس کے کردار پر گفتگو کرتے ہوئے میرے کیریئر کے متعلق بتایا۔ پھر انہوں نے دوہرا تبصرے کرتے ہوئے میرے بطور سیکریٹری چیلینجز کو ایک شکل دی۔

''یہ شخص محکمہ کو نیا نقطۂ نظر اور نئے خیالات دے گا کہ کس طرح امریکہ عراق میں اپنے مقاصد کو حاصل کرے گا اور باب (بھائی) جانتا ہے کہ کس طرح بڑے اور پیچیدہ اداروں کو نئے چیلنجوں کے لیے تیار کرنا ہے۔'' انہوں نے دل کھول کر رمز فیلڈ کی خدمات اور ان کی بطور سیکریٹری کامیابیوں کی تعریف کی اور امریکہ کو محفوظ بنانے پر ان کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد رمز فیلڈ نے پوڈیم پر قدم رکھا اور ملک کو درپیش سیکورٹی چیلینجز کے بارے میں گفتگو کی اور خاص طور پر جناب صدر کے اپنے اوپر اعتماد اور حمایت کے لیے، اپنے محکمہ ڈیفنس کے ساتھیوں اور خاص طور پر یونی فارم میں مردوں اور عورتوں کو اپنی خدمات اور قربانیاں پیش کرنے پر ان کا شکریہ ادا کیا۔ میں نے سوچا یہ بیان بہت حد تک کلاس سے ملتا جلتا ہے۔

اس کے بعد میری باری تھی۔ صدر کا اپنے اوپر اعتماد کرنے پر شکریہ ادا کرنے کے بعد میں نے ڈان کی خدامات کا اعتراف کرتے ہوئے شکریہ ادا کیا اور کہا۔

''اس اگست کو میں نے پبلک سروس میں اپنے چالیس سال مکمل کئے ہیں۔ صدر بُش ساتویں صدر ہوں گے کہ جن کے ساتھ میں کام کروں گا۔ مجھے حکومت کی خدمت کے لئے واپس لوٹنے کی کوئی توقع نہیں تھی۔ میں کسی بھی پوزیشن پر صدر اے اینڈ ایم یونیورسٹی سے زائد لطف اندوز نہیں ہوا ہوں۔ چونکہ امریکہ عراق اور افغانستان میں جنگ لڑ رہا ہے۔ ہم تمام دنیا میں دہشت گردی کے خلاف جنگ لڑ رہے ہیں۔ ہمیں امن اور سلامتی کے دیگر چیلنجوں کا سامنا ہے، میں یقین رکھتا ہوں کہ ان تنازعات کے نتائج آنے والی کئی دہائیوں کی صورت گری کریں گے کیونکہ ہمارے طویل مدتی سٹریٹیجک مفادات اور ہماری ملکی اور ہوم لینڈ سیکورٹی خطرے میں ہے۔ چونکہ ہماری مسلح افواج میں بہت سارے امریکہ کے بیٹے اور بیٹیاں نقصان کی راہ میں ہیں اس لئے مجھے قطعاً کوئی تامل نہیں ہوا جب جناب صدر نے مجھے نوکری پر واپس آنے کے لئے کہا۔ اگر سینیٹ نے منظوری دے دی تو میں دل جمعی سے یہ خدمت ادا کروں گا اور جناب صدر کا شکر گزار ہوں گا کہ انہوں

نے مجھے اس کا موقع دیا۔''

پریس کورتج اور بعد کے دنوں میں عوامی بیانات بہت مثبت تھے۔ میں ایک لمبے عرصے سے اپنے اردگرد میں سے بہت کچھ جاننا چاہتا تھا کہ یہ میری تبدیلی کی خواہش کے مقابلے میں ایک کم جوش وخروش دکھانے کا شو تھا۔ ''اکتالیسویں'' ٹیم میں واپسی کے متعلق یہاں بہت زیادہ مزاحیہ انداز میں تبصرے کئے جا رہے تھے جس کے لئے صدر کے والد کو بیچ میں آنا پڑا، سابق وزیر خارجہ، جم بیکر، پردے کے پیچھے سے تمام ڈوریں ہلا رہا تھا اور کس طرح میں رمز فیلڈ کی تعیناتیوں کو پینٹا گون سے پاک کرنے جا رہا تھا، ای رِنگ کو تبدیل کر دو۔ (پینٹا گون کا بیرونی کوریڈور جہاں زیادہ تر سنیئر ڈیفنس سویلین کے دفاتر تھے)۔ یہ مکمل طور پر حماقت تھی۔

اگلے تین ہفتوں کے لیے میں یونیورسٹی کے پریذیڈنٹ کی تحاریک کو نبٹانے میں مشغول رہا، میں تصدیق کی تیاریوں میں پھنس گیا تھا۔ اس کے باوجود کہ میں سی آئی اے کا سابق ڈائریکٹر تھا اور مجھے امریکہ کے رازوں کے ''کراؤن جیولز'' تک رسائی حاصل رہی تھی، مجھے بدنام زمانہ تفصیلی وفاقی فارم ایس ایف ۸۶..... ''سوالنامہ برائے نیشنل سیکورٹی پوزیشنز'' بھرنا تھا، جب کہ اسے ہر اس شخص نے بھرنا ہوتا ہے جو گورنمنٹ کی نوکری شروع کرتا ہے۔ جس طرح کسی بھی سنیئر تقرری کے لئے کسی کو فائننشل سٹیٹمنٹ کا اظہار کرنا پڑتا ہے مجھے بھی کرنا پڑا۔ میں یہ سب کچھ پہلے ہی کر چکا تھا لیکن واشنگٹن میں آب وہوا تبدیل ہو گئی تھی، غلط جوابات تھے۔ حتیٰ کہ معصوم معصوم غلطیاں تھیں جنہیں حالیہ برسوں میں دیگر امیدواروں نے کیا تھا۔ اس وجہ سے مجھے کہا گیا کہ میں واشنگٹن میں کسی لافرم کی خدمات مستعار لوں جو ان فارمز کو مکمل کرنے پر عبور رکھتی ہو تا کہ یہ یقینی رہے کہ ان فارمز میں کوئی غلطی نہیں ہے۔ چونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس طرح کی تصدیق میں کسی طرح کی دیر ہو، میں نے ان سے یہ مدد لی اور اس طرح میرے چالیس ہزار ڈالر ان کاغذات کی تکمیل میں لگے۔ (نامزد شخص پر ہونے والا خرچ ہی ناقابل یقین تھا کیونکہ وہ زیادہ پیچیدہ تھا اور سب سے بڑا فائننشل سٹیٹمنٹ کا اظہار)۔ سینیٹ کی آرمڈ سروسز کمیٹی کی طرف سے بھیجے گئے پینسٹھ صفحات کے سوالوں کے جواب بھی مجھے دینا پڑے۔ اچھی بات یہ ہے کہ اس کے باوجود کہ کوئی بھی نامزد شخص اس فارم کو نہ صرف دوبارہ ریویو کر سکتا ہے بلکہ اسے دوبارہ سائن بھی کر سکتا ہے اور کنفرمیشن ہیئرنگ کے دوران ان سوالات کو پوچھ کر بھی تیار کر سکتا ہے، موخر الزکر کی مَد میں پینٹا گون کے بے شمار لوگوں کے گروپوں نے پوچھے گئے ان سوالات کو حل کرنے میں میری بے تحاشا مدد کی۔

واشنگٹن میں کنفرمیشن ہیئرنگ کی تیاری کے دوران میں آئزن ہاوَر ایگزیکٹیو آفس بلڈنگ، جو کہ وائٹ ہاؤس سے آگے ایک بہت بڑی نمائشی طور پر سجائی ہوئی وکٹورین طرز کی عمارت ہے، کے ایک عالیشان

سویٹ میں بنے دفاتر میں اپنے کام میں مصروف رہا، یہیں بتیس سال پہلے میرے پاس ایک چھوٹا سا دفتر ہوا کرتا تھا۔ یہیں میں ملٹری ڈیپارٹمنٹس (آرمی، نیوی بشمول میرین کور کے حصے اور ائیر فورس) اور ڈیفنس آرگنائزیشن کے متعلق اہم مسائل پر پڑھنے کے لیے بہت سارا مواد موصول کرتا تھا، جس کے ساتھ ایک ناقابل فہم قسم کی پیچیدہ ڈایاگرام بھی ہوتی تھی جو بیوروکریٹک مسائل کی پیش بینی کرتی تھی جس کا مجھے اب بہت جلد سامنا کرنا تھا۔ سماعتوں (ہیرنگز) کے متعلق میری مجموعی حکمت عملی یہی تھی کہ میں زیادہ جاننے کی کوشش نہ کروں، خاص طور پر بجٹ اور مال کی خریداری کے (پروکیورمنٹ) پروگرامز کے بارے میں کہ جس کے متعلق مختلف کمیٹیوں کے سینیٹرز کے کلی طور پر متضاد مفادات تھے۔ میں یہ جانتا تھا کہ ڈیپارٹمنٹ اُف ڈیفنس کے متعلق میں کیا جانتا ہوں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عراق اور افغانستان کے متعلق میرا رویہ، میرے خیالات اور برتاؤ کیا ہوگا، ان سب کی کہیں کوئی سماعت نہیں ہوگی۔ میرے کوچ اس معاملے میں میری مدد نہیں کر سکتے تھے۔

ان تین ہفتوں کے دوران سب سے پہلے میں نے رابرٹ رینگل سے ملاقات کی، رمز فیلڈ کا ''سپیشل اسسٹنٹ''، حقیقت میں اس کا چیف اُف سٹاف۔ ۲۰۰۵ء میں پینٹا گون جانے سے پہلے، رینگل ہاؤس آرمڈ سروسز کمیٹی کے سٹاف پر کئی سالوں سے سٹاف ڈائریکٹر کے طور پر براجمان تھا۔ میں نے جلدی سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ جن لوگوں سے اب تک میں ملا ہوں ان کے مقابلے میں وہ کانگرس اور ڈیپارٹمنٹ اُف ڈیفنس کے متعلق کافی کچھ جانتا ہے اور بہتر جبلت رکھتا ہے۔ اگر میں اسے یہاں رہنے پر قائل کر لیتا ہوں تو وہ میرے لئے انمول ہوگا۔

جس کام کو میں شروع کرنے جا رہا تھا اس کے متعلق میری سماعت کے پہلے دنوں میں سب سے زیادہ ڈرامائی واقعہ اس وقت پیش آیا جب ایک شام میں ہوٹل میں اکیلے کھانا کھا رہا تھا، جس نے کسی بھی بریفنگ سے زائد میرے دل سے انتوں تک صفائی کر دی۔ درمیانی عمر کی ایک عورت میرے پاس میرے میز پر آئی اور مجھ سے پوچھا کیا میں مسٹر گیٹس ہوں، نیا سیکریٹری اُف ڈیفنس۔ میں نے کہا جی۔ اس نے مجھے میری تقرری پر مبارک باد دی پھر اس نے کہا۔

''میرے دو بیٹے عراق میں ہیں، خدا کے لئے انہیں زندہ گھر واپس لے آؤ۔ ہم تمہیں دعائیں دیں گے۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ میں جذبات سے مغلوب ہو گیا۔ میں نے سر ہلایا، شاید کچھ بڑبڑایا بھی کہ میں کوشش کروں گا۔ میں اپنا کھانا ختم نہیں کر سکا اور اس رات میں سو بھی نہیں سکا۔ ہماری یہ جنگیں میرے لئے بالکل حقیقت بن گئیں تھیں۔ میں ان تمام لوگوں کی ذمہ داری لینے جا رہا تھا جو جنگ پر تھے۔ پہلی دفعہ میں خوف زدہ ہوا کہ میں ان ماؤں سے ملنے اور لوگوں کی توقعات پر پورا اُترنے کا اہل نہیں ہوں۔

پانچ دسمبر کو اپنی تصدیقی سماعت سے پہلے کے دنوں میں، میں نے اہم سینیٹرز کو ملنے کی رسم نبھائی، بشمول ان تمام سینیٹرز کے جو سینیٹ کی آرمڈ سروسز کمیٹی میں شامل تھے۔ صدر کے، مڈ ٹرم الیکشن کے فوری بعد، ڈیفنس میں تبدیلی کے فیصلے کے اعلان پر ریپبلیکن سینیٹرز کی کڑواہٹ نے مجھے حیران کیا۔ وہ سب اس بات پر قائل تھے کہ صدر نے الیکشن سے چند ہفتے پہلے رمز فیلڈ کو علیحدہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے جس کی وجہ سے وہ اپنی اکثریت قائم کر لیں گے۔ ریپبلیکنز نے اس بات کی بھی شکایت کی کہ صدر نے کیوں کر وائٹ ہاؤس میں خود اکیلے ہی یہ سب کچھ ڈیل کیا۔ انہوں نے کہا، قیادت نے سب کو نظر انداز کیا ہے۔

بہت سارے سینیٹرز ملٹری کی سنیئر قیادت پر تنقید کر رہے تھے۔ جب کہ کچھ ری پبلیکنز کہ جن میں میک کین بھی شامل تھا عراق میں جنگ کی بری طرح حمایت کر رہے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ ہمیں اپنی کوششوں کو بہتر کرنا چاہئے اس سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ کم از کم آدھے ری پبلیکنز عراق میں جنگ جاری رکھنے کے بارے میں فکر مند تھے وہ واضح طور پر جنگ کو اپنی پارٹی کے لئے ایک بڑی اور بڑھتی ہوئی سیاسی ذمہ داری کے طور پر دیکھ رہے تھے۔

جن ڈیموکریٹک سینیٹرز سے بات ہوئی انہوں نے اپنی رائے کا اظہار اکتاہٹ سے کیا۔ عراق میں جنگ کی مخالفت کی اور اسے ختم کرنے کی ضرورت پر زور دیا، افغانستان پر توجہ مرکوز کرنے کو کہا۔ ان کے نقطہ نظر کے مطابق پینٹا گون کے تعلقات کانگرس کے ساتھ خوفناک تھے، جب کہ ڈیفنس کے اندر سویلین فوجی تعلقات خراب تھے۔ ان کی نفرت اور ناپسندیدگی تھی جارج بش کے لئے (تینتالیسواں صدر آئندہ حوالے کے لئے بش 43) اس کے وائٹ ہاؤس میں سٹاف کے لیے، گھر میں اور جنگ کے سلسلہ میں کانگرس کے دونوں ایوانوں میں نئی اکثریت کو استعمال کرنے کے متعلق عزم سے۔ انہوں نے میری نامزدگی پر بہت زیادہ خوشی کا اظہار کیا اور مجھے اپنی حمایت کی پیشکش کی۔ میرا خیال ہے کہ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ان کا خیال تھا کہ عراق سٹڈی گروپ کے ایک رکن کے طور پر میں ان کی خواہش کو گلے سے لگاتے ہوئے عراق سے فوجوں کی واپسی شروع کروا سکتا ہوں۔

تہنیتی کالز یہ پیش بینی کر رہی تھیں کہ آنے والا سال کس طرح کا ہوگا۔ جن سینیٹرز نے پبلک میں سفاکانہ طور پر عراق میں ناکامی کے نتائج پر صدر کی ذات پر حملے کئے تھے وہ بھی نجی طور پر فکر مند تھے۔ زیادہ تر نے اپنی ریاستوں میں اہم ڈیفنس انڈسٹری کے متعلق مجھے واقفیت دی۔ ان شپ یارڈز، ڈپوز، اڈوں اور متعلقہ زرائع روزگار میں اپنے لیے نوکریوں کے لئے میری حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ میں اس بات پر دہشت زدہ تھا کہ دو جنگوں کے عین وسط میں اس طرح کے مقامی مسائل ان کی فہرست میں سب سے اوپر تھے۔

مجموعی طور پر گلیارے کے دونوں طرف کے سینیٹرز سے تہنیتی کالز بہت زیادہ حوصلہ شکنی پر مبنی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ جماعتی تقسیم متوقع ہے لیکن اس کی نوعیت ذاتی نہیں ہوگی نہ تو صدر کے لیے اور نہ ہی انتظامیہ میں شامل بہت سارے لوگوں کے لیے۔ میں دونوں پارٹیوں سے یہ امید نہیں کر رہا تھا کہ وہ پنٹاگون میں سویلین اور فوجی لیڈرز پر نہ صرف ان کی کارکردگی پر بلکہ وائٹ ہاؤس اور کانگرس کے ساتھ ان کے معاملات پر بہت زیادہ تنقید کریں گے۔ ان تہنیتی کالز نے یہ واضح کر دیا تھا کہ میرا ایجنڈا صرف عراق نہیں ہوگا بلکہ اس سے کہیں وسیع تر ہوگا۔ واشنگٹن تو بذات خود ایک وارزون بن گیا تھا اور اگلے ساڑھے چار سال کے لئے یہ میرے لئے میدان جنگ بنا رہا۔

توثیق

سیکریٹری اف ڈیفنس کے طور پر توثیق کے بعد جب میں اپنی گاڑی میں ہوٹل سے کیپیٹول جا رہا تھا تو میں نے حیرت سے اس ایک لمحے کے لئے اپنی راہ کے بارے میں سوچا۔ میں وِچٹا، کنزس (Kansas) کی ایک متوسط کلاس میں پلا بڑھا ہوں۔ میں اور میرا بڑا بھائی اپنے خاندان کے پہلے لوگ تھے جو کالج کے گریجویٹ تھے۔ میرے والد آٹو موٹیو کے پرزے بنانے والی ایک کمپنی کے ہول سیل کے سیلز مین تھے۔ وہ کٹر ری پبلیکن تھے جو ڈوائیٹ ڈی آئزن ہاؤر کو بہت زیادہ پسند کرتے تھے، فرینکلن ڈی روزویلٹ ''بدترین ڈکٹیٹر'' تھا۔ میں دس سال کا تھا جب مجھے پتا چلا کہ ہنری ٹرومین کے نام کا پہلا حصہ ''ناپسندیدہ'' نہیں تھا۔ میری ماں کی طرف سے تقریباً سارے ننھیال والے ڈیموکریٹ تھے تو اس طرح ابتدائی عمر میں ہی مجھے یہ سمجھ تھی کہ دو مخالف پارٹیوں کے متعلق رائے رکھی جا سکتی ہے۔ میں اکثر اپنے والد کے ساتھ سیاست اور دنیا پر گفتگو (بحث) کرتا تھا۔

ہم خاندان کے چاروں لوگ آپس میں کافی قریب تھے، میرا بچپن اور جوانی پیارے، شفقت آمیز اور ایک خوش و خرم گھرانے میں گزرے تھے۔ میرے والد کے غیر متزلزل اخلاقی اصول تھے۔ وہ ایک بڑے دل اور کھلے ذہن کے ساتھ لوگوں سے ملتے تھے (سیاست کے حوالے سے)۔ انہوں نے ابتدائی زندگی میں ہی مجھے سکھایا تھا کہ ایک وقت میں لوگوں کو ان کی بنیادی خصوصیات کی بنیاد پر ایک طرح کا ہی دیکھیں نہ کہ ان کی کسی پارٹی کے ساتھ وابستگی کی بنیاد پر۔ انہوں نے کہا یہ آپ کو تعصب یا نفرت کی طرف لے جاتا ہے، یہی کچھ تھا جو نازی کرتے تھے۔ ان کے لئے جھوٹ، منافقت، غیر اخلاقی رویئے اور کن سویاں کرنے والے لوگوں کے لئے کوئی صبر نہ تھا۔ چرچ میں وہ اکثر ان اہم لوگوں کی نشاندہی کرتے کہ جن کے کردار میں معیار کی کمیاں تھیں۔ میری ماں جیسا کہ اس زمانے کا دستور تھا ایک گھر بنانے والی

خاتون تھیں۔ وہ مجھے اور میرے بھائی سے خوب محبت کرتی تھیں۔ وہ ہر جگہ ہماری راہنمائی کرتیں۔ جب میں ایک لڑکا تھا تو میرے والدین نے بارہا مجھے کہا کہ اگر میں محنت کروں تو اس کی کوئی حدیں نہیں ہیں کہ جن کو میں حاصل کر سکتا ہوں۔ معمول کے مطابق وہ مجھے خبردار بھی کرتے رہتے تھے کہ میں اپنے آپ کو دوسروں سے کسی صورت افضل نہ سمجھوں۔ ۱۹۵۰ء کے کنزیس میں گزرنے والی میری زندگی آئیڈیل تھی، جو میرے خاندان، سکول، چرچ اور بوائے سکاؤٹ کے گرد گھومتی تھی۔ میں اور میرا بھائی ایگل سکاؤٹ تھے۔ یہیں کچھ اصول بھی تھے کہ جن کی پیروی کرنے کے لیے میرے والدین اصرار کرتے تھے، ان پابندیوں کے بیچ مجھے اپنے پروں کو جانچنے اور پرکھنے کے لئے بہت زیادہ گھومنے پھرنے کی آزادی تھی۔ میں اور میرا بھائی خطرے مول لینے کا رجحان رکھتے تھے اور کچھ لاپروا بھی تھے۔ ہم دونوں ہسپتال کے ایمرجنسی کمروں کا نظارہ دیکھنے کے ماہر تھے۔ میں ایک سمارٹ نادان تھا جب میں اپنی ماں سے گستاخی کرتا تو اگر میرے والد قریب ہوتے کہ وہ آواز سن سکتے ہوتے تو فوری طور پر ایک الٹے ہاتھ کا تھپڑ میرے چہرے پر متوقع ہوتا۔ میری والدہ بید مجنوں کی چھڑی کاٹنے میں ماہر تھیں۔ جب میں بدتمیزی کرتا تو وہ اسے میری ننگی ٹانگوں کی پشت پر استعمال کرتیں۔ سب سے زیادہ سزا جھوٹ بولنے پر ملتی۔ غیر معمولی مواقع پر جب میں نظم و ضبط قائم رکھتا تو، میں پر اعتماد ہوتا کہ میں اس قابل ہوں، گو کہ اس وقت میں دل کہ گہرائیوں میں ایذا محسوس کرتا۔ تاہم ان کی توقعات اور ڈسپلن نے مجھے یہ سکھایا تھا کہ میں اپنے اعمال کے نتائج کی ذمہ داری قبول کروں۔

میرے والدین نے میرے کردار کی تعمیر کی تھی اور اس طرح میری زندگی کی بھی۔ سینٹ کی طرف جاتے ہوئے اس دن میں نے یہ محسوس کیا کہ یہ انسانی خصوصیات جو انہوں نے میری زندگی کے ابتدائی دنوں میں میرے اندر ڈالی تھیں یہ اس کا نتیجہ ہے کہ آج یہ لمحہ آیا ہے اور جب میں نے آگے کی طرف دیکھا تو میں جانتا تھا کہ اب اس کی جانچ ہوگی کہ جو پہلے نہیں ہو سکی۔

اس سے پہلے میری تین دفعہ تصدیقی سماعت ہو چکی تھی۔ پہلی دفعہ ۱۹۸۶ء میں، سنٹرل انٹیلیجنس کے ڈپٹی ڈائریکٹر کے لیے، یہ پارک میں ایک واک تھی جس کا نتیجہ ایک متفقہ ووٹ تھا۔ دوسری دفعہ ۱۹۷۸ء کے شروع میں، سنٹرل انٹیلیجنس کے ڈائریکٹر کے لیے، یہ اس وقت ہوا جب ایران کو اسلحہ بیچنے کے متعلق، امریکہ، ایران کونٹرا سکینڈل کے بیچ میں تھا۔ جب مجھے واضح ہو گیا کہ سینیٹ اس کی منظوری نہیں دے گی جب کہ میں نے اس سلسلہ میں اپنے کردار کے متعلق بہت سارے سوالوں کے جواب ہی نہیں دیئے تو میں پیچھے ہٹ گیا۔ تیسری دفعہ ۱۹۹۱ء میں پھر ڈائریکٹر سنٹرل انٹیلیجنس کے لیے، گو اس پر غازہ لگایا گیا اور اسے لمبا کھینچا گیا، لیکن اس کا اختتام میری توثیق پر ہوا جب کہ ایک تہائی سینیٹرز

نے میرے خلاف ووٹ دیا۔ میرا تجربہ مجھے بتا رہا تھا کہ جب تک کہ میں واقعتاً اپنی گواہی میں پھنس نہ جاؤں، ایک بہت بڑے مارجن کے ساتھ سیکریٹری اُف ڈیفنس کی حیثیت سے میری توثیق ہو جائے گی۔ اس وقت کا ایک ادارتی کارٹون سینیٹ (اور پریس) کے موڈ کی مطلق عکاسی کرتا تھا جس میں مجھے دایاں ہاتھ اوپر اٹھا کر حلف لیتے ہوئے دکھایا گیا تھا..... ''نہ تو میں پہلے کبھی ڈونلڈ رمزفیلڈ تھا اور نہ اب ہوں۔'' یہ ایک فائدہ منداور عاجزانہ یاددہانی تھی کہ میری توثیق اس لئے نہیں ہوئی کہ میں کیا ہوں بلکہ اس لیے ہوئی کہ میں کیا نہیں ہوں۔ یہ ایک بیان بھی تھا کہ واشنگٹن کا ماحول کتنا زہریلا ہو چکا ہے۔

ورجینیا سے سینیٹر جَون وارنؔر آرمڈ سروسز کمیٹی کا چیئرمین تھا، اس طرح اس سماعت کی صدارت اس نے کی، درجہ بندی میں اقلیتی رکن میشی گن سے کارل لیون تھا۔ مڈٹرم الیکشن کے نتیجہ کے طور پر چند ہفتوں میں ان کے مقامات تبدیل ہونے والے تھے۔ وارنر میرا پرانا دوست تھا جس نے میرا تعارف کروایا۔ وہ میری ہوم سٹیٹ کا سینیٹر تھا۔ یہ میری پچھلی تینوں سماعتوں میں شامل تھا۔ میں لیون کو زیادہ نہیں جانتا تھا۔ اس نے ۱۹۹۱ء میں میرے خلاف ووٹ دیا تھا۔ خیر مقدمی کلمات وارنر نے ادا کرنے تھے اور اس کے بعد لیون، اس کے بعد میرے دو دوستوں، سینیٹ کا سابق اکثریتی لیڈر باب ڈول جس کا تعلق کنزیس سے تھا اور سابقہ سینیٹر اور سینیٹ کی انٹیلیجنس کمیٹی کا چیئرمین ڈیوڈ بورینؔ، جو کہ تادیر یونیورسٹی اُف اُکلا ہوما کے صدر رہے تھے، انہوں نے مجھے کمیٹی سے متعارف کروانا تھا۔ پھر میں نے افتتاحی کلمات کہنا تھے۔

ابھی ہم گیٹ سے باہر ہی تھے کہ وارنؔر نے عراق پر فوکس کرنا شروع کر دیا۔ انہوں نے اپنے حالیہ، آٹھویں، عراق کے دورے کے بعد لوگوں کو یاددہانی کراتے ہوئے کھلے عام کہا کہ دو یا تین مہینوں میں اگر یہ جنگ سودمند ثابت نہیں ہوتی، اگر موجودہ تشدد کی لہر قابو میں نہیں آتی، اگر وزیراعظم مالکی کی حکومت کام کرنے کے اہل نہیں رہتی تو یہ ہماری حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ تعین کرے کہ کیا یہاں کوئی ایسا تبدیل شدہ راستہ ہے کہ جسے ہمیں اپنا لینا چاہئے؟ انہوں نے چیئرمین جائنٹ چیف اُف سٹاف، پیٹر پیس کے حوالے سے کہا جو انہوں نے ایک دن پہلے کہا تھا۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا ہم جیت رہے ہیں تو انہوں نے کہا کہ ہم جیت نہیں رہے لیکن ہم کھو بھی نہیں رہے۔ عراق کے متعلق انتظامیہ جس طرح حکمت عملی کے مختلف جائزوں کی جانچ کر رہی تھی وارنر نے اس کی تعریف کی۔ اسی تناظر میں اس نے مجھے مشورہ دیا کہ مجھے اپنا کام کیسے کرنا چاہئے۔ میں نے زور دیتے ہوئے کہا کہ آپ اپنی ذاتی رائے کو اور اپنے مشورے کو موجودہ اور مستقبل کی حکمت عملی کے اندازوں کے لیے ہونے والی بحثوں تک محدود نہ کریں۔ آپ کو بس خوف زدہ نہیں ہونا چاہئے..... میں نے دوبارہ کہا..... بس بے خوف ہو جائیں اپنی قانونی ذمہ داری پوری

کریں جس کا حوالہ دیتا ہوں..... صدر کے پرنسپل اسسٹنٹ کے طور پر محکمہ دفاع کے تمام معاملات۔ وارنر نے عوامی طور پر صدر کی عراق پر کمزور ہوتی ہوئی حمایت کی طرف اشارہ کیا۔

لیون نے ابتدائی بیان میں عراق کے معاملے پر انتظامیہ کو بہت زیادہ تنقید کا نشانہ بنایا اور وہ کمیٹی کے چیئرمین کی حیثیت سے واضح طور پر متعین خیالات زیر بحث لانے والا تھا جس کے لیے جنوری کے آغاز میں مجھے مجبور کیا جانا تھا۔

''اگر میری سیکریٹری اُف ڈیفنس کے طور پر توثیق ہو جاتی ہے تو رابرٹ گیٹس کو گزشتہ چند برسوں کی ٹوٹی ہوئی پالیسیوں اور غلط ترجیحات کے ٹکڑے چننے کے تاریخی چیلنج کا سامنا کرنا ہوگا۔ سب سے پہلا اور اہم، اس کا مطلب عراق میں جاری بحران کو حل کرنا ہے۔ عراق میں بتدریج صورت حال بہتر ہونے کی بجائے بدترین ہو رہی ہے۔ عراق پر حملہ کرنے سے پہلے، ہم ملک پر قبضہ کرنے کے لئے ضروری فوج مہیا کرنے کی حکمت عملی بنانے میں ناکام رہے ہیں، یا پھر ہم بڑی کاروائیوں کے بعد کی منصوبہ بندی کرنے میں ناکام ہوئے ہیں۔ ۲۰۰۳ء میں صدام حسین کا تختہ الٹنے کے بعد، ہم نے نا صرف بغیر سوچے سمجھے عراقی فوج کو ختم کر دیا بلکہ بعث پارٹی کے دسیوں ہزاروں کارکنوں کو بھی چھوٹی سطح کی مستقبل کی حکومتی ملازمتوں کے لئے نااہل قرار دے دیا جس کے نتیجہ میں تشدد اور افراتفری پھیلی اور ہم نے عوام کے متعدد بہ حصہ کو بیگانہ کر دیا۔ ہم اب تک ملک کو محفوظ بنانے اور بغاوت کو روکنے میں ناکام رہے ہیں۔ ہم ملیشیا کو غیر مسلح کرنے اور ایک قابل عمل عراقی فوج یا پولیس بنانے میں ناکام رہے ہیں۔ ہم ملک کے معاشی انفراسٹرکچر کو دوبارہ قائم کرنے اور عوام کی اکثریت کو روزگار دینے میں ناکام رہے ہیں۔ آنے والے سیکریٹری اُف ڈیفنس کو ان ناکامیوں کے نتائج سے نبٹنا ہوگا۔

لیون نے مجھے مزید یہ کہا کہ صرف عراق ہی ایک چیلنج نہیں ہے کہ جس کا مجھے سامنا ہے۔ انہوں نے افغانستان میں باغی طالبان کی بات کی، ایک غیر متوقع ایٹمی طاقت شمالی کوریا، ایران کا جارحانہ طور پر ایٹمی ہتھیاروں کی طرف رجوع، آرمی اور میرین کور کی اصلاح اور ساز و سامان کی مرمت اور تبدیلی کے لیے دسیوں بلین ڈالر کی ضرورت، ہماری غیر تعینات زمینی افواج کی تیاری کی کمی، مسلسل اسلحہ کے حصول کے پروگرام جس کے ہم متحمل نہیں ہو سکتے، افواج میں بھرتی کرنے اور اسے قائم رکھنے کے چیلنجز، ہمارے فوجی خاندانوں کی بار بار تقرریوں کے بعد کے مسائل، اور ایک شعبہ جس کی تصویر کو ابوغریب جیل اور گوانتانامو بے اور دوسری جگہوں پر محبوس قیدیوں پر ظلم نے خراب کیا۔

اور آخر میں، جس شخص کے ساتھ میں نے کام کرنا تھا جو کمیٹی کا چیئرمین تھا نے کہا کہ سویلین سنیئر

لیڈرشپ نے محکمہ ڈیفنس کی اثر پزیری کو کم کیا ہے کہ اکثر اس نے اختلافی آرا کا خیر مقدم نہیں کیا، چاہے وہ وردی والے ہمارے رہنما ہوں، وہ انٹیلیجنس کمیونیٹی ہو، سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ ہو، امریکی اتحادی ہوں یا کانگرس میں دونوں سیاسی پارٹیوں کے ارکان ہوں۔

مجھے یاد ہے کہ وِٹنس ٹیبل پر بیٹھ کر میں دکھ سے دعا کر رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ میں یہاں اس دوزخ میں بیٹھا کیا کر رہا ہوں؟ میں پانچ طرح کی گندگی کی بارش کے عین بیچ چل کر آ گیا ہوں۔ متعدد بار ایسا ہوا ہے کہ میں وِٹنس ٹیبل پر بیٹھ کر جو کچھ کہہ رہا ہوتا تھا اس سے بالکل مختلف سوچ رہا ہوتا تھا۔

ڈول اور بورَین کے خیر مقدمی الفاظ کے بعد میری باری تھی۔ میں نے ہلکی پھلکی گفتگو سے آغاز کرتے ہوئے اپنے نقطہءنظر کو چھوڑے بغیر اس کی عکاسی کی۔ سینیٹر وارنر ایک طویل عرصے سے بڑی شدت سے یہ محسوس کر رہا تھا کہ کنفرمیشن ہیئرنگ کے دوران امیدوار کے خاندان کو اس کے ساتھ ہونا چاہئے۔ بیکی صرف پہلی مرتبہ میری ہیئرنگ میں میرے ساتھ تھی۔ کانگریسی ہیئرنگز کو میں نے کبھی بھی فیملی فیئر کے طور پر نہیں لیا۔ میں نے سینیٹر وارنر کو وضاحت پیش کی کہ بیکی کے پاس ایک چوائس ہے۔ اگر وہ چاہئے تو میری کنفرمیشن ہیئرنگ میں شامل ہو سکتی ہے یا پھر وہ ٹیکزیس اے اینڈ ایم کی خواتین کی واسکٹ بال ٹیم کا سیاٹل میں یونیورسٹی اُف واشنگٹن کے ساتھ مقابلے میں ساتھ دے سکتی ہے۔ میں نے کہا وہ سیاٹل میں ہے اور میرا خیال ہے کہ یہ ایک اچھا بلاوا ہو سکتا ہے۔ پھر میں سنجیدہ ہو گیا۔

''اگر آج میں اپ لوگوں کے سامنے بیٹھا ہوں تو میں کسی فریب میں نہیں ہوں: عراق میں جنگ ہے۔ اگر میری توثیق ہو جاتی ہے تو ہمیں عراق میں جن مسائل کا سامنا ہے ان کو حل کرنا میری سب سے پہلی ترجیح ہوگی۔ میں خیالات اور تجاویز کے لیے کھلا ذہن رکھتا ہوں۔ اگر میری توثیق ہو جاتی ہے تو سب سے پہلے میں اپنے ملٹری لیڈرز اور محاذ پر جنگی کمانڈروں سے اور اس کے ساتھ ساتھ کانگرس اور ایگزیکٹیو برانچ میں دوسرے لوگوں سے فوری رابطہ کروں گا۔ میں بہت زیادہ سنجیدگی سے ان لوگوں سے رابطہ کروں گا جو یونیفارم میں عورتوں اور مردوں کی راہنمائی کرتے ہیں۔'' پھر میں نے انتباہ کیا۔

''اگرچہ میرا ذہن عراق کے مستقبل کی حکمت عملی اور جنگی چالوں کے متبادل خیالات کے بارے میں کھلا ہے لیکن میں بڑی شدت سے ایک نقطے کو محسوس کرتا ہوں۔ میرا یقین ہے کہ اگلے ایک یا دو سال میں عراق میں ہونے والی ترقی سے پورے مڈل ایسٹ کی تشکیل اور عالمی جغرافیائی سیاست پر آنے والے کئی سالوں تک اثرات رہیں گے۔ اگلے ایک یا دو سال میں ہمارے راستے یہ تعین کریں گے کہ کیا امریکی اور عراقی لوگ اور امریکہ کا آنے والا صدر عراق اور اس خطے میں ہونے والی سُست رو لیکن باقاعدہ ہونے والی

بہتری کا سامنا کریں گے یا بہت حقیقی خطرے اور علاقائی آتش گیری کی ممکنہ حقیقت کا سامنا کریں گے۔ ہم عراق کو افراتفری میں چھوڑ کر نہیں جا سکتے اس کے لیے ضرورت ہے کہ ہم اکٹھے مل کر کام کریں اور ایک حکمت عملی بنائیں تاکہ اس خطے میں ہمارے طویل مدتی مفادات اور امیدوں کی تکمیل ہو سکے۔''

میرے یہ تین جملے عراق پر اور کیا کیا جانا چاہئے پر میرے خیالات کی تصویر پیش کرتے تھے جب کہ میرے خیالات میری حکمت عملی اور اگلے دو سال کے لئے واشنگٹن اور عراق میں جنگی تدبیروں کو راہ دکھائیں گے۔ جیسا کہ میں بار بار کہوں گا۔

''اَیا آپ جنگ شروع کرنے کے حق میں ہیں یا نہیں؟ ہم ہیں لیکن ہم کہاں ہیں؟''

میں نے ابتدائی کلمات کے اختتام پر دل کی گہرائیوں سے بیان کیا۔

''میں نے حکومت میں واپسی کے لیے اس عہدے کو قبول نہیں کیا۔ میں یہاں اس لیے ہوں کہ میں اپنے ملک سے پیار کرتا ہوں اور یونائیٹڈ سٹیٹ اُف امریکہ کا صدر مجھ پر یقین رکھتا ہے کہ اس مشکل وقت میں میں اس کی مدد کر سکتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں آپ بھی اسی نتیجہ پر پہنچیں گے۔ اور آخر میں شاید اس کمیٹی کا سب سے عاجزانہ حصہ یہ ہے کہ جس عہدہ پر میری تقرری کے لیے غور ہو رہا ہے وہ جانتے ہیں کہ میرے فیصلے زندگی اور موت کے نتائج لیے ہوئے ہوں گے۔ ہمارا ملک حالت جنگ میں ہے، اگر میری توثیق ہو جاتی ہے، تو مجھے بھی اس قیادت کے ساتھ الزام دیا جائے گا جن کے ماتحت یہ مرد اور عورتیں جنگ لڑ رہے ہیں۔ میں اس کمیٹی کو اپنے پختہ عزم کی یقین دہانی کرواتا ہوں کہ اپنی افواج کی فلاح و بہبود کو برقرار رکھنا میرے ذہن میں سب سے اوپر رہے گا۔ جب میں یہ عہد کر رہا ہوں تو میں نہیں جانتا کہ اس سب کی تکمیل کے لئے کیا کچھ کرنا ہوگا۔''

اس لینے اور دینے کی نیوز کوریج میں، جس کی پیروی کی گئی، دو تبدیلیوں کو اہمیت دی گئی۔ پہلی کا تعلق ابتدائی سماعت سے ہے جب سینیٹر لیون نے مجھ سے پوچھا تھا کہ کیا میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہم عراق میں جیت رہے ہیں اور میں نے سادگی سے جواب دیا تھا، ''نہیں محترم۔'' اس جواب پر وسیع پیمانے پر، پہلی انتظامیہ کی گواہی کے برخلاف، حقیقت پسندی سے اور واضح طور پر خوشی کا اظہار کیا گیا۔ اگر کوئی ایک سوال ہے جو میری توثیق کو محفوظ بنا سکتا ہے تو وہ یہی ہے۔ اس صبح وائٹ ہاؤس اور محکمہ دفاع میں اگر کوئی اشتعال تھا تو وہ اس سوال کی وجہ سے تھا اور کھانے کے وقفے کے بعد، میں نے فیصلہ کیا کہ اپنے جواب میں اضافہ کروں کہ ایک دن پہلے پیٹ پیس نے کیا کہا تھا، اگرچہ ہم جیت نہیں رہے تو ہم ہار بھی نہیں رہے..... اس سب کے باوجود، میں یہ نہیں کہنا چاہتا کہ عراق میں موجود سپاہی یہ سوچیں کہ میں یہ رائے دے رہا ہوں کہ وہ فوجی

طور پر ہار رہے ہیں۔

دوسری کا تعلق سینیٹر ایڈورڈ کینیڈی سے ہے، جس نے ہمارے فوجیوں کی قربانیوں کا ذکر کرتے ہوئے پوچھا کہ کیا آئندہ آنے والی پالیسی ڈیبیٹ میں، میں اپنی قومی سلامتی اور فوجیوں کے ساتھ ''کھڑا ہونے والا شخص'' ہوں گا۔ میں نے جواب دیا۔

''سینیٹر کینیڈی صاحب، ٹیکزیس اے اینڈ ایم یونیورسٹی کے بارہ گریجویٹ عراق میں مرے ہیں۔ ان میں سے کچھ بچوں کے ساتھ میں صبح کے وقت دوڑا کرتا تھا، میں ان کے ساتھ کھانا کھایا کرتا تھا، وہ اپنی خواہشات اور امیدوں کو میرے ساتھ بانٹا کرتے تھے اور میں ان کی ڈگری ان کے حوالے کروں گا۔ میں ان کو کمیشن دینے والی تقریب میں شامل ہوں گا اور پھر میں ان کی تعزیت قبول کروں گا۔ اور اس طرح نیچے آتے ہوئے یہ ہم سب کے لیے بہت زیادہ ذاتی ہو جاتا ہے۔ کل صبح تک کے اعداد و شمار یہ ہیں کہ دو ہزار آٹھ سو نواسی لوگ عراق کی جنگ میں ہلاک ہوئے ہیں۔ یہ ایک بڑی تعداد ہے۔ جب کہ ان میں سے ہر ایک شخص نہ صرف ایک انفرادی سانحے کی نمائندگی کرتا ہے بلکہ مرنے والے فوجی کے ساتھ ساتھ اس کے پورے خاندان اور دوستوں کی نمائندگی بھی کرتا ہے۔'' میں نے مزید کہا۔

''سینیٹر صاحب، میں ٹیکزیس اے اینڈ ایم کی صدارت نہیں چھوڑ رہا ہوں، میں نے جتنی بھی ملازمت کی ہے شاید سب سے زیادہ یہیں لطف اندوز ہوا ہوں۔ میں نے بہت زیادہ معاشی نقصان اُٹھایا ہے، میں بے تکلفی سے یہ کہوں گا کہ اس عمل کے دوران، واشنگٹن واپس آنا لکڑی کے ٹکڑے کے ساتھ ٹکرانا ہے اور میں وہ نہیں کہہ رہا ہوں جو میں حتمی طور پر سوچ رہا ہوں اور پوری صداقت سے بات کروں گا، میں بے تکلفی سے کہوں گا، اور پینسلوینیا ایوینیو کے دونوں اطراف میں بسے لوگوں کو بے خوفی سے کہوں گا کہ جو میرا یقین ہے اور جو کچھ میں سوچتا ہوں کہ وہ کرنے کی ضرورت ہے۔ میں اپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں کسی ایک شخص کا بھی مقروض نہیں ہوں۔ میں یہاں واپس آیا ہوں کہ میں وہ بہترین کام کروں جو میں اس ملک کے لیے اور یونیفارم میں موجود عورتوں اور مردوں کے لیے کر سکتا ہوں۔''

باقی سماعت بڑے پیمانے پر سٹریٹیجک معاملات کے ساتھ ساتھ انفرادی طور پر سینیٹرز کے خدشات کا احاطہ کرتی تھی۔ یہاں پیچیدہ سوالات تھے جیسا کہ مغربی ورجینیا کے سینیٹر نے پوچھا کہ کیا میں شام کے ساتھ جنگ کی حمایت کر رہا ہوں۔ (میں نے کہا، ''نہیں'')۔ اس میں کچھ ہلکے پھلکے لمحات بھی تھے جب نبراسکا کے سینیٹر بین نیلسن نے پوچھا کہ میں کیا کہتا ہوں اگر آہستہ آہستہ اسامہ بن لادن پر انعام کی رقم میں اضافہ کیا جائے جیسا کہ ہر ہفتے ایک ملین ڈالر۔ میں نے جواب دیا، ''ٹیررسٹ کے لئے ایک طاقتور گیند؟''

پہلی سماعت کوئی شام کے تین بجکر پینتالیس منٹ پر ختم ہوئی، اس کے بعد چار بجے ایک غیر ہنگامہ خیز مبارکبادی قسم کی خفیہ سماعت ہوئی۔ اسی شام آرمڈ سروسز کمیٹی نے متفقہ طور پر تمام سینیٹ کو میری تقرری کی توثیق کی سفارش کر دی۔ اگلی شام چھ دسمبر کو دو کے مقابلے میں پچانوے سینیٹرز نے میری تقرری کی توثیق کر دی جب کہ تین سینیٹرز نے ووٹ نہیں ڈالا۔ کنٹکی کے سینیٹر جم بنٹنگ اور پنسلوینیا کے سینیٹر رک سنٹورم نے میرے خلاف ووٹ ڈالا، دونوں ریپبلیکنز تھے۔ انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ میرا رویہ کتنا سخت تھا کہ ہم نے ایران کے ساتھ معاملات کو کس طرح طے کرنا ہے بشمول ملٹری ایکشن کے۔ جب کہ میرا خیال تھا کہ ہمارے ہاتھ پہلے ہی جنگوں سے بھرے ہوئے ہیں ہم نئی جنگوں کو دیکھے بغیر ان میں شامل ہیں۔ دونوں صدور بُش اور اوبامہ کے ماتحت نئی جنگوں سے اغماض برتنا ہی میرے ایجنڈے میں سب سے اوپر رہے گا۔ میں ہمیشہ اس بات پر تیار رہا کہ اتنی ہی فورس استعمال کی جائے جتنی کہ اہم امریکی مفادات کو پورا کرنے کے لئے ضروری ہو لیکن میں اس کی شدت کو بہت زیادہ بڑھا دوں گا۔ میں نے سیکریٹری اُف ڈیفنس کی توثیق ہو جانے کے باوجود اگلے بارہ دن تک نہ تو حلف اٹھایا اور نہ ہی کوئی ذمہ داری پوری کی۔ شاید یہ غیر معمولی تاخیر تھی۔ میں ٹیکزیس اے اینڈ ایم میں دسمبر کے آغاز کی تقریبات کی صدارت کو بڑی شدت سے محسوس کر رہا تھا۔ مجھے ٹیکزیس اے اینڈ ایم میں چیزوں کو سمیٹنے اور واشنگٹن ڈی سی کی طرف حرکت کرنے کے لیے کچھ وقت درکار تھا۔ لیکن اس کے برعکس خاص طور پر جنگ کے موقع پر غالباً میں نے کبھی انتظار نہیں کیا۔ لیکن عملی طور پر اس پر کوئی تنقید نہیں ہوئی، میں نے وقت کا بہت اچھا استعمال کیا۔

جب تک میں نے حلف نہیں اٹھایا مجھے پینٹا گان میں ملحق کمروں کا ایک دفتر دے دیا گیا۔ چونکہ میں نے پیپر ورک کیا تھا اس لیے مجھے اس کی تنخواہ دی گئی، میری سرکاری تصویر کھینچی گئی، میں نے اپنا آئی ڈی کارڈ اور بیجز وصول کیے۔ مجھے بھی ان تمام پروسیجرز سے گزرنا پڑا جن سے ڈیفنس میں بھرتی ہونے والے کسی بھی نئے ملازم کو گزرنا پڑتا ہے..... بشمول اس ایک کے جس کی کہ میں توقع نہیں کر رہا تھا۔ ایک صبح میں اپنے دفتر سے ملحق باتھ روم کو استعمال کرنے کے لیے گیا۔ ابھی میں نے دروازے کو بند کر کے تالہ لگایا ہی تھا اور اپنی پینٹ کی زپ کھولی تھی کہ دروازے پر مضطربانہ قسم کی گولہ باری شروع ہو گئی کوئی چلا رہا تھا ''سٹاپ! سٹاپ!!'' میں نے تشویش کے ساتھ زپ بند کی اور دروازہ کھولا۔ یہاں ایک سارجنٹ کھڑا تھا جس نے یہ کہتے ہوئے کہ ڈرگ ٹیسٹ کے لئے پیشاب کا سیمپل چاہئے میرے ہاتھ میں ایک کپ پکڑا دیا۔ حتیٰ کہ سیکریٹری اُف ڈیفنس کو بھی اس کام سے استثناء نہیں تھا۔ توثیق سے پہلے اور فوراً بعد، میں نے بہت سارا وقت یہ سوچتے ہوئے گزارا کہ پینٹا گون کو چلانے کے لیے کون سی اپروچ استعمال کی جائے، اس سیارے پر

ایک ایسے بڑے اور پیچیدہ ادارے کو جس کے تقریباً تین ملین (تیس لاکھ) سویلین اور یونیفارم والے ملازم ہوں۔ واشنگٹن میں سنیئر ایگزیکیٹو کی پوزیشن پر کام کا آغاز کرنے والے بہت سارے دوسرے لوگوں کے برخلاف دو بڑے بیوروکریسی کے اداروں کو چلانے کا تجربہ میرے پاس تھا۔ سی آئی اے اور انٹیلیجنس کمیونیٹی تقریباً ایک لاکھ ملازمین کے ساتھ اور قوم کی ساتویں بڑی یونیورسٹی تقریباً پینسٹھ ہزار اساتذہ، سٹاف اور طالب علموں کے ساتھ۔ لیکن پینٹا گون ایک مختلف چیز تھی۔ بیوروکریسی کے ایک سراسر، جن سے ہٹ کر مجھے سویلین قیادت اور محکمے کے درمیان اور بہت ساری ملٹری کی لیڈرشپ کے ساتھ الجھے ہوئے تعلقات کو ڈیل کرنا تھا، حقیقت یہی ہے کہ ہم دو بڑی جنگوں میں مصروف تھے، ان میں سے کوئی بھی جنگ ٹھیک نہیں جا رہی تھی۔

بہت سارے لوگ میری مدد کرنے کے لئے تیار تھے۔ کچھ دن بعد بہت زیادہ لوگ تھے۔ لگتا تھا کہ پنٹا گون میں ہر شخص مجھ سے ملنا چاہتا تھا یا مجھے بریفنگ پیپرز بھیجنا چاہتا تھا۔ اس سب میں میں واقعتاً ڈوبنے کے خطرے سے دوچار تھا۔ میں ڈپٹی سیکریٹری گورڈون انگلینڈ چیئرمین آف دی جائنٹ چیفس پیٹر پیس، اور رابرٹ رینگل کا شکرگزار ہوں کہ انہوں نے مجھے بچایا اور لوگوں اور تجاویز کو باضابطہ بنایا جس کی کہ مجھے ایک قابل سمجھ وضع میں ضرورت تھی۔ ان میں پنٹا گون سے باہر کی ایک بڑی تعداد بھی موجود تھی جو مجھے نصیحت کرنے کے لئے آ پہنچی تھی..... اپنے لیے کچھ بھی چاہئے بغیر، جس سے یہ حقیقت واضح ہوتی تھی کہ واشنگٹن میں رہنے والے بہت سارے لوگ یہ یقین رکھتے تھے کہ واقعتاً محکمہ پریشانی کا شکار ہے اور مجھے ملک کے لئے کامیاب ہونا ہے۔ میں جان ہمرے کے ساتھ کھانا کھانا چاہتا تھا جو صدر کلنٹن کے دوسرے دور میں ڈپٹی سیکریٹری آف ڈیفنس تھا اور بعد میں سنٹر فار اسٹریٹیجک اور بین الاقوامی سٹڈیز کی قیادت کر چکا تھا۔ جان کی وکالت واقعی سودمند تھی۔ دوسری بہت ساری چیزوں کے ساتھ اس نے پنٹا گون میں فیصلہ سازی کے مشاہدے کے متعلق بتایا کہ یہ قدیم رومن اکھاڑے کی طرح ہے۔ گلیڈی ایٹرز بادشاہ کے سامنے جنگ کرنے کے لیے پیش ہوتے ہیں اور آپ فیصلہ کرتے ہیں کہ کون جیتا ہوا ہے۔ کوئی شخص ضروری سمجھتا ھے کہ وہ یہ یقینی بنائے کہ اکھاڑے کے اندر عمل منصفانہ ہے، شفاف ہے اور بامقصد ہے۔''

جَون نے دو اور بھی کمنٹس دیے تھے جو میرے کام کرنے کے نقطہءنظر کو گہری طور پر متاثر کر سکتے تھے۔ انہوں نے وکیل رکھنے کی اہمیت پر زور دیا۔ ان کے لیے بھی جو آج کی ضروریات کی وکالت کرتے ہیں اور ان کے لیے بھی جو مستقبل کی ضرورتوں کی وکالت کرتے ہیں۔ میں بہت جلد یہ جان گیا تھا کہ وہ لوگ جو مستقبل کی جنگوں کے لیے متوقع اوزار بن سکتے ہیں، ان کی تعداد بہت زیادہ ہو جائے۔ یہ دور ہے جب کہ

ان لوگوں کا اثر و رسوخ ان لوگوں سے کہیں زیادہ ہے جو آج کی ضرورتوں کی وکالت کرتے ہیں۔ میں محاذ جنگ پر موجود فوجیوں کا سب سے بڑا وکیل بن گیا کہ ان کو جو چیزیں درکار ہیں وہ انہیں دی جائیں۔ جَون نے واضح طور پر ڈیمانڈ (میدان جنگ میں کمانڈروں کی ضروریات) کے لیے اور سپلائی (فوجیوں کو بھرتی کرنا، تربیت کرنا اور انہیں اسلحے سے لیس کرنا) کے لیے آزاد وکیل رکھنے کی اہمیت کو واضح کیا۔ محاذ جنگ پر موجود کمانڈروں کو مزید فوجی بھیجنے کی درخواستوں کو محدود کرنا چاہئے۔ اپنے یقین سے باہر..... اس نے محسوس کیا کہ انہیں جتنے فوجی درکار ہیں وہ میسر نہیں ہیں۔ نتیجتاً مجھے اصرار کرنا پڑا کہ فیلڈ کمانڈر مجھے بتائیں کہ انہیں کتنے فوجی اور کتنا ساز و سامان درکار ہے اور مجھے طے کرنے دیں کہ یہ سب کچھ کیسے حاصل کرنا ہے۔

میں نے اپنے پرانے دوست کولن پاؤل کے ساتھ بھی کچھ وقت گزارا تھا۔ میں اسے پچھلے پچیس سال سے جانتا ہوں، ہم ریگن اور جارج ایچ ڈبلیو بُش کی انتظامیہ میں اکٹھے کام کر چکے تھے۔ وہ ایک اچھے آرمی افیسر اور سابقہ چیئرمین جائنٹ چیفس آف سٹاف کی حیثیت سے، نہ صرف پنٹا گون کو بہت اچھی طرح جانتا تھا بلکہ اس نے وردی میں بہت سارے رابطوں (اور زرائع) کو برقرار رکھا تھا۔ میں نے اسے ای میل میں ایک مخصوص درخواست کی۔

''ایک جگہ آپ میری فوری مدد کر سکتے ہیں۔ آپ کسی سینئر افسر کو قائل کریں آپ اس سے بات کر سکتے ہیں کہ میں نہیں سمجھتا کہ میرے پاس تمام سوالوں کے یا کم از کم کچھ مشکل سوالوں کے جواب ہیں۔ میں ایک اچھا سامع ہوں، سب سے بڑھ کر صاف گوئی کی قدر کرتا ہوں۔ میں اُن کے تجربے اور خیالات کا احترام کروں گا۔''

یقیناً میں نے بہت سارے مشورے موصول کیے جن کا میرے نزدیک کوئی وزن نہیں تھا۔ ان میں بہت سارے سویلین اور فوجی افسران کے متعلق بیک چینل میں موافق اور مخالف تبصرے بھی تھے۔ بہت سارے اُن لوگوں نے میرے ساتھ رابطہ کیا جو رمز فیلیڈ کی متوقع سویلین ٹیم میں میری طرف سے متوقع چھانٹی کے نتیجہ میں خالی ہونے والی آسامیوں کو پر کرنے میں اپنی دلچسپی رکھتے تھے۔ بہت سارے لوگوں نے مجھے اپنی عبوری ٹیم بھرتی کرنے کا مشورہ دیا جو میری تمام ذاتی اور پالیسی تبدیلیوں کی نگرانی کر سکے، جنہیں میں نے بلاشک وشبہ کرنا تھا۔

میں نے جانشینی کے وقفے کے دوران محکمے کی نگہداری کے متعلق ایک اہم فیصلہ کیا۔ یہ میرے کیے ہوئے فیصلوں میں سب سے بہترین تھا۔ میں نے یہ فیصلہ کیا کہ میں پنٹا گون میں کسی اسسٹنٹ یا سیکریٹری کو ساتھ لیے بغیر اکیلا جاؤں گا۔ میں نے اکثر دیکھا ہے کہ جب نیا باس اپنے مصاحبوں کے ساتھ آتا ہے تو

ارگنائزیشنز کچوش وخروش پر بہت زیادہ منفی اثر مرتب ہوتا ہے۔ یہ ہمیشہ دشمنی کے ساتھ قبضہ کرنے کے جیسے خواص لیے ہوتا ہے اور غصے کے جذبات پیدا کرتا ہے اور یقیناً نئے آنے والوں کو کوئی اتا پتہ نہیں ہوتا کہ ان کے روزگار کی نئی جگہوں پر کیسے کام ہوتا ہے۔ اس لیے یہاں کسی کو بھی فارغ نہیں کیا جائے گا۔ جنگ کے دنوں میں میرے پاس کوئی وقت نہیں ہے کہ میں نئے لوگوں کو تلاش کروں جب کہ ہم نئے بھرتی ہونے والوں کے لیے کام کے دوران تربیت کے عیش وآرام کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ نہ ہی ہمارے پاس وقت ہے کہ نئی سیاسی تقرریوں کی مناسب تصدیق کر سکیں۔ میں نے تمام لوگوں کو رکھ لیا۔ اگرچہ یہ قانونی طور پر شاید نادرست ہو لیکن میں نے رابرٹ رینگل کو چیف آف سٹاف رہنے دیا، جب کہ ڈیلاونائی ہنری، کو سیکریٹری کا خفیہ اسسٹنٹ، ترتیب کار مرتب کرنے والے شیڈیولر، اور اردگرد کے بہت سے کام کرنے والے کھلاڑی کے طور پر رکھ لیا۔ اگر کوئی شخص کام کا نہیں ہے یا اس کی کیمسٹری میں خرابی ہے تو میں اسے بعد میں تبدیل کروں گا۔ دوران جنگ تسلسل، جیسا کہ مجھے لگتا تھا کہ یہ ایک گیم کا نام ہے۔ میں چاہتا تھا کہ کچھ کہے بغیر ان پر اعتماد کروں کہ ٹیم کو سرگرم اور پیشہ ور افراد سے بنایا گیا تھا۔ میں مایوس نہیں ہونا چاہتا تھا۔

میں انڈر سیکریٹری آف ڈیفنس فار انٹیلیجنس کی ایک سینئر ویکنسی کو پُر کرنا چاہتا تھا۔ پہلے سے موجود، سٹیو کیم بون، پہلے ہی استعفیٰ دے کر جا چکا تھا۔ توثیق ہونے سے پہلے ہی میں اپنے ایک اور پرانے دوست اور ساتھی، ریٹائرڈ ایئر فورس لیفٹیننٹ جنرل جم کلے پر کو عہدہ سنبھالنے کے لئے کہہ چکا تھا۔ جب میں سی آئی اے کا ڈائریکٹر تھا تو اس وقت جم انٹیلیجنس ایجنسی کا ڈائریکٹر تھا۔ آگے چل کر وہ ملٹری سے ریٹائر ہوا اور اس کے بعد وہ نیشنل جیوسپیشل انٹیلیجنس ایجنسی (NGIA)، جو کہ ایک بے ڈھنگے طریقے سے دیے گئے نام کا ایک ادارہ ہے، جو امریکہ کے تمام فوٹو گرافی کے مصنوعی سیاروں اور ان تصویروں کی تاویل کرنے والے ادارے کی ذمہ داری اٹھاتا ہے، کا ڈائریکٹر بن گیا۔ چونکہ کلے پر ایک مضبوط ڈائریکٹر انٹیلیجنس کے طور پر مقبول تھا اس کو تمام انٹیلیجنس کمیونٹی بشمول ڈیفنس کے اداروں پر، حقیقی طور پر پورا کنٹرول حاصل تھا۔ اس نے رمزفیلڈ کے الجھائے ہوئے معاملات کو سلجھایا تھا، تمام عملی مقاصد کے لیے اسے نیشنل جیوسپیشل انٹیلیجنس ایجنسی کی نوکری سے نکال دیا گیا۔ اسے گورنمنٹ سے نکلے ہوئے ابھی چند ماہ ہی ہوئے تھے جب میں نے اسے واپس گورنمنٹ میں آنے کو کہا۔ اس پر پنٹا گون انٹیلیجنس آپریشن کی کانگرس اور پریس میں بہت زیادہ تنقید ہوئی۔ مجھے یقین تھا کہ جم جیسے تجربہ کار اور ایماندار آدمی کو یہاں لانے سے فوری طور پر حالات کو سدھارنے میں مدد ملے گی۔ مجھے اس پر پورا اعتماد تھا۔ اس نے بڑی ہچکچاہٹ کے ساتھ اس نوکری پر آنے کی حامی بھری لیکن ایک شرط کے ساتھ کہ میں اس کی بیوی سُو، کو بلوا کر یہ بتاؤں کہ اس کے لئے کتنا اہم ہے کہ وہ

یہ کام کرے۔ ایسا مجھے پہلی دفعہ کہا گیا تھا لیکن یہ میں نے کیا۔ سُو میری شکر گزار تھی کہ ایک دفعہ پھر قومی خدمت کے لیے ان کی زندگیوں میں خلل ڈالا جا رہا تھا۔

جیسا کہ میں نے کہا ہم دونوں، بیکی اور میرے لئے ٹیکزیس اے اینڈ ایم کو چھوڑنا کتنا مشکل تھا۔ یہاں دفتر میں آخری دن کوئی دس ہزار کے قریب طلباء اور اساتذہ اور سٹاف مجھے خدا حافظ کہنے کے لیے اکٹھے ہوئے۔ طلباء کی سٹوڈنٹ باڈی کے صدر نے تقریر کی۔ میں نے تقریر کی اور ہم نے مل کر ٹیکزیس اے اینڈ ایم کی ''جنگی نظم'' گائی۔ یہاں تین تقریبات کا اغاز ہوا اس کے بعد ٹیکزیس اے اینڈ ایم میں میرے فرائض کا باقاعدہ اختتام ہوا۔

ہم نے اتوار سترہ دسمبر کو واشنگٹن ڈی سی آنے کے لیے ہوائی سفر شروع کیا تا کہ میں اپنی نئی ذمہ داریاں سنبھال سکوں۔ اگلے دن سوا ایک بجے میری حلف برداری کی تقریب تھی۔ میرے تمام خاندان کے ساتھ ساتھ، صدر اور نائب صدر دونوں یہاں موجود تھے۔ میں نے سپریم کورٹ کی صدر سانڈرا ڈے اوکونر کو حلف لینے کا کہا۔ اس نے پندرہ سال پہلے بھی ایسا ہی ایک حلف مجھ سے لیا تھا جب میں نے سنٹرل انٹیلیجنس کے ڈائریکٹر کے طور پر ذمہ داری سنبھالی تھی۔ سفری مشکلات کے باعث اس دفعہ وہ ایسا کر نہ سکی لہذا میں نے نائب صدر ڈک چینی کو حلف لینے کے لئے کہا۔ میں نے اسے اس کے ساتھ دوستی اور احترام کے استعارے کے طور پر لیا۔ بیکی نے بائبل کی اس کتاب کو پکڑا ہوا تھا جسے میرے والدین نے سولہ سال کی عمر میں میری سالگرہ پر مجھے دیا تھا۔

اس کے اٹھاون دن بعد میری سٹیو ہیڈلی سے بات ہوئی۔ میں سیکریٹری آف ڈیفنس تھا جسے دنیا کی تاریخ میں بہترین آرمی کے لیڈر کے طور پر دو جنگوں کی لڑائی کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ میں نے اپنے ریمارکس میں کہا کہ میں بہت جلد عراق جا کر اپنے کمانڈرز سے ملوں گا تا کہ ان سے راہنمائی حاصل کر سکوں..... ''بغیر کسی رنگ وروغن کے اور کندھے کے بالکل سامنے سے.....'' کہ آنے والے ہفتوں اور مہینوں میں آگے کیسے بڑھا جائے۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ افغانستان میں آگے بڑھنے میں رسک تھا۔ ہم نے اپنی وابستگی کو برقرار رکھنے کا ارادہ کیا۔ موضوع پر رہتے ہوئے میں نے اپنی تصدیقی سماعت کے دوران اظہار کیا تھا۔ اگلے دو سال یہ تعین کریں گے کہ خطے میں ہم نے یہ اور اس طرح کے دوسرے چیلنجوں کا کس طرح مقابلہ کیا تھا۔ اَیا عراق، افغانستان اور دوسری قومیں جو دہشت گردی کی اس جنگ میں ہماری اتحادی ہیں، اس چوراہے پر پائیدار حکومتوں کی جانب بتدریج ترقی کے راستے پر پیروی کریں گی یا دہشت پسند اور افراتفری کی قوتیں غالب آ جائیں گی۔ ہم تمام لوگ چاہتے ہیں کہ ایسا راستہ نکالا جائے کہ امریکہ کے تمام بیٹے اور بیٹیاں

اپنے گھروں کو واپس آجائیں۔ جیسا کے صدر صاحب نے واضح طور پر کہا ہے کہ ہم مشرق وسطی میں ناکام ہونے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ اس موقع پر عراق میں ہماری ناکامی ایک ایسی آفت ہوگی جس سے ہماری قوم پریشان ہوگی، ہماری ساکھ کو نقصان پہنچے گا اور اگلی کئی دہائیوں تک امریکہ خطرے میں رہے گا۔

کئی گھنٹے بعد اس میں ایک مزاح کی بات شامل کر دی گئی۔ حلف برداری کے دوران میرے ریمارکس تھے، میں نے کہا تھا کہ میری ترانوے سالہ والدہ بھی اس تقریب میں شامل ہے۔ کامیڈین کانن اوبرائن نے اس رات اپنے شو میں اسے اٹھایا۔ اس نے مذاق میں کہا کہ میری ماں اس تقریب کے بعد میرے پاس آئی تھی، اس نے مبارک باد دی اور پھر مجھے کہا کہ

''اب جاؤ اور قیصر کے گدھے کو دولتی مارو۔''

◀◀ ● ▶▶

677-R-1 JoharTown ,Lahore (Pakistan)
cell 03337822782

نام کتاب: پچھلی پیت کے کارنے صنف: شاعری مصنف: خورشید اکرم سن اشاعت: ۲۰۱۲ صفحات: ۱۲۰ قیمت: ۲۰۰ روپے پتہ: ایف۔۱۹/۱۴، نفیس روڈ، جوگا بائی ایکسٹینشن، اوکھلا، نئی دہلی۔۱۱۰۰۲۵	نام کتاب: پچھلی پیت کے کارنے: عکس و نقش صنف: تنقید مصنف: اظہار احمد ندیم سن اشاعت: ۲۰۱۵ صفحات: ۱۶۰ قیمت: ۲۰۰/روپے پتہ: اے۔۱۷۰، گراؤنڈ فلور، ۳/ سوریا اپارٹمنٹ، دلشاد کالونی، دہلی۔۱۱۰۰۹۵
نام کتاب: افسانہ نگار: احمد ندیم قاسمی.....آثار و افکار صنف: تنقید مصنفہ: ڈاکٹر افشاں ملک سن اشاعت: ۲۰۰۸ صفحات: ۲۷۲ قیمت: ۲۰۰/روپے پتہ: ایس۔۴، عظیم اسٹیٹ، نیو سر سید نگر، میڈیکل روڈ، علی گڑھ۔۲۰۲۰۰۲ (یوپی)	نام کتاب: دسترس صنف: شاعری مصنف: احمد اشفاق سن اشاعت: ۲۰۱۴ صفحات: ۱۶۰ قیمت: ۱۵۰/روپے رابطہ: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۱۱۰۰۰۶

- **پوسٹ مارٹم**
- **صفدر امام قادری**

اے دلِ آوارہ: شموئل احمد کی عمرِ گذشتہ کی کتاب

اردو رسائل کے صفحات پر جب یہ شور برپا ہوا کہ شموئل احمد کی خودنوشت شائع ہو رہی ہے تو دوسرے قارئین کی طرح مجھے بھی اس بات کا انتظار تھا کہ ایک ناول نگار اور افسانہ نگار اپنی زندگی کی کتاب کو کس طرح اُدھیڑتا اور بُنتا ہے۔ کتاب کا نام 'اے دلِ آوارہ' سے اور بھی اشتیاق بڑھا کہ اپنے افسانوں کے کرداروں کو جہاں انھوں نے چھوڑ دیا تھا، شاید وہاں سے آگے کا سفر اس کتاب کا حصّہ بنے گا۔ دیدہ زیب طباعت کے ساتھ جب یہ کتاب منظرِ عام پر آئی تو سرورق پر قوسین میں 'ناول' لفظ چھپا دیکھ کر ذرا حیرت ہوئی کیوں کہ وہیں یہ بھی لکھا ہوا موجود ہے کہ یہ 'عمرِ گذشتہ کی کتاب' ہے۔ یہ 'شترگُربہ' ناشر اور مصنّف دونوں کی غالباً سوچی سمجھی حکمتِ عملی ہے۔ حقائق کی بنیادوں سے اگر آپ بازپُرس کرتے ہیں تو مصنّف نے پہلے سے ہی بچاو میں ناول کی تختی لگا رکھی ہے۔ اسی طرح اگر آپ فکشن کے اصولوں کو بنیاد بنا کر جانچ پرکھ کرنا چاہیں تو مصنف کے لیے زرہ کے طور پر پہلے ہی سے خودنوشت کا اعلان موجود ہے۔ سختی سے اس کیفیت کا جائزہ لیں تو کہنا چاہیے کہ کتاب پیش کرتے ہوئے مصنف کے پاس شاید وہ اعتماد نہیں جس کی طاقت پر وہ ڈنکے کی چوٹ کے ساتھ اپنی کتاب کے نفسِ مضمون یا صنف کا اعلان کرتا ہے۔

شموئل احمد اپنے ہم عصروں میں خود سے بعض بہتر لکھنے والوں سے زیادہ شہرت رکھتے ہیں۔ تھوڑے سے افسانے، ایک ناول، ایک ناولٹ، چند مضامین اور مُٹھی بھر تراجم۔ غور کریں تو ان کی ادبی زندگی کے طول کے مقابل مختصر پونجی یہ بتاتی ہے کہ انھوں نے بہت کم لکھا ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان کی ادبی زندگی میں طویل وقفے آئے جن کی وجہ سے انھیں دوبارہ اپنی شناخت کے لیے نئے سرے سے میدان میں اُترنا پڑا۔ ان کی تصنیف و تالیف کی عمر چار دہائیوں سے اوپر ہے لیکن ابتدائی بیس برسوں میں انھیں کبھی قابلِ اعتنا نہ سمجھا گیا۔ ان کے افسانوی مجموعے 'بگولے' کو شاید ہی کسی قاری نے اس سنجیدگی سے قبول کیا ہو جس سے یہ بات سمجھ میں آسکے کہ اس کتاب کا مصنف آنے والے وقت میں اعتبار حاصل کرے

گا۔ یوں بھی ابتدائی زمانے میں وہ گنڈے دار افسانہ نگار تھے۔ کہیں کوئی چیز چھپ گئی اور پھر برسوں کسی نئی تحریر کا پتا نہیں جب کہ ان کے دیگر ہم عصروں میں یہ کیفیت نہیں تھی۔ شوکت حیات، سلام بن رزاق، ساجد رشید، حسین الحق، عبدالصمد، شفق وغیرہ کے یہاں تواتر کے ساتھ لکھنے کا ایک انداز قائم رہا ہے۔

۱۹۹۰ء کی دہائی میں شموئل احمد اچانک اہم لکھنے والے کے طور پر ابھرنے لگے۔ خاص طور سے زبیر رضوی 'ذہن جدید' سے اور راجندر یادو 'ہنس' کی معرفت کچھ اس اہتمام سے شموئل احمد کی ادبی پشت پناہی کرنے لگے جیسے آنے والا وقت اب اسی فنکار کا ہوگا۔ گذشتہ بیس برسوں کا احتساب کیجیے تو یہ بات آسانی سے سمجھ میں آجائے گی کہ شموئل احمد نے اپنے تمام ہم عصروں کو تواتر کے ساتھ اشاعت اور شہرت کے معاملے میں پیچھے چھوڑ دیا۔ صارفیت اور تعلقات عامّہ کی کمزور نس پر شموئل احمد نے کچھ ایسی پختگی سے اپنی انگلی رکھی کہ ادبی کامیابیوں کی تمام شاداب فصلیں انھی کے گھر آنگن میں گریں۔ اس دوران انھوں نے اپنے دوسرے ہم عصروں سے کم نہیں لکھا اور جہاں جیسی ضرورت ہوئی، اس انداز کی دیگر قماش کی تحریریں بھی پیش کیں۔ افسانے اور ناول کے علاوہ انھوں نے اردو ہندی دونوں زبانوں میں چند مضامین، خاکے اور متفرقات پیش کر کے اپنے فکشن نگار کو بیرونی طاقت سے استحکام عطا کیا۔ اس کے نتیجے میں ان کی ادبی زندگی میں جو وقفے آئے تھے، ان سب کی بھرپائی بہ احسن ہوگئی اور وہ ہم عصر اردو فکشن کی ایک ایسی شخصیت بن جانے میں کامیاب ہوگئے جس کی خدمات پر گفتگو کیے بغیر ہم عصر ادب کی تاریخ ادھوری رہتی ہے۔

'ذہن جدید' میں شموئل احمد کی پہلی تحریر شائع کرتے ہوئے معتبر شاعر اور اس وقت کے مبتدی مدیر زبیر رضوی نے شموئل احمد کا تعارف کچھ اس طور پر کرایا تھا کہ یہ ہمیں بہار کی ادبی سیاست سے باخبر رکھتے ہیں۔ اس وقت تک شموئل احمد مشہور لکھنے والوں میں شامل نہیں ہوئے تھے۔ کسی اہل قلم کا اس انداز کا تعارف اس کی توصیف ہے یا تضحیک، یہ قابلِ غور ہے۔ اس دوران شموئل احمد کے بعض انٹرویو اور چند ایسے مضامین بھی شائع ہوئے جن سے زبیر رضوی کے اس تعارف کی توثیق ہوتی رہی۔ اپنے ادبی معاملات میں چاق و چوبند اور دوسروں سے ہزار شکایتیں۔ اس انداز کی ان کی ہر تحریر سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ان کے ادبی مقام سے لوگوں نے سازشاً بے اعتنائی برتی ہے۔ قطر کے انعام کے بعد بھی ان کے بیانات سے ہمیں یہی اندازہ ہوا کہ ان کے ساتھ ان کے عہد نے انصاف نہیں کیا اور ہم عصروں نے تو ہمیشہ حق تلفی ہی کی۔ اردو کا ہر فکشن لکھنے والا نقّاد ان کے تئیں رشک و رقابت کا شکار ہے حالاں کہ حقیقی صورتِ حال ٹھیک معکوسی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ شموئل احمد نے یہ خودنوشت بہت حد تک ادبی سیاست کے دائرۂ کار میں رہتے ہوئے مکمّل کی ہے۔ اس لیے اپنی ادبی، سماجی فتوحات پر بھرپور ارتکاز قائم رکھا گیا ہے۔ ضمنی طور پر ہی

دوسروں کے احوال یا ان کے عہد کے معاملات روشن ہوتے ہیں۔ یہاں بھی ادبی مقام کے لیے شکوہ و شکایت کا سلسلہ موجود ہے۔ اپنے بارے میں لکھتے ہوئے گہری باتوں تک پہنچنے کا کچھ زیادہ شوق یا مشقّت شموئل احمد کے یہاں نہیں ہے۔ خواتین کی صحبتوں کی نمک مرچ کے ساتھ تفصیل پیش کرنے میں شموئل احمد کا دل لگتا ہے۔ یہ ان کے افسانوں سے بڑھ کر اس خودنوشت میں موجود ہے۔ ناول کی حیثیت سے تو شاید اس کتاب کے ایک صفحے کو بھی کوئی وقار حاصل نہیں ہوسکتا اور اپنی زندگی کے مرتب احوال کی پیش کش کے اعتبار سے غور کریں تو یہ خودنوشت فلمی اصطلاح میں Rushes کی شکل میں ہی ہمارے سامنے پیش ہوتی ہے۔ شموئل احمد کے افسانوں میں بکھراو کی کیفیت کم رہتی ہے اور کرداروں اور موضوعات پر وہ بھرپور ارتکاز قائم رکھتے ہیں لیکن اس خودنوشت میں سب کچھ بکھرا بکھرا اور غیر مرتّب معلوم ہوتا ہے۔ زبان کی ڈور بھی اکثر و بیشتر ہاتھ سے چھوٹ جاتی ہے۔ اپنے عہد کا ایک ممتاز فکشن نویس سیکڑوں صفحات سیاہ کرتا جاتا ہے لیکن ہزار جملوں کے بعد بھی شاید ہی کبھی کوئی ایک اچھا تخلیقی جملہ یا نفیس طرزِ اظہار میّسر آتا ہے۔

ایک قاری کی حیثیت سے یہ بات قابلِ غور ہے کہ شموئل احمد کو اس خودنوشت کے لکھنے کی ضرورت کیا تھی؟ اسے شاید اتفاق کہنا چاہیے کہ ان کی نسل کے کسی اہم لکھنے والے نے اپنی خودنوشت نہیں لکھی۔ ان کے بزرگ افسانہ نگاروں میں عابد سہیل کی خودنوشت پچھلے دنوں آئی اور راشد انور راشد کے سوالوں کے جواب کے وسیلے سے قاضی عبدالستّار کی خودنوشت سامنے آئی۔ اردو کی خودنوشتوں کی تاریخ پر سرسری نگاہ ڈالیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اکثر و بیشتر لکھنے والوں نے اس کام کو سنجیدگی سے کیا اور کوشش یہ کی کہ اپنی زندگی کے احوال، عہد اور معاصرین کے تناظر میں ترتیب کے ساتھ پیش کریں۔ خاص طور سے جنھوں نے اپنے بزرگوں کی آنکھیں دیکھی تھیں اور نئی دنیا کو بنتے اور بدلتے دیکھا تھا، ان کی جہاں دیدنی کا مظاہرہ ان کی خودنوشتوں میں ہوا ہے۔ ہاں بعض خودنوشتیں چٹخارہ پیدا کرنے کے لیے ہی لکھی گئی تھیں لیکن شموئل احمد 'یادوں کی برات' کے کس نشانے کو پار کر سکتے ہیں؟ جوش کی آوارگی کے سامنے 'اے دلِ آوارہ' کی آوارگی شرافت اور تہذیب کا بدل ہی ہے لیکن جوش کی جہاں دیدنی، بڑے لوگوں کی صحبتیں اور زبان کا تخلیقی اظہار سب کے حصے میں کہاں سے آئے گا؟۔ باتوں کو صاف صاف کہنے کا بولڈ انداز بھی جوش کی شناخت ہے چاہے وہ واقعہ سچّا ہو یا جھوٹا۔ اس لیے تمام تر چٹخارے کو منہا کر دینے کے باوجود جوش کی خودنوشت اردو کی بڑی کتابوں میں شامل ہے لیکن شموئل احمد کی یہ تصنیف زبان کے پھیکے پن اور تجربات یا جہاں دیدنی کے سرسری ذائقے کے سبب اوسط درجے کی خودنوشت کے طور پر شمار کرنے لائق بھی شاید ہی معلوم پڑے۔

شموئل احمد نے نہ جانے کس عالم میں یہ جملہ لکھا: ''مجھے وہ لوگ پسند ہیں جو اپنی بدعتی قبول کرتے

ہیں۔'' [ص:۱۴] بدعت اور بدعتی کے اصطلاحی معنیٰ ہر چند کہ الگ ہیں لیکن شموئل احمد نے اس جملے کو اپنی دوست رینو گپتا کے سلسلے سے استعمال کیا ہے۔ رینو گپتا نے خود سے اپنی شراب نوشی کا ذکر اور اقرار کیا۔ اس اعتبار سے شموئل احمد نے بدعتی کے معنیٰ یہ مخصوص کیے کہ سماجی اصول وضوابط سے پَرے جا کر کوئی کام کرنا اور اس کا بَرملا اظہار ہی بدعت ہے۔ واقعی یہ ایک باغیانہ صفت ہے اور اس کے سلاسل مجاہدین اور صوفیوں تک پہنچتے ہیں لیکن شموئل احمد اسے نہایت محدود معنوں میں پیش کرتے ہیں۔ ان کے یہاں بدعت یا بغاوت صرف عورت مرد کے آزادانہ رشتوں تک محدود ہے۔ وہاں بھی تذکرے میں لذّتیت اور چٹخارہ زیادہ ہے، زندگی کا کیف یا طبیعت کی ضرورت کی سنجیدگی کبھی کبھی ہی سامنے آتی ہے۔ اس خودنوشت میں عورتیں ،لڑکیاں اور معمّر خواتین کے متعدد کردار مصنف کے حلقۂ اثر میں آتے ہیں۔ مصنف اِن سب میں پوری توجہ اور انہماک کے ساتھ شامل ہوتا ہے۔ سگریٹ، شراب، بہ قولِ غالب 'پیش دستی' اور کبھی کبھی اس سے آگے کی منزلیں بھی سامنے آتی ہیں لیکن اکثر واقعات ایک جیسے انداز میں شروع اور ختم ہوتے ہیں جس سے یہ دھوکا ہوتا ہے کہ ان میں حقیقی عنصر کم اور فکشن زیادہ ہے۔

''اے دلِ آوارہ'' کتاب خاصے افسانوی انداز میں شروع ہوتی ہے۔ ابتدائی جملوں میں مصنف نے خواتین سے اپنی دلچسپیوں کا بڑے لبھاونے انداز میں تذکرہ کیا ہے۔ شموئل احمد کی زبان سے ہی وہ بات سنیے کہ عورتوں کی گفتگو، سگریٹ اور شراب کی محفلوں میں انھیں کیا حاصل ہوتا ہے:

- ''مجھے سگریٹ پینے والی عورتیں اچھی لگتی ہیں۔۔۔ ایسی عورتوں میں ایک طرح کا کھُلا پن ہوتا ہے۔ آپ اُن سے بہت نجی باتیں شیئر کر سکتے ہیں۔ کسی رستراں کے نیم اندھیرے گوشے میں مشروبات کی ہلکی ہلکی چُسکیوں کے ساتھ ان سے گفتگو کا لطف کچھ اور ہی ہے۔ میرے افسانوں میں اگر صنفِ نازک کے لطیف احساسات کی دروں بینی ہے تو اس کی وجہ میری اُن سے والہانہ گفتگو ہے جہاں اُن کے ذاتی تجربات سے روبرو ہونے کا موقع ملتا ہے۔'' [ص:۶-۵]

یہاں شموئل احمد کی خصوصی دلچسپیوں کی بہ آسانی پہچان کی جا سکتی ہے۔ دنیا کی تاریخ میں بہت سارے ایسے شاعر، مصوّر اور بت ساز ملتے ہیں جنھوں نے حقیقی زندگی کے کرداروں کو اپنی تخلیقی قوت سے

زندۂ جاوید کر دیا۔ پکاسو کی بہت ساری عریاں تصویریں حقیقی کرداروں کی انھی حالتوں کی عکّاسی ہیں لیکن ہر مصوّر کے پاس نہ پکاسو کی آنکھ ہوتی ہے اور ویسا باکرشمہ موقلم۔ پکاسو کی نقل کرنے والے صفحۂ قرطاس پر بے روپ لکیریں ہی پیدا کر پاتے ہیں۔ شموئل احمد بھلے اپنی زبان سے اپنے افسانوں میں 'لطیفِ احساسات کی دروں بینی' کی بات کہتے ہوں لیکن یہ بڑی چیز ہے اور اس کا عشرِ عشیر بھی حاصل ہو جائے تو لکھنے والا با اعتبار بن جائے گا۔

شموئل احمد نے چوں کہ کتاب کا نام 'اے دلِ آوارہ' طے کیا تھا، اس لیے انھیں اس کیفیت کی وضاحت کرنی ہی تھی لیکن لفظِ 'آوارہ' کو انھوں نے اچھے خاصے محدود معنوں میں قید کر دیا حالاں کہ ہمارے بزرگوں نے اس لفظ میں پوری تہہ داری پیوست کر رکھی تھی۔ اب ذرا دیکھیے کہ شموئل احمد 'آوارہ' اور 'آوارگی' کے کیا مفاہیم طے کرتے ہیں:

- ''آوارگی کی عمر نہیں ہوتی۔ آدمی عمر کے ہر حصّے میں کہیں نہ کہیں آوارہ ہے۔ آدمی ختم ہو جاتا ہے، آوارگی بچی رہتی ہے۔ اس کا سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ آوارگی ابدی ہے۔'' [ص:۱۹]
- ''آوارگی میری طاقت بھی ہے اور میری تخلیقیت کا منبع بھی..... تھوڑی بہت آوارگی تو فن کار میں ہونی ہی چاہیے..... بہت محفوظ زندگی جینے والوں کی تخلیقیت آہستہ آہستہ مرنے لگتی ہے۔'' [ص:۶]

جب 'آوارگی ان کی تخلیقیت کا منبع ہو تو یہ دیکھنا چاہیے کہ آخر اس سے ان کے یہاں کس انداز کا فیض پہنچتا ہے۔ فنکار کہاں کہاں سے اپنی کہانیاں تلاش کرتا ہے اور حقیقی کرداروں کو کس انداز سے کاغذ پر اتارتا ہے۔ پہلے شموئل احمد کی زبانی یہ سنیے کہ ان کے افسانے اور کردار کہاں کہاں سے انھیں میسّر آئے:

- ''میں کہانی سوچ کر نہیں لکھتا، مجھے کہانی سوجھتی نہیں ہے۔ مجھے کہانی مل جاتی ہے..... 'بگولے' رانچی جانے والی بس پر ملی..... کہانی 'سنگھاردان' مجھے راحت کیمپ میں ملی۔'' [ص:۹-۷]
- ''اسی جذبے کو لے کر میں نے کہانی 'بگولے' لکھی۔ کہانی

ہٹ ہوئی۔ اس کا بہت سی زبانوں میں ترجمہ ہوا..... پٹنہ کے ایک ہندی ادیب نے کہانی چوری کر لی۔ میں نے پریس کانفرنس کی اور چوری کی خبر ہر جگہ چھپی۔'' [ص:۹-۸]

- ''میں نے امام کی کہانی لکھی۔ 'اونٹ' جس کا خمیر شمعون کی کارگزاریوں سے تیار کیا۔'' [ص:۸۵]
- ''میں نے اپنی کہانی 'اونٹ' میں سکینہ کے جسم کا جو بیان کیا ہے، وہ اسی چڑیل (بنگلہ دیشی مہاجر) کا جسم ہے۔'' [ص:۹۲]

شموئل احمد نے اپنی آوارگی سے تخلیقی تنومندی حاصل کرنے کی تفصیل پیش کرنے میں زیادہ توجہ دی ہے لیکن خودنوشت میں اپنے بعض دوستوں یا دوست نما رشتے داروں کے بہانے جو واقعات جمع کیے گئے ہیں، وہاں ان کا دلِ آوارہ بڑے قرار سے دھڑکتا ہے۔ بیان میں دوسروں کے سہارے لذّتیت کا ایک ایسا ہنر آزمایا گیا ہے جیسے شموئل احمد صرف آنکھوں دیکھے واقعات پیش کر رہے ہیں لیکن ان کے چند مختصر اقتباسات اس طور پر ملاحظہ کیجیے کہ وہ باتیں کتنے Involvement کے ساتھ پیش کرتے ہیں:

- ''(رینو گپتا) کہتی ہے کہ بہت حسین بیوی نہیں ہوتی۔ بہت حسین طوائف ہوتی ہے۔'' [ص:۱۴]
- ''اس (رینو گپتا) کی نظر میں میاں بیوی کا رشتہ مالک اور غلام کا رشتہ ہے جس میں مالک کوئی نہیں ہے، دونوں غلام ہیں۔'' [ص:۱۴]
- ''کچھ دن بعد شمعون بھی بھاگل پور آیا..... میں نے ایسا ڈان جیوآن ٹائپ آدمی کہیں نہیں دیکھا۔ وہ مجھے اپنے (اپنی؟) فتوحات کے قصّے سناتا کہ کہاں کس لڑکی کے ساتھ ہم بستر ہوا۔ اس کی فہرست میں زیادہ تر شادی شدہ عورتیں تھیں۔ اس کی منطق تھی کہ شادی شدہ عورتوں سے رومانس میں ہر طرح کا تحفّظ ہے۔ اگر انھیں حمل بھی ٹھہر

جائے تو کریڈٹ اُن کے شوہروں کو جاتا ہے..... وہ چھوٹے موٹے اخراجات بھی پورے کرتی رہتی ہیں۔ وہ یہ بھی کہتا تھا کہ کچھ لڑکیاں ہوتی ہیں جن سے عشق کیا جا سکتا ہے، شادی نہیں کی جا سکتی اور کچھ ایسی ہوتی ہیں کہ شادی کی جا سکتی ہے، عشق نہیں کیا جا سکتا۔ مجھے ایسی لڑکی سے شادی کا مشورہ دیتا جو ہنس مُکھ ہو اور ایک سے ایک کھانا پکانا جانتی ہو۔'' [ص:۷۷]

- ''میں سمجھتا ہوں، ہر آدمی کے اندر ایک ڈان جیوآن ہوتا ہے جو حالات کے اعتبار سے اپنا رنگ دکھاتا ہے۔ میں ایک افسانہ نگار کی مثال دینا چاہوں گا..... میں پہلے اس خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ میں نے جنس کی نفسیات کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور مرد و زن کے تعلّقات کو سمجھتا ہوں لیکن اس شخص سے ملنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ میں احمق ہوں۔ میرے پاس کتابی گیان تھا اور اس کے پاس تجربہ تھا..... دل چسپ بات یہ ہے کہ اس کے افسانوں میں سیکس کہیں نہیں ہے۔'' [ص:۸۸]

اسی سلسلے سے شموئل احمد کے چند اور تاثرات بھی ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں جہاں وہ عورتوں کے بارے میں بعض جملے تخلیقی شان اور آن بان کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ یہاں وہ افسانہ نگار اور صنفِ نازک کی نفسیات کے شناور کی طرح سامنے آتے ہیں۔ ایسی مثالیں زیادہ تو نہیں لیکن جب کبھی ان کا قلم رنگ پہ آتا ہے تو ایسے جملے سامنے آتے ہیں:

- ''مجھے لگتا ہے، عورت اور بلّی دونوں ہی ایک پیار بھرے لمس کے لیے ہمیشہ ہی ترستی ہیں۔'' [ص:۵۳]
- ''لومڑی کی طرح چالاک اور شیر کی طرح نڈر آدمی ہی پرائی عورت کو اپنی بانہوں میں بھر سکتا ہے۔'' [ص:۸۲]
- ''جس سے شادی ہوتی ہے، وہ بیوی ہوتی ہے اور جو محبوبہ

ہوتی ہے، وہ عورت ہوتی ہے۔'' [ص:۸۶]

'اے دلِ آوارہ' خودنوشت ہے، اس لیے دوسروں کے جلوؤں کے ساتھ شموئل احمد نے اپنی کیفیات کے لیے بھی تھوڑی سی جگہ رکھی۔ بڑا حصہ تو واقعات پر مشتمل ہے لیکن کہیں کہیں نفسیاتی توجّہ کے ساتھ اپنے آپ کو پہچاننے اور سمجھنے کی کوشش بھی ملتی ہے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ خودشناسی اور دروں بینی کا یہ عمل ضمنی طور پر ہی درجِ گزٹ ہوا ہے ورنہ شموئل احمد اپنی فتوحات اور دوسروں کی زندگی کے چٹخارے میں ہی زیادہ الجھے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ چند اقتباسات سے ایک ایسے شموئل احمد کو تلاش کیا جا سکتا ہے جو اِس کتاب سے پہلے لوگوں کی نظر میں نہیں آیا تھا۔ ملاحظہ ہو:

- ''گھر میں سبھی خوب صورت تھے۔ حسن سب سے کم میرے ہی حصّے میں آیا۔'' [ص:۲۳]
- ''مجھ میں پرتبھا (صلاحیت) کی کمی رہی ہے..... میں اپنی راہ الگ نہیں بنا سکا۔'' [ص:۲۱]
- ''آلوک دھنوا کی یہی آگ شاعری کے سانچے میں ڈھلی ہے..... مجھ میں یہ آگ نہیں ہے..... یہ جلائی نہیں جا سکتی۔ یہ آگ پیدا ہوتی ہے۔ آدمی اسے لے کر پیدا ہوتا ہے۔ مجھ میں ایک طرح کا ٹھنڈا پن ہے۔'' [ص:۳۰]
- ''میں کمزور ہوں۔ مجھے سہارا چاہیے۔ ماچس کی ڈبیا بھی نیچے گر جاتی ہے تو میں دیکھتا ہوں، کوئی اٹھانے والا ہے یا نہیں؟ کہیں جاتا ہوں تو بیٹھنے کی جگہ پہلے تلاشتا (تلاش کرتا؟) ہوں۔'' [ص:۳۷]
- ''میں مقصد کے پیچھے بھاگ نہیں پاتا۔ ناکامی ملنے پر کونا پکڑ لیتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں، کوئی چیز آسانی سے مل جائے۔'' [ص:۳۰]

شموئل احمد نے اپنے اندر دو شخصیتوں کی شناخت کی ہے۔ ماہرِ علمِ نجوم اور تخلیقی فنکار کو انھوں نے متوازی حیثیت عطا کی ہے۔ وہاب اشرفی نے اپنی خودنوشت میں شموئل احمد کا ذکر کرتے ہوئے ان کی دوسری حیثیت پر بھی گفتگو کی ہے۔ شموئل احمد کی اختر شناسی پر غور کرنے سے پہلے وہاب اشرفی کی خودنوشت

سے ایک اقتباس ملاحظہ کرنا دل چسپی سے خالی نہ ہوگا:

- ''غالب کی زبانی عیاشی کی پیروی میں انھوں نے ماہ رخوں کے لیے مصوری تو نہیں سیکھی لیکن پامسٹری اور اسٹرولوجی سے رابطہ ضرور قائم کیا اور عام طور سے خواتین کا ہوروسکوپ بناتے رہتے ہیں۔ مردوں کے ہوروسکوپ مرتب کرنے میں بھی تکلّف نہیں کرتے۔ پیشین گوئیاں بھی علم نجوم کے سہارے کرتے رہتے ہیں۔ ایک زمانے میں رانچی میں انھوں نے حساب کتاب کر کے مجھے بتایا کہ میں پانچ سال تک وہاں سے نہیں نکل سکتا۔ اتنی مدت کے بعد ہی وہ جگہ چھوڑ سکوں گا، تب ہی دوسری جگہ جانے کی صورت نکلے گی لیکن عجب اتفاق کہ اس پیشین گوئی کے دو ماہ بعد مجھے ہمیشہ کے لیے رانچی کو خیر باد کہنا پڑا۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ ان کے علم کا نقص نہیں بلکہ میں نے ہی تاریخ پیدایش غلط بتائی ہوگی۔'' [قصّہ بے سمت زندگی کا: وہاب اشرفی، ص:۲۳۸]

لیکن شموئل احمد نے خود کو ایک پروفیشنل نجومی اور ماہر اختر شناس کے طور پر پیش کرنے کی اس خودنوشت میں بہ تفصیل کوشش کی ہے۔ حالاں کہ انھوں نے برسبیلِ تبصرہ اپنی اس مہارت یا علمِ نجوم کو کیسا گورکھ دھندا مانا ہے، یہ انھی کے چند جملوں میں ملاحظہ کیجیے:

- ''ہندستانی معاشرے میں اندھ وشواس اتنا گہرا ہے کہ اسے آسانی سے ختم نہیں کر سکتے۔ جیوتش ہندستانی تہذیب کا حصّہ ہے۔'' [ص:۹۸]
- ''میں جہان آباد میں تانترک مشہور ہو گیا۔ اس دن سے کسی نیتا نے مجھے پریشان نہیں کیا بلکہ مجھ سے صلاح لینے کے لیے آنے لگے۔ کسی کا بیٹا بیمار..... کسی کو اولاد نہیں..... کسی کو جائداد کا جھگڑا..... میں سب کو جنتر بنا کر دیتا اور پیسے لیتا۔

جب تک بیوقوف زندہ ہے(ہیں؟)، عقل مند بھوک نہیں مرسکتا۔''[ص:۱۱۱]

اس حقیقت کے اعتراف کے باوجود شموئل احمد گہرے طور پر اس علم سے خود کو متعلق سمجھتے ہیں اور ان کا یقین ہے کہ ان کی تخلیقیت اور اختر شناسی دونوں کا زندگی زندگی کا ساتھ ہے ۔انھوں نے خودنوشت کے آغاز میں ہی اپنی اس مہارت کا بھرپور انداز میں تعارف کرادیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

- ''میرے اندر دو شخصیتیں ہیں۔ایک جیوتشی، دوسرا فن کار۔ دونوں میں جنگ ہوتی رہتی ہے۔کبھی کہانی کار حاوی ہوجاتا ہے، کبھی جیوتشی.....کہانی کار حاوی ہوتا ہے تو کہانی لکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ جیوتشی حاوی ہوتا ہے تو زائچے بنانے لگتا ہوں۔ میں جانتا ہوں، دونوں کی جنگ میں مرے گا کوئی نہیں.....دونوں لہولہان ہوکر بھی زندہ رہیں گے۔''[ص:۱۷]
- ''علمِ نجوم کے بہت سارے اسرار میرے سینے میں دفن ہیں۔''[ص:۱۸]
- ''مجھ میں ایک بُری عادت ہے۔ میں کسی سے ملتا ہوں تو اس میں ستارے ڈھونڈتا ہوں۔ کس گرہ کا آدمی (ہے)؟''[ص:۳۵]
- ''میں نے بھاگل پور میں اپنے گھر پر ہی جیوتش کا ریالیہ کا بورڈ لگادیا اور آفس سے آنے کے بعد شام کو پیشے ور نجومی کی حیثیت سے بیٹھنے لگا۔ میں نے بھٹّو کی پھانسی کی پیشین گوئی کی جو حرف بہ حرف صحیح نکلی اور میرا کاریالیہ چل پڑا۔''[ص:۹۷]

شموئل احمد نے شاید درست ہی لکھا ہو کہ ان کا جیوتش کا کاریالیہ چل نکلا۔خودنوشت میں اس پیشے کے متعلق طرح طرح کے واقعات اور کرداروں کی کیفیات اور ماہر اختر شناسی کی طرح ان کی کارکردگی وغیرہ معاملات پر بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہاں بھی خواتین اور ان کی وفا شعاری یا بے وفائی کے احوال بھرے

پڑے ہیں۔ بھلے وہاب اشرفی کی نقلِ مکانی کے بارے میں وہ غلط پیشین گوئی کر بیٹھے۔ان کا یہ متوازی کام رفتار کے ساتھ آگے بڑھتا رہا۔علمِ نجوم کے امور میں وہ کچھ اس قدر گہرے اترتے چلے گئے کہ اب اگر ذیل کے ان کے مشاہدات ملاحظہ کیجیے اور یہ یاد کیجیے کہ وہ تعلیم اور پیشے سے انجینئرنگ سے وابستہ رہے اور اس لیے سائنسی بصیرت لازمی طور پر ان کی زندگی کا حصّہ ہوگی تو آپ کی حیرت کی انتہا نہ ہوگی:

- ''علمِ نجوم کے کچھ ویدک نظریات ایسے ہیں جسے (جنھیں) سائنس نے محض صحیح ثابت کیا ہے۔اس سے آگے کوئی نئی بات نہیں کرسکا۔''[ص:۹۸]
- ''سائنس کی حد جہاں ختم ہوتی ہے، علم نجوم کی حد وہاں سے شروع ہوتی ہے۔''[ص:۹۹]
- ''سائنس زحل کے جسم میں ہی اُلجھا رہا لیکن نجومی اس کی روح میں اترا۔''[ص:۹۹]

شموئل احمد جب ادبی اور علمی موضوعات یا اپنے عہد کے بڑے سوالوں پر دانش ورانہ گفتگو کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو ہمیں کلیم الدین احمد کا سید احتشام حسین کے سلسلے سے پیش کردہ وہ ریمارک یاد آتا ہے جو انھوں نے آلِ احمد سرور کے انداز کی نقل کے سلسلے سے کہا تھا: ''جب وہ احتشام حسین اس طرز میں لکھتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ہاتھی خوش فعلیاں کررہا ہے'' [اردو تنقید پر ایک نظر، ص:۳۰۴]

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ کسی بات کے سرسری نتائج سے آگے بڑھ ہی نہیں سکتے۔صفحہ ۱۵۱ سے ۱۶۳ تک وہ اردو ہندی افسانوں کی تاریخ پر گفتگو کرتے ہیں جو اس بات کا بھرپور ثبوت ہے کہ شموئل احمد ادبی تاریخ کے معمولی طالبِ علم ہیں اور حقائق سے نتائج اخذ کرنے کے معاملے میں مشّاق لکھنے والے کے بجائے سرسری گزرنے والے محرّر کا ہی فریضہ انجام دے پاتے ہیں۔فرقہ واریت، تقسیمِ ملک، فسادات اور ہجرت جیسے معاملات میں ان کی گفتگو ایک نگاہِ طائرانہ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔حالاں کہ سابقہ مشرقی پاکستان کے متاثرین سے ان کی قرابت داری رہی اور انھوں نے اس خودنوشت میں ایسے چند کرداروں کا بھی ذکر کیا ہے۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شموئل احمد خواتین کی گفتگو اور ان کی تجربات میں جس انہماک اور دل جمعی کے ساتھ شریک ہوتے ہیں، اس انداز سے وہ عصرِ حاضر کے علاقائی، قومی اور بین الاقوامی معاملات پر گہرائی سے توجہ نہیں کرتے۔وہ ذاتی طور پر تاریخ اور سماجیات کو وسیع تناظر میں تجزیے کا حصّہ نہیں بناتے۔اسی لیے وقت اور تاریخ کے پیچیدہ معاملات میں بھی کچھ ایسے سرسری احوال سامنے آجاتے ہیں کہ ہمیں اس بات کا ثبوت

مل جاتا ہے کہ اپنے وقت کا بااعتبار افسانہ نگار اور ناول نویس علمی اعتبار سے کتنا کچّا ہے؟

صفحہ ۸۹ پر بنگلہ دیش اور صفحہ ۹۶ پر پاکستان یا ہند پاک رشتوں کے بارے میں جس سرسری اور طفلانہ انداز میں گفتگو کی گئی ہے، وہ بھی یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ شموئل احمد کا یہ خاص میدان نہیں۔ سید حامد نے اپنے ایک مضمون میں مولانا وحیدالدین کے بارے میں اپنے نتائج پیش کرتے ہوئے یہ لکھا تھا کہ مذہبی امور سے الگ جیسے ہی مولانا سیاسی معاملات پر رائے زنی کرتے ہیں، انھیں پتا ہی نہیں چلتا کہ کب وہ عالمانہ سے طفلانہ انداز میں مبتلا ہو گئے۔ منٹو نے عورتوں کی کج مج زندگی کے بارے میں شموئل احمد سے کچھ کم نہ لکھا ہوگا۔ وہ بھی خواتین کے رسیا مانے جاتے ہیں۔ جہاں گنجائش ہوتی ہے، شموئل احمد کی طرح ہی لذّت کوشی میں بھی مبتلا ہونے سے منٹو کو کوئی گریز نہیں لیکن سیاسی اور سماجی بصیرت یا ملک اور اقوامِ عالم کے مسائل پر منٹو کے مضامین یا افسانوں میں جو اشارے ہیں، وہ اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ وہ باخبر ذہن رکھنے والا تخلیق کار تھا لیکن شموئل احمد کا مطالعۂ کائنات اتنا سمٹا ہوا ہے کہ کوشش کر کے اگر وہ اس سے باہر بھی نکلتے ہیں تو انھیں منہ کی ہی کھانی پڑے گی۔ ان کی اعلا تعلیم اور جہاں دیدنی پتا نہیں کیوں ان کی تحریروں میں شان وشکوہ کے ساتھ موجود نہیں۔

خودنوشت کے صفحہ ۱۶۱ پر شموئل احمد نے اردو زبان کی شُد بُد کے بارے میں بڑی صفائی سے ایک بات لکھی ہے۔ سائنس اور انجینئرنگ کی تعلیم کے دوران شاید انھیں اردو پڑھنے کا درسی اعتبار سے زیادہ موقع ہاتھ نہ آیا ہوگا لیکن اردو میں اپنی استعداد بڑھانے کے لیے انھوں نے کس طرح مشقت کی، اس کا انداز یہ ہے:

- ''میں نے اردو باقاعدہ نہیں سیکھی۔ یہی وجہ ہے کہ مجھ سے املا کی غلطیاں ابھی بھی ہوتی ہیں۔ میں نے اردو خط پڑھ کر سیکھی۔ گھر میں کوئی خط پڑھ کر سناتا تو مجھے مضمون یاد ہو جاتا تھا۔ پھر میں خط اٹھا کر دیکھتا کہ 'جناب' اس طرح لکھا ہوا ہے، 'والد' اس طرح لکھا ہوا ہے۔'' [ص:۶۱]

یہ حقیقت ہے کہ شموئل احمد کی زبان کا ڈھانچا مستحکم نہیں ہے۔ فکشن نویس کو اکثر یہ آزادی اور فراغت حاصل ہوتی ہے کہ اسے اپنے ماحول کی ترجمانی کے لیے کرداروں کی زبان کا استعمال کرنا پڑتا ہے لیکن 'اے دلِ آوارہ' میں راوی خود شموئل احمد ہیں۔ اس لیے زبان کی ساری ذمہ داریاں بھی انھی کی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ہر نثر نویس ماہرِ زبان اور انشا پرداز نہیں ہو سکتا لیکن شموئل احمد کا قاری ان سے کیا اتنی بھی توقع نہیں رکھے کہ وہ ایسی غلطیوں سے بچیں جن پر اسکول کے بچوں کو اُن کے اساتذہ سزا دیتے ہیں۔ تذکیر و تانیث کا نظام تو درست

ہونا ہی چاہیے۔ آپ جو لفظ استعمال میں لاتے ہیں، ان کے معنٰی اور موقعِ استعمال سے بھی واقفیت رکھنا کون سی بُری بات ہے؟ پھر یہ سوال کہ جب کسی ایک زبان میں ہزاروں صفحات لکھنے اور شائع کرنے یا لاکھوں کے انعام یافتہ ہونے کے بعد کیا اس زبان میں قواعد و انشا کے ابتدائی مسائل درست نہ ہو جانے چاہییں۔ ایسی مثالوں سے یہ کتاب بھری پڑی ہے لیکن چند عبرت آمیز مثالیں ذیل کے جملوں سے ملاحظہ ہوں اور ہم ماتم کریں کہ کس سطحِ زبان کو اپنے عہد کا معتبر افسانہ نگار اپنی خودنوشت میں پہنچتا ہوا ملتا ہے:

- ''دونوں میں چھتیس کا آنکڑہ تھا۔'' [ص:۳۴]
- ''مسجد کی مینارگری۔'' [ص:۴۴]
- ''اصل میں اس گھرانے سے ہم لوگوں کے بہت دیرینہ تعلّقات نہیں تھے۔'' [ص:۶۵]
- ''ان میں ملّت اتنی تھی (جس کی) مثال دی جاتی تھی۔'' [ص:۶۶]
- ''ان کی ایک لڑکی میرے محلّے میں ایک رشتے دار سے بیاہی تھی۔ وہ ایک دم آخری دنوں میں اُن کے پاس رہنے لگیں۔'' [ص:۷۱]
- ''سقوطِ ڈھاکہ کے بعد زائرین بھاگ بھاگ کر ہندستان آنے لگے۔'' [ص:۷۲]

ایسا نہیں کہ ''اے دلِ آوارہ'' میں مصنف کی تخلیقی زبان کا کوئی وصف ہی سامنے نہیں آیا۔ لکھتے لکھتے دستِ ہنر کے ناخن اُگ ہی آتے ہیں اور تخلیق کار سے خدا کسی عالمِ جذب میں کچھ ایسے جملے بھی ادا کرا دیتا ہے جو پڑھنے والوں کے ذہن پر نقش ہو جائیں۔ شموئل احمد کے افسانوں میں ایسے جملے ہمیں بار بار نئی معنویت کے ساتھ ملتے ہیں لیکن اس خودنوشت میں بھی ان کے قلم کی روشنائی پوری طرح سے خشک نہ ہو سکی ہے اور تخلیق کار کی زبان کا پُر لطف ذائقہ ہماری سیری کے لیے کافی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

- ''عادتیں پرانے غلاموں کی طرح اپنا حصّہ مانگتی ہیں۔'' [ص:۳۷]
- ''جنّت میں غصّہ حرام ہے۔'' [ص:۱۷]
- ''محکمہ کوئی بھی ہو، منسٹر سے لے کر چپراسی تک سبھی چاندی

کی زنجیر سے بندھے ہوتے ہیں۔ یہ زنجیر بہت لطیف ہے۔ یہ نظر آتی بھی ہے اور نہیں بھی۔ یہ کھنکتی ہے کھن...کھن...کھن...آزادی سے پہلے اس کی آواز دھیمی تھی، اب بہت تیز ہے۔'' [ص:۴۳]

- ''ساری زمین پر سب سے بھدّا منظر ہے روتا ہوا آدمی۔'' [ص:۴۷]
- ''درودیوار پر دھول کی پرتیں مستقل وہم کی طرح جمی ہوئی تھیں اور شام کا اندھیرا پاؤں پسار رہا تھا۔'' [ص:۶۹]
- ''جب دو ملکوں میں جنگ ہوتی ہے تو جیت کسی کی نہیں ہوتی۔ دونوں ہی ہارے ہوئے ہوتے ہیں۔'' [ص:۷۲]
- ''اُن کے چہرے پر قسمت کی نارسائی کا ماتم تھا اور آنکھیں آنسوؤں سے بھیگی تھیں۔'' [ص:۷۲]
- ''اس کے چہرے پر بیتے موسم کا کوئی دُکھ نہیں تھا۔'' [ص:۷۲]
- ''جمہوریت کی پَری بیٹھ گئی بالا خانے پر۔ بازار میں اپنے لیے گنبد بنالیا اور اٹھائی گیرے سے ہم بستر ہوتی ہے۔'' [ص:۲۷]
- ''اس بلا نوش سے میری ملاقات رانچی کے سادھنا لاج میں ہوئی..... دھند کی اگر آنکھیں ہوتی ہیں تو اس کی آنکھوں جیسی ہوں گی.....ور دھند کا اگر چہرا ہوتا ہے تو اس کا چہرا بھی۔'' [ص:۱۲۱]
- ''جب سپنے چوری ہوتے ہیں تو دل کے مقام میں ننھا سا سوراخ ہو جاتا ہے جو کبھی نہیں بھرتا۔'' [ص:۱۲۴]

یہ خودنوشت بہت عجلت میں ترتیب دی گئی ہے، اس لیے ہر جگہ ایک بکھراو کا عالم ہے۔ شموئل احمد نے باضابطہ طور پر اپنی ترجیحات طے نہیں کیں۔ افسانے کے بعض ماہرین اس بات پر بڑے سنجیدہ ہوتے

ہیں کہ کسی اچانک موڑ سے افسانے کا شروع ہونا اور اسی طرح ختم ہو جانا اس کی خاص صفت ہے۔ شموئل احمد کی اس خودنوشت میں کہنے کو تو بارہ بے عنوان ابواب متعین ہیں لیکن مشکل سے دو تین ایسے ابواب ہیں جہاں سلسلے سے کوئی بات شروع ہوتی ہے اور وہ منطقی انجام تک پہنچتی ہے۔ اپنے فضائل و کمالات کے جادو میں وہ کچھ اس طرح مبتلا ہیں جیسے انھیں اپنے معاصرین کی اہمیت بہت کم سمجھ میں آتی ہو۔ اپنے بزرگوں یا معتبر مصنفین کے بارے میں تو انھوں نے برائے نام ہی لکھا۔ رانچی کے چند افراد کسی طرح چند صفحات میں جگہ پا گئے لیکن عظیم آباد بہت حد تک خالی ہے۔ ان کے مدیران جنھوں نے ان کی ادبی پشت پناہی کی، ان کا سرے سے کوئی ذکر نہیں۔ انعامات کے پیچھے کھیل تماشے پر وہ چند جملے بھی نہیں لکھتے جب کہ حصولِ انعام کے بعد کی کیفیت اور سرشاری پر اس کتاب میں بڑے بول موجود ہیں۔ انھوں نے اپنے عہد کے اکثر لکھنے والوں کے ادھورے نام لکھے ہیں۔ حسین یعنی حسین الحق، ساجد یعنی ساجد رشید، طارق یعنی طارق چھتاری، اشرف یعنی سید محمد اشرف؛ یہ طریقۂ کار بہت سوچ سمجھ کر اختیار کیا گیا ہے۔ غالب نے اپنے ایک خط میں مکتوب الیہ کو تفصیل سے پتا لکھنے کے لیے شکایت کرتے ہوئے کہا تھا کہ جب تک مجھے میرے مرتبے سے گرا نہ دو، تمھیں چین کیوں کر آئے گا؟ شموئل احمد بھی اپنی کتاب میں اپنے ہم عصروں کو شناخت کا کیوں کر موقع دیں گے۔ گلی کوچے کے بچّوں کی طرح سے انھیں ہانک لگا کر یہاں کھڑا کر دیا گیا ہے۔ صریحاً یہ احساسِ کمتری ہے۔ جمشید پور فساد کے بارے میں یہاں کچھ آنکھوں دیکھے احوال درج ہوئے ہیں، کاش بھاگل پور فسادات پر بھی شموئل احمد چند صفحات رقم کر دیتے جہاں کے وہ حقیقی باشندہ ہیں۔

دسویں باب کی ابتدا کرتے ہوئے شموئل احمد نے کیا خوب لکھا ہے: ''ادیبوں کو بڑھاپے میں شہرت کی ہوس بڑھ جاتی ہے۔ ہارے ہوئے تخلیق کار کہانی چوری کرتے ہیں اور ہوس کے شکار مدیر مسوّدے۔'' پتا نہیں، شموئل احمد خود کو بوڑھوں کے شمار میں لانا پسند کریں گے یا نہیں لیکن ان کی ملازمت سے سبک دوشی کے زمانے بیت گئے۔ انھیں بزرگ تو کہنا ہی چاہیے۔ ایک زمانے میں ہندی میں نصف درجن سے زیادہ کتابیں زیرِ طبع ہونے کا انھوں نے اپنی کسی کتاب کے فلیپ پر ذکر کیا تھا جو آج تک نہیں شائع ہو سکیں۔ اردو کی نفسیاتی کہانیاں منتخب کرتے ہوئے انھوں نے چلتے پھرتے انداز سے ہی اپنے ہم عصروں سے تاوان وصول کر لیا۔ اچانک ان کی کتاب 'پاکستان (ادب کے آئینے میں)' سامنے آئی تو ان کی خود نوشت کا وہ جملہ یاد آیا کہ 'بڑھاپے میں شہرت کی ہوس بڑھ جاتی ہے'۔ شموئل احمد کی اس خودنوشت اور ادھر جلدی جلدی شائع ہونے والی ان کی کتابوں کو اسی انداز سے دیکھا جائے گا۔ کاش! انھیں اپنے بہترین افسانوں یا بعض سلیقے کے ساتھ پیش کردہ کرداروں پر مکمل بھروسہ ہوتا کیوں کہ ادب میں دائمی حیثیت معیار

کی وجہ سے متعین ہوتی ہے نہ کہ مقدار یا ہوس کارانہ Book making سے۔ مجھے یقین ہے کہ اردو ادب کے قارئین شموئل احمد کی اس خودنوشت کو بہ نظرِ توجہ نہیں دیکھیں گے اور یہ کتاب اردو کی بہت ساری کتابوں میں گُم ہوکر رہ جائے تو کسی کو حیرت نہیں ہونی چاہیے۔

◄◄ ● ►►

202, Abu Plaza, NIT More,
Ashok Rajpath, Patna-800006
safdarimamquadri@gmail.com

ہم عصر اردو تنقید کی موثّر آواز

صفدر امام قادری

کے تنقیدی اور تحقیقی مضامین کا تازہ مجموعہ

محمد حسین آزاد کا تنقیدی شعور
اور دیگر مضامین

ترتیب : افشاں بانو

مشمولات ایک نظر میں:

کلاسیک ☆ محمد حسین آزاد کا تنقیدی شعور ['آبِ حیات' کے تیسرے دور کے خصوصی حوالے سے]
☆ نظیر اکبرآبادی کا شعری مزاج ☆ غالب کا مرثیۂ عارف: ایک تنقیدی تجزیہ
نشاۃ الثانیہ ☆ شبلی: سرسیّد سے کتنے مختلف؟ ☆ یادگارِ حالی: حالی کی ایک مثالی سوانح کا نقطۂ آغاز
ترجمہ ☆ ظ۔ انصاری کے شعری ترجمے
فکشن ☆ اردو انشا پردازی کی مذہبی جڑیں ☆ غضنفر کا افسانہ 'سانڈ' : ایک تجزیہ
تعلیم ☆ سرسیّد کے تعلیمی تحفّظات [عورتوں کی تعلیم کے خصوصی حوالے سے]
☆ مولانا آزاد: جدید ہندستان میں اعلا تعلیم کے معمارِ اوّل [ترجمہ: افشاں بانو]
تحقیق و تنقید ☆ بہار میں اردو صحافت ☆ کلیم الدین احمد کی تنقیدات پر ڈاکٹر عبدالمغنی کی آرا
تقسیمِ ملک ☆ تقسیمِ ملک اور بہار فسادات میں گاندھیائی تجربہ ☆ برِصغیر ہند کا المیہ
شخصی مطالعہ ☆ وہاب اشرفی : ایک شخصی حوالہ

ناشر : عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی۔۹۵
صفحات: ۲۴۰ قیمت: ۳۰۰ روپے۔

● تبصرے

شمس الرحمٰن فاروقی کے تبصرے

انیس انصاری کی نئی کتاب

انیس انصاری کے کلام سے میری واقفیت بہت پرانی ہے۔ میرا خیال ہے جب میں نے پہلی بار ان کا کلام دیکھا تو اس وقت مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ اعلیٰ درجے کے سرکاری عہدے دار ہیں۔ اور یہ اچھا ہی ہوا، کیونکہ اگر یہ پہلے سے معلوم ہو کہ شاعر کسی بڑے عہدے پر ہے تو اس کے بارے میں میری رائے خود بخود ذرا خراب ہونے لگتی ہے۔ افسری اور شاعری میں کوئی زیادہ میل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عہدے داروں کا کلام عموماً پھیکا ہوتا ہے۔ بہرحال، اشعار مجھے اچھے لگے اور نام انیس انصاری میرے ذہن میں محفوظ ہو گیا۔

بعد کی ملاقاتوں میں انیس انصاری مجھے سنجیدہ انسان اور باشعور شاعر نظر آئے۔ مجھے انیس انصاری کے یہاں غالب کی زبان میں کسی ''اظہار بے قرار'' روح کی جھلکیاں دکھائی دیں (زلف خیال نازک و اظہار بے قرار)۔ اظہار ہر جگہ کامیاب ہوتا تو پھر عام انسان اور شاعر میں کوئی فرق نہ رہ جاتا، بلکہ پھر تو شاعری کی ضرورت ہی نہ رہتی۔ لیکن انیس انصاری نے اپنے اظہار کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے اپنی طرف سے کوئی کسر نہ چھوڑی۔ علی گڈھ میں جن لوگوں کی صحبتوں میں ان کی ادبی شخصیت پروان چڑھی تھی ان میں تجربہ کوشی کی کمی تھی۔ لیکن انیس انصاری نے غزل، نظم، رباعی، مختصر نظم، نسبۃً طویل نظم، ان سب اصناف میں سعیِ سخن کی۔ اس کے علاوہ، زبان میں بے تکلفی اور لہجے میں طنز کے بھی عناصر انھوں نے آہستہ آہستہ اپنے کلام میں داخل کئے۔

اب جو میں ان کا تازہ مجموعہ ''درد ابھی محفوظ نہیں'' دیکھتا ہوں تو بہت سی توقعات پوری ہوتی دکھائی دیتی ہیں۔ معاصر زندگی کے مسائل، الجھنیں اور المیے جس خوبی سے ان کے کلام بالخصوص نظم میں منعکس ہوئے ہیں اس کی مثال جدید شاعری میں نہیں ملتی۔ بھیونڈی، ملیانہ ہاشم پور (میرٹھ)، بابری مسجد کی شہادت، یہ ایسے واقعات نہیں ہیں جن پر بے باکی سے قلم اٹھایا جا سکے۔ اور شاعر اگر خود سرکاری افسر ہو تو

اس کی حق گوئی یکرنگ کے الفاظ میں ۔

حق کہے جو کوئی سو مارا جائے　　راستی ہے گی دار کی صورت

کی مصداق بن سکتی ہے۔لیکن انیس انصاری کی حق پسندی اور اخلاقی جرأت ان مراحل کو ہنستے کھیلتے طے کرگئی ہے۔زیرنظر مجموعے میں بھی جگہ جگہ اشارے چمک اٹھتے ہیں ۔

کوفہ نے چلائی تھی عجب رسم ستم زاد　　دجلہ میں بہایا تھا ہلاکو نے لہوکو
اب پھر سے لہو رنگ ہوئیں میری زمینیں　　وہ کابل و گجرات ہو بصرہ ہو کہ بغداد
میں کس جگہ اس درد کو لے جاؤں چھپا کر　　اک فوج غلاموں کی بچی ہے سو ہے آزاد
(درد ابھی محفوظ نہیں)

انیس انصاری ہمیشہ اپنی بات سیدھے اور غیر پیچیدہ لہجے میں کہتے ہیں لیکن ان کے یہاں احساس کی شدت اور ذاتی، باطنی کیفیت کا وفور اس قدر ہے کہ ان کی نظم کو کسی اور امداد کی ضرورت کم ہی پڑتی ہے۔جیسا کہ میں نے اوپر کہا،طنز کے ابعاد بھی ان کی نظم کو قوت دیتے ہیں۔مثلاً یہ رباعی دیکھئے ۔

پنڈت نے کہا شہر کی شدھی ہو جائے　　سب باہری بھینسوں کی صفائی ہو جائے
پوچھا کہ شری مان بھی تو باہری ہیں　　بولا وہ ہے قانون جو لاٹھی ہو جائے

اس طرح کے تقریباً برہنہ طنز کے باوجود انیس انصاری کے کلام میں ایک حزن اور ایک دبے دبے غم کی بھی کیفیت ہے۔بعض اوقات یہ حزن ان کی عشقیہ نظموں میں بھی طنز کے ساتھ دکھائی دیتا ہے (جیسے ان کی نظم ''سبز پیڑ کی آگ'') اور بسا اوقات بالکل سادہ، ابتدائی، عشق کے آغازی جذبات سے معمور لہجے میں حزن کے ساتھ طنز کی جگہ کچھ درون بینی، کچھ اپنا محاسبہ، چمکنے لگتا ہے۔پھر بھی، یہ شک بھی گذرتا ہے کہ شاعر کہیں خود ہی کو تو اپنے طنز کا ہدف نہیں بنا رہا ہے؟ ایسی نظمیں اپنے سڈول پن اور کم گوئی کے اہتمام کی وجہ سے انتہائی کامیاب ہیں۔مثلاً یہ رباعی دیکھیں ۔

سب لوگ سمجھتے ہیں انھیں اہل کمال　　یہ علم یہ منصب یہ جمال اور جلال
تنہائی میں قابو نہیں رہتا لیکن　　جادو ہے کہ معمولی سی لڑکی کا خیال؟
(بڑے لوگ)

اس رباعی کے مضمون پر فراق صاحب کے ایک مشہور شعر کی چھوٹ بہت دور سے پڑی ہے اور وہ بہت پرلطف ہے۔لیکن انیس انصاری نے اپنے شعر کو عام دنیا سے اس قدر قریب رکھ دیا ہے کہ بالکل ہی نئی بات پیدا ہوگئی ہے۔''درد ابھی محفوظ نہیں'' کے دیباچے میں انھوں نے لکھا ہے کہ ''زندگی کے عجوبے نے

حیرت ناک حد تک مجھے متاثر کیا ہے۔میں جینے کے عمل میں خوش رہا ہوں۔''میں سمجھتا ہوں کم ہی شاعروں کے یہاں ہمیں زندگی کرنے کے اس حوصلے کے ساتھ رنج بھی سہنے کا حوصلہ ملتا ہو۔''میں ترے واسطے روتا ہوں زمیں'' جیسی نظم اسی لئے ہماری توجہ کی مستحق بنتی ہے۔

اس کتاب کے دیباچے میں انیس انصاری نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ان کی نظم ان کی غزل سے اچھی ہوتی ہے۔ممکن ہے کبھی ایسا رہا ہو،لیکن زیرنظر مجموعے میں غزل کا پلہ بھاری معلوم ہوتا ہے،شاید اس لئے کہ غزلوں میں طنز اور کچھ تلخی اور کچھ معاصر زندگی کے لائے ہوئے آزمائشی حالات کا انعکاس ایک بے تکلف لسانی اظہار ملتا ہے۔یہ بے تکلفی بہت اہم ہے کیونکہ یہ کسی بھی شاعر کی غزل کی دنیا میں نئی لہریں لانے کا ایک سبب بن سکتی ہے۔زبان کے بارے میں انیس انصاری کا بے تکلف رویہ کہیں کہیں بے احتیاطی میں ضرور بدل گیا ہے۔یقین ہے کہ یہ بے احتیاطی محض ایک عبوری دور کی علامت ہوگی۔

جہاں تک سوال مضامین کا ہے،تو انیس انصاری نے غزل میں کسی نئے مضمون یا کسی ایسے ذاتی، داخلی تجربے کے اظہار کی کوشش سے گریز کیا ہے جو ان کی غزل کو خیال بندی کی حدوں میں لے آئے۔اس کے برخلاف، روز واقع ہونے والی باتوں کو غزل کا موضوع بنا کر انھوں نے ایک مانوس دنیا خلق کی ہے۔اس دنیا میں شاعر اجنبی تو ہے لیکن اس وجہ سے نہیں کہ وہ کہیں اور سے آیا ہے، بلکہ اس وجہ سے کہ اس دنیا کے طور طریقوں سے اسے اتفاق نہیں ہے ۔

مے خانے میں ساقی کا کرم عام ہے سب پر
لب بند ہیں بس چند مسلمان وغیرہ
ادھر کرفیو ادھر گھر جل رہا ہے
میاں جی کا محلّہ آ گیا کیا
زمیں پھیلی ہوئی ہے آسماں تک
بس اک ٹکڑے پہ یوں تکرار کیوں ہے
یہ دیکھتا رہا اشارہ ہو تو بیٹھ جاؤں میں
اس انجمن میں یوں ہی میری صبح شام ہوگئی
وہ مجھ کو روند کے کچھ دیر خوش رہا لیکن
میں اس کے پاؤں میں ٹوٹا سا مثل خار رہا
ہم شہیدوں کو کبھی مردہ نہیں کہتے انیس

رزق جنت میں ملے شان یہاں پر باقی

انیس انصاری کے یہ اشعار نئی غزل میں ممتاز جگہ پانے کے مستحق ہیں اور اس طرح کے اشعار مجموعے میں جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔ مجھے یہ مجموعہ پڑھ کر خوشی ہوئی۔

☆☆☆

نیر عاقل

نیر عاقل کا خیال کریں تو اقبال کا مصرع یاد آتا ہے ع

وہی جواں ہے قبیلے کی آنکھ کا تارا

یہاں ''قبیلہ'' سے میری مراد الہ آباد کے شاعروں کا قبیلہ ہے۔ خواہ اصلی اور سچے شاعر، خواہ نو آموز شاعر، خواہ وہ شاعر جو یہاں کی ادبی محفلوں میں نیر عاقل کی اصلاح شدہ نظمیں، غزلیں اور مرثیے پڑھتے تھے، یا کبھی کبھی نیر عاقل سے شعر کہلا کر اپنے نام سے پڑھ دیتے تھے، یہ سب نیر عاقل کے چاہنے والے تھے۔ نیر عاقل ان کے ممدوح اور محبوب تھے اور خود نیر عاقل کے شب و روز کا تصور ان چاہنے والوں کے بغیر نہیں ہوسکتا تھا۔ کہنے کو وہ انگریزی دواؤں کی ایک دوکان کے مالک اور مہتمم تھے، لیکن دراصل وہ تمام شہر کے نوجوان شعرا کے درد کا مداوا تھے۔

وہ لوگ جن کا اوڑھنا بچھونا شاعری ہوتی ہے اور جو نوجوان شعرا کے چراغ محفل کے طور پر جیتے اور مرتے ہیں، ان میں علمی لیاقت زیادہ نہیں ہوتی۔ ایسے لوگ فطری ذہانت اور فطانت کے بل بوتے پر شعرا کے حلقے میں مقبول ہوتے ہیں اور صرف اپنی تیزی طبع کی بدولت ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے ہیں۔ لیکن نیر عاقل کی علمی صلاحیتیں بھی حیرت انگیز تھیں۔ نہ صرف یہ کہ وہ اردو، فارسی، اور عربی کے ایم۔اے۔ تھے، اور اقبال کی شاعری میں قرآن کے نفوذ جیسے مشکل موضوع پر پی۔ایچ۔ڈی۔ کر رہے تھے، بلکہ انھیں عروض اور بیان کا بھی اچھا علم تھا۔ فارسی عربی انھوں نے دل لگا کر پڑھی تھی لیکن وہ اپنے علم کا اظہار اپنی شاعری میں نہ کرتے تھے۔ وہ فطری شاعر تھے اور غزل کی روایت سے پوری طرح واقف ہونے کے باعث غزل کے تمام آداب کو پوری طرح برتنے پر قادر تھے۔ اپنے آخری دنوں میں انھوں نے ظفر اقبال اور احمد مشتاق کی زمینوں میں کچھ غزلیں کہیں تو یہ صاف ظاہر تھا کہ نوجوان شاعر اپنے بزرگ شاعروں کی نقل نہیں کر رہا ہے، بلکہ وہ اپنے بزرگوں کا ''استقبال'' کر رہا ہے، جس طرح سترہویں صدی کے ہند فارسی شعرا اپنے پیش روؤں کی غزلوں پر غزل کہتے تھے اور اس عمل کو ''استقبال'' کا نام دیتے تھے۔ یعنی ایک طرف تو وہ اپنے

بڑوں کی آؤ بھگت کرنے کے لئے آگے بڑھ رہے تھے اور دوسری طرف، وہ خود ان سے آگے نکلنے کی بھی کوشش کر رہے تھے۔ ''شب خون'' کے پڑھنے والوں کو یاد ہوگا کہ نیر عاقل کی ان کوششوں کی داد دور لاہور میں بیٹھے ہوئے ظفر اقبال نے بھی دی تھی۔

نیر عاقل نے جہاں بہت سے شاعرانہ مشغلے اختیار کر رکھے تھے ان میں سے شیخ شیراز کی ''گلستان'' کے بعض حصوں کا منظوم ترجمہ بھی شامل تھا۔ میرا خیال تھا کہ یہ کچھ وقت گذاری کا بہانہ ہے اور نیر عاقل کو اتنی فرصت کہاں ہوگی کہ وہ اتنا مشکل اور لمبا کام دل جمعی سے انجام دے سکیں گے۔ لیکن ان کے انتقال کے کچھ عرصہ بعد ایک دن ان کی بیگم نے مجھے بتایا کہ راہی ملک عدم ہونے کے پہلے نیر عاقل تقریباً پوری ''گلستان'' کا منظوم ترجمہ تیار کر چکے تھے تو مجھے حیرت آمیز استعجاب ہوا۔ بیگم نیر عاقل نے کمپیوٹر پر لکھا ہوا پورا مسودہ میرے سامنے رکھا اور کہا کہ مرحوم کی اس یادگار کو دنیا کے سامنے لانا چاہیئے تو میں نے فوراً ہامی بھر لی۔ ترجمے کو جہاں جہاں سے میں نے دیکھا، حسب توقع درست اور رواں پایا۔ ''گلستان'' ہر چند کہ ہماری تہذیب کی مقبول ترین کتابوں میں سے ہے، لیکن اس کی فارسی بہت آسان نہیں ہے۔ اس میں جگہ جگہ اشعار بھی ہیں اور جس طرح ''گلستان'' کی نثر دنیا کی بہترین نثروں میں شمار ہونے کے لائق ہے (بلکہ شمار ہوتی ہے)، اسی طرح اس کی شاعری بھی سعدی کے بے مثال اسلوب کا نمونہ ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ سعدی کی نثر کا ترجمہ زیادہ مشکل ہے یا ان کی نظم کا۔ اللہ ان کے درجات بلند کرے، نیر عاقل مرحوم نے دونوں کا ترجمہ نہایت سلیس اور خوبصورت اردو میں کیا ہے۔ زبان اور بیان کی کسی غلطی، یا عروض و قافیہ کے کسی سقم کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

ہر چند کہ فارسی زبان و ادب، اور خاص کر فارسی شعر کا اردو کی ادبی تہذیب میں نفوذ کم و بیش شروع ہی سے ہے، اور عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اردو کا اچھا شاعر ہونے کے لئے فارسی شعر کا بھی اچھا ذوق ضروری ہے، لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ ہمارے یہاں فارسی سے ترجمے کی بھی روایت خاصی پرانی ہے۔ اصغر علی خان نسیم دہلوی اور طوطا رام شایاں لکھنوی نے شاہنامۂ فردوسی کا نہایت عمدہ منظوم ترجمہ کیا۔ ان سے کچھ پہلے رجب علی بیگ سرور نے اسی شاہنامے کے ایک نثری روپ ''شمشیر خانی'' کا اردو ترجمہ ''سرور سلطانی'' کے نام سے کیا۔ خود ''گلستان'' اور ''انوار سہیلی'' وغیرہ کے بھی ترجمے اردو میں ہوئے۔ اور ہمارے زمانے میں، جب فارسی کا چلن بہت کم ہوگیا ہے، فارسی کے جدید و قدیم ادب کے تراجم شائع اور مقبول ہوتے رہتے ہیں۔ لہٰذا نیر عاقل کی زیر نظر کوشش کو اسی سلسلے کی ایک کڑی سمجھنا چاہیئے۔ اور اس کی قدر و قیمت میری نظر میں اس لئے کچھ اور بھی زیادہ ہے کہ یہ جدید زبان میں ہے اور منظوم ہے اور اس قدر شستہ اور سلیس ہے کہ وہ لوگ بھی اس سے لطف اندوز ہو

سکتے ہیں جو اردو کچھ بہت زیادہ نہیں جانتے۔ اور تعریف کی بات یہ ہے کہ ترجمے کا لہجہ اور انداز ایسا نہیں ہے کہ اسے محض بچوں کی کتاب کہہ کر ٹال دیا جائے۔ چنانچہ نیر عاقل مرحوم کی یہ کوشش ہر طرح قابل قدر ہے۔

مجھے بڑی خوشی ہے کہ مرحوم کے حلقۂ احباب، خاص کر ان کے بزرگ کرم فرما جناب محمد عبد القدیر (جو شہر کے نہایت کامیاب وکیل ہونے کے ساتھ بہت عمدہ شاعر بھی ہیں)، اور ''اردو گھر'' کی مساعی سے یہ ترجمہ اس قدر آب و تاب سے شائع ہو رہا ہے۔ نیر عاقل مرحوم کی ادبی دلچسپیوں اور الٰہ آباد کی ادبی محفلوں میں ان کی سرگرمیوں کے پیش نظر یہ ترجمہ الٰہ آباد کی ادبی محفلوں کے نام سے منتسب کیا جا رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ پڑھنے والے اسے ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔ مجھے یہ بھی امید ہے کہ نیر عاقل مرحوم کا مجموعۂ کلام بھی آئندہ بہت جلد منظر عام پر آ جائے گا۔

☆☆☆

یاسمین حمید

بہت دن ہوئے ''پس آئینہ'' کی نظموں غزلوں کے ذریعہ یاسمین حمید کے کلام سے میری ملاقات ہوئی تھی تو ایک خوشگوار تعجب اور فرحت کا احساس ہوا تھا۔ ہمارے زمانے میں عورت شعرا کے ساتھ ایک نئی مشکل یہ ہے کہ پڑھنے والے، بلکہ نقاد، بار بار پوچھتے ہیں: عورت کی حیثیت سے وہ دنیا کو کیسا دیکھتی ہے اور دنیا کے بارے میں کیا سوچتی ہے؟ کوئی شک نہیں کہ یہ سوال برجا سے ہے۔ لیکن کسی شاعر کے بارے میں پہلا سوال یہ ہونا چاہیئے کہ وہ شاعر کیسا ہے؟ اور یہ سوال بلا لحاظ مذہب و جنس پوچھا جانا چاہیئے۔ آج کی بہت سی عورت شاعروں کو میں اس کشمکش میں غیر شعوری طور پر مبتلا دیکھتا ہوں کہ وہ ''اپنا پیغام'' اپنے کلام میں ضرور داخل کر دیں، تاکہ کسی کو شک نہ ہو کہ انھوں اپنے تانیثی تشخص کے ساتھ بے انصافی تو نہیں کی ہے؟ یاسمین حمید کا پہلا مجموعہ جو میرے ہاتھ لگا اس نے مجھے کسی شک میں نہ رکھا تھا کہ یہ حسیت، یہ خاموش، متین لیکن درد میں رچا ہوا لہجہ عورت ہی کا ہو سکتا ہے۔ لیکن ذرا زیادہ غور کیا تو محسوس ہوا کہ اس شاعر کا اصل کمال یہ ہے کہ وہ اپنی تانیثی حسیت کو بے پردہ نہیں کرتی۔ اس کی شاعری پر ''عورت پن'' کا خودکار ٹھپہ نہیں ہے۔ وہ عورت بھی ہے اور دکھ اٹھاتے ہوئے، امید و بیم سے لڑتے ہوئے، خوف اور دہشت اور عالم گیر تاجرانہ سماج کے دباؤ میں جینے کی کوشش کرتے ہوئے جدید انسان کی بھی ترجمان ہے۔

''پس آئینہ'' کے بعد میں نے یاسمین حمید کے دو مجموعے اور دیکھے ہیں اور رسالوں میں بھی ان کا کلام گاہے گاہے دیکھنے کا تفاق ہوتا رہا ہے۔ وقت کے آگے بڑھنے کے ساتھ یاسمین حمید کے کلام میں بعض

نئی جہتیں پیدا ہو گئی ہیں، مثلاً سیاست ان کے لئے اب ایسی حقیقت کا روپ اختیار کر چکی ہے جو گندے دھوئیں کی طرح عالم انسانی پر محیط ہے۔ لیکن سیاست ان کے یہاں موضوع سخن نہیں، بہانۂ سخن ہے۔ اور یہی بات ان کی شاعرانہ مہارت اور استعاراتی نگاہ کی دلیل ہے۔ نثری نظم کے پردے میں اب یاسمین حمید کی برہمی اور تلخی اور محزونی کچھ زیادہ نمایاں ہے اور بعض اوقات خوف پیدا کرتی ہے کہ اس بظاہر خاموشی پسند شاعر کے دل میں کتنے تلاطم ابل رہے ہیں۔ نظم میں، اور خاص کر نثری نظم میں، ابہام کی بھی گھٹائیں پر لطف تاثر پیدا کرتی ہیں۔ پڑھنے والا دیر تک ان نظموں میں معنی کی تہوں سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ غزلوں میں سادہ گوئی اور تازہ گوئی پہلے ہی کی طرح ہے۔ تانیثی جہت اب بھی پہلے کی طرح موجود لیکن زیادہ تر زیر زمیں ہے۔

''پس آئینہ'' کا پہلا شعر ہے۔

کنارے پر کھڑی ہوں اور کنارے ڈھونڈتی ہوں　　سحر کی روشنی میں چاند تارے ڈھونڈتی ہوں

یہ رومانی تلاش بھی ہے اور آج کی زندگی کی محزونی اور نارسائی بھی۔ ''آدھا دن اور آدھی رات'' کا آخری شعر حسب ذیل ہے۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھ کو میرا خالق　　بنانا چاہتا ہے یا مٹانا چاہتا ہے

یہاں رومانی تلاش نے بالآخر شاعر کا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ اب ہر طرف استفسار اور رنجیدگی اور تھوڑی سی برہمی ہے۔ یہ انتہائیں نہیں، منزلیں ہیں، بہت بلند منزلیں۔ یاسمین حمید ہمارے شکریے کی حقدار ہیں کہ انھوں نے جدید شاعری کو ایک نیا وقار بخشا ہے۔

☆☆☆

کشمیری لال ذاکر کا مجموعہ، ''تجھے ہم ولی سمجھتے'': چند خیالات

اردو میں، اور اردو ہی کیا، تمام ہندوستانی زبانوں میں ایسے افسانے اور منظومات کم ہیں جن میں مرد کے بالمقابل عورت کی سماجی اور نفسیاتی صورت حال کو بیان کیا گیا ہو، یعنی ایسی تحریریں جن میں ہمارے مرد حاوی معاشرے میں عورت کی حیثیت کا جائزہ لیا گیا ہو۔ اور آج کے زمانے میں، جب تانیثیت (Feminism) کا رواج بڑھ رہا ہے اور عورت بحیثیت صنف، یعنی عورت کی زندگی کے ان پہلوؤں کا مطالعہ بھی بڑھ رہا ہے جنھیں انگریزی میں Gender Issues کہا جاتا ہے، تانیثی تحریریں صرف عورتیں ہی لکھ رہی ہیں۔ ایسی تحریروں میں اکثر و بیشتر یہ بات نمایاں کی جاتی ہے کہ عورت کے اوقات

اس معاشرے میں بہت تلخ ہیں۔ مسائل کا تجزیہ اور گتھیوں کا حل کم نظر آتا ہے۔ جدید زمانے میں بیدی شاید واحد مرد مصنف ہیں جنھوں نے عورتوں کی مظلومیت کو اپنے افکار کا موضوع بنایا اور ایسے کئی افسانے لکھے جن میں ان کی فنی چابک دستی، زبان کی تخلیقی قوت، اور دل کی دردمندی بیک وقت نمایاں ہیں۔ لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ ان افسانوں کے ذریعہ بیدی ہمیں عورت کے بارے میں کسی فلسفیانہ یا وجودی حقیقت سے آگاہ کرنا چاہتے تھے۔ عورتیں یہ سارے دکھ کیوں اٹھائیں، یا کیوں اٹھاتی ہیں، اس کے بارے میں وہ بس اتنا ہی کہتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ یہ تو حقائق حیات میں سے ایک حقیقت ہے۔

آج اردو ادب کی دنیا میں جو عورتیں تانیثی خیالات رکھتی ہیں انھیں بیدی کے افسانوں سے شاید اطمینان نہ ہوتا ہوگا۔ بیدی صاحب کی بے مثال خوبصورت نثر ان کے ان افسانوں کو تباہی سے بچاتی ہوئی معلوم ہوتی ہے جن میں مرد کے بالمقابل عورت کی نفسیات یا حقیقت یا مرتبے کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ لیکن بیدی صاحب کے افسانے شاید کچھ زیادہ کہتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ یا شاید کچھ کم کہتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اور اس کے باوجود بیدی صاحب کا افسانہ غالب کی زبان میں ع

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم

کہنا تو دور رہا، خود بیدی صاحب اسی قاعدۂ آسمان کی توثیق نہیں تو تصدیق کرتے ہوئے ضرور معلوم ہوتے ہیں۔ یہ بات شاید عورتیں ہی محسوس کر سکتی ہیں۔ تانیثی تنقید کا پہلا اور سب سے بنیادی اصول یہ ہے کہ عورتیں ہی عورتوں کو سمجھ سکتی ہیں، لہٰذا عورتوں کے بارے میں مردوں کی تحریریں ہمیشہ مشکوک ٹھہریں گی۔ اور تانیثی تنقید کا دوسرا اصول یہ ہے کہ عورتوں اور مردوں کے پڑھنے کے طریقے مختلف ہوتے ہیں۔ عورتیں اپنے بارے میں، اور دنیا کے بارے میں، ایسی بہت سی باتیں محسوس کر لیتی یا دیکھ لیتی ہیں جو مردوں کی نگاہوں سے اوجھل ہوتی ہیں اور اوجھل ہی رہتی ہیں۔

ایسی صورت میں راجندر سنگھ بیدی ہو یا کشمیری لال ذاکر، عورتوں پر قلم اٹھائیں گے تو ان کے سامنے ایک حد تک خسارے میں رہیں گے، کیونکہ عورتیں کہیں گی، اور یہ کہنے میں شاید حق بجانب ہوں گی کہ ع

خضر کیا جانیں بھلا اگلے زمانے والے

آپ ایک تو مرد لوگ، اور دوسرے اگلے زمانے کے لوگ، آپ ہماری باتیں کیا سمجھیں گے، آپ لوگ اپنے جیسوں کے بارے میں لکھئے اور ہمیں اپنے حال پر چھوڑ دیجئے۔ لیکن ذرا ٹھہر کر سوچیں تو یہی نکتہ ہے جہاں تانیثی تنقید کو ذرا اپنا دل ٹٹولنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ کیا کشمیری لال ذاکر کے یہ افسانے مردوں کے بارے میں نہیں ہیں؟ اگر نہیں ہیں تو پھر اس عنوان کا کیا مطلب ہے: ''تجھے ہم ولی سمجھتے''؟

غالب نے اپنی (اپنے خیال میں) ایک بنیادی کمزوری کا ذکر کیا تھا کہ میاں اگر تم شرابی کبابی نہ ہوتے تو دنیا تمھیں ولی سمجھتی۔ تو کیا کشمیری لال ذاکر یہی کہتے ہوئے نظر نہیں آ رہے ہیں کہ صحیح، ہم مرد ہیں، ہم میں بہت ساری خوبیاں ہوں گی، لیکن ہم ایک ایسے گناہ کا ارتکاب کر رہے ہیں، اور ہر روز کر رہے ہیں، جو ہماری برتری کو مشکوک کر دیتا ہے؟ یعنی ایک طرح سے دیکھئے تو یہ افسانے مردوں کے حق میں قرارداد جرم ہیں کہ ان کے اخلاقی اصولوں میں اتنی بھی گنجائش نہیں کہ دنیا کی آدھی آبادی کے بارے میں محبت بھرا، یا محبت بھرا نہ سہی، برابری کا رویہ اختیار کر سکیں۔

میں نے لڑکپن میں بہت سے افسانے پڑھے تھے جو معمولی درجے کے سہی، لیکن جن میں مردوں، اور خاص کر شوہروں کے مظالم کا بہت ذکر ہوتا تھا کہ وہ اپنی بیویوں کو بندھوا مزدور یا ظالم زمیندار کی رعایا سے بھی کمتر سمجھتے تھے۔ وہ سب افسانے مردوں ہی کے لکھے ہوئے تھے۔ لیکن اسی لڑکپن میں میں نے بہت سے افسانے ایسے بھی پڑھے تھے جن میں مردوں کے تئیں عورتوں کی وعدہ خلافیوں، بے مہریوں، اور فریب کاریوں کا ذکر تھا۔ وہ افسانے بھی مردوں کے لکھے ہوئے ہوتے تھے۔ گویا حساب برابر ہوا، میں دل میں سوچتا۔ یعنی اگر مرد لوگ عورتوں پر ظلم کر رہے ہیں تو عورت ذات بھی کچھ کم نہیں۔ لیکن یہ تو افسانہ نگاری نہ ہوئی، قصے کے روپ میں اپنے اپنے ذاتی تعصّبات کا اظہار ہوا۔ اور دوسری بات یہ تھی کہ ان افسانوں میں مرد ظالم تھے، عورتوں کو وعدہ خلاف یا بے وفا دکھایا جاتا تھا۔ گویا عورتیں ظالم نہیں، بے وفا ہیں، اور مرد بے وفا نہیں، ظالم ہیں۔

انسانوں کی یہ تقسیم مجھے کچھ اچھی نہ لگتی تھی۔ اور بیدی صاحب کے ''مظلوم عورت'' والے افسانوں میں تو عورت بیوی ہو یا کچھ اور، عموماً کسی ظالم یا بے ضمیر مرد کا شکار ہی نظر آتی تھی، خود اسے کبھی کوئی احتجاج کرتے نہ دکھایا جاتا تھا۔ کشمیری لال ذاکر کے ان افسانوں کا موضوع بیدی صاحب سے ذرا مختلف ہے، کیونکہ بیدی کے افسانے اب پچاس ساٹھ برس پرانے ہو گئے ہیں اور مرد سماج نے عورتوں پر ظلم کرنے کے کچھ اور طریقے بھی دریافت یا ایجاد کر لئے ہیں۔ ذاکر صاحب کے زیر نظر افسانوں کا تعلق انھیں نئے طریقوں سے ہے۔ انھیں مجموعی طور پر ''گھریلو تشدد'' (Domestic Violence) کہا جا سکتا ہے لیکن ''تجھے ہم ولی سمجھتے'' کے افسانوں میں بات اتنی سادہ نہیں ہے۔ یہاں ''گھر'' استحصال کا میدان ہے لیکن عورت یہاں سر اٹھا کر گھر اور خاوند کو چھوڑ بھی سکتی ہے۔

''دوسرا مرد'' غیر معمولی افسانہ ہے۔ متکلم ایک عورت ہے جو اپنی مرضی سے شادی کرتی ہے۔ پھر محنت مشقت کر کے اپنی تعلیم پوری کر کے نوکری حاصل کرتی ہے تاکہ گھر کی کفالت میں شوہر

کا ہاتھ بٹا سکے۔لیکن چند ہی برسوں میں محبت کی شادی کی جنت ٹوٹ کر پارہ پارہ ہو جاتی ہے اور متکلم اور اس کے شوہر کے درمیان مسائل پیدا ہو جاتے ہیں جن کا کوئی حل بظاہر نہیں ہے۔لیکن ایک بچے کی پیدائش کے چند دن بعد وہ گھر چھوڑ دیتی ہے:

میرے ماتھے کا زخم تو بھر گیا لیکن زخم کی جگہ ایک جلتی ہوئی گرم مہر میری جلد کے ساتھ چپک کر رہ گئی۔میں جب بھی آئینہ دیکھتی میری ماتھے پر چپکی ہوئی مہر جلنے لگتی اور مجھے محسوس ہوتا کہ تپش کی ایک جھلس دینے والی رو میرے تمام جسم میں پھیلنے لگی ہے۔

بلرام ابھی دس ہی دن کا تھا کہ میں نے پرم پال کا گھر چھوڑ دیا۔

تنہائی کے بیس سال گذرتے ہیں، بلرام جوان ہو کر اپنی مرضی کی شادی کرنا چاہتا ہے۔ماں اسے اس ارادے سے باز رکھنا چاہتی ہے، ہونے والی بہو کو سمجھاتی ہے کہ عورت کو پیار کے بدلے غلامی ملتی ہے۔لیکن بیٹے اور ہونے والی بہو کے بظاہر استقلال مزاج اور سچے وعدوں کے آگے اس کا عزم ٹوٹ جاتا ہے۔وہ ان کی شادی کی رضامندی تو دے دیتی ہے لیکن اس کے میں دعائیں اور خوف اٹدر رہے ہیں۔

اس طرح دیکھئے تو ''دوسرا مرد'' صرف گھریلو تشدد یا میاں بیوی کے بگڑتے ہوئے باہمی رشتے کے بارے میں نہیں ہے۔یہ افسانہ ہمیں اپنی نئی دنیا اور نئے ماحول کے بارے میں متنبہ کرتا ہوا نظر آتا ہے جہاں آدرشوں کا خون ہو چکا ہے۔''ڈریم لینڈ'' بھی بظاہر کچھ ناکام سی نابرابری کی شادی کی استان ہے۔لیکن دراصل یہ اس طرح کی مفاہمت کی داستان ہے جو ہم اب زندگی میں کئی کئی بار کرتے رہتے ہیں۔افسانے کی مرکزی کردار کی ڈریم لینڈ کوئی خوشگوار، بھرا پرا گھر نہیں جس میں چاہنے والا شوہر اور پیارے پیارے بچے ہوں، بلکہ ایک خوبصورت پہاڑی مقام ہے جس کا منظر ایک خوبصورت بنگلے کی خواب گاہ سے نظر آتا ہے۔یہ ڈریم لینڈ اس نے اپنی سب آرزوؤں کا خون کر کے حاصل کیا ہے۔وہ اس میں خوش ہے یا نہیں، اس کے بارے میں افسانہ نگار کوئی واضح اطلاع ہمیں نہیں دیتا۔

کشمیری لال ذاکر کا ایک بڑا وصف یہ ہے کہ وہ افسانے کو بظاہر ادھورا چھوڑ دیتے ہیں۔اس طرح قاری کو اپنی رائے قائم کرنے اور اپنے نتائج خود نکالنے کی کوشش کرنی پڑتی ہے۔ذاکر کے افسانے ہمیں سوچنے کی ترغیب دیتے ہیں، ہماری طرف سے سوچتے نہیں۔''ڈبل شفٹ'' کی عورت ''اب چالیس سے اوپر ہے اور میں تین بیٹوں کی ماں ہوں۔'' وہ آگے کہتی ہے:''میری زندگی کا دائرہ بہت محدود ہے...میں نے کبھی بہت سنجیدگی سے نہیں سوچا ہے اپنی زندگی کے بارے میں۔نہ ہی مین نے کبھی زیادہ بات بھی کی ہے...جو لوگ کم بولتے ہیں لوگ ان پر اعتبار نہیں کرتے، انھیں گھنے سمجھتے ہیں۔''

پھر ایسی بظاہر بے رنگ، کم گو، اعلیٰ تعلیم یافتہ نہیں بلکہ صرف ہائی اسکول پاس عورت میں کیا خاص بات ہے جس کے باعث وہ اس افسانے کی متکلم بھی ہے اور اس پر چھائی بھی ہوئی ہے؟ وہ کہتی ہے:''میں جب بھی کسی معاملے پر بات کرتی، ہمارا جھگڑا شروع ہو جاتا۔'' اور یہ جھگڑا عموماً اس طرح ختم ہوتا کہ شوہر، جو شراب کے نشے میں کم وبیش دھت ہے، بیوی پر ہاتھ اٹھا دیتا ہے۔اب بچے بھی اس بات کو جان گئے ہین لیکن بڑا بیٹا جس سے کچھ توقع ہو سکتی تھی، اپنے کسی معاملے میں ماں کی مداخلت کو برداشت نہیں کرتا۔لیکن وہ اپنے رومان کو پھلنے پھولنے کے لئے رقم بھی ماں ہی سے مانگتا ہے۔ماں جو ڈبل شفٹ کام کرتی ہے اور جوں توں کر کے گھر چلاتی اور مکان کی قسط بھی ادا کرتی ہے، بالآخر بیٹے کا تقاضا پورا کرتی ہے یعنی اسے پانچ سو روپئے دے دیتی ہے، حالانکہ اسے بیٹے کے لچھن کچھ ٹھیک نہیں لگتے۔افسانہ ختم ہوتے ہوتے ہم بیٹے کی آنکھ میں ماں کے لئے تشکر کے آنسو دیکھتے ہیں اور ہمیں شوہر کی آواز بیڈروم سے آتی ہوئی سنائی دیتی ہے کہ ''آج چائے نہیں ملے گی کیا؟''

ظاہر ہے کہ افسانہ یہاں ختم نہیں ہوا اور ہو بھی گیا۔کشمیری لال ذاکر کوئی حل بتانے یا کسی رائے زنی سے گریز کرتے ہیں اور ہمیں سوچتا ہوا چھوڑ جاتے ہیں۔

چند مختصر افسانوں کا یہ مجموعہ اپنے اندر بڑی معنویت لئے ہوئے ہے۔ہم لوگ، جو کشمیری لال ذاکر کو اپنے لڑکپن سے پڑھ رہے ہیں، یہی دعا کر سکتے ہیں کہ خدا ان کے قلم کو یوں ہی رواں رکھے۔

◄◄ ● ►►

سرفراز جہاں

کا اولین افسانوی مجموعہ

گردش ایّام

شایع ہو چکا ہے

صفحات:۱۵۲ قیمت:۲۰۰/روپے

رابطہ:معرفت جاذب انور، کے۔۳۶، بٹلہ ہاؤس، نزد خلیل اللہ مسجد، اوکھلا، نئی دہلی۔۱۱۰۰۲۵

ناشر: ثالث پبلیکیشنز، شاہ کالونی، شاہ زبیر روڈ، مونگیر۔۸۱۱۲۰۱

مکتوبات

☆ آج آپ سے بات کر کے مسرت ہوئی۔آپ کا پرچہ 'ثالث' مجھے چند دن ہوئے ملا،شکریہ۔ اس کے پہلے کوئی شمارہ مجھے نہیں ملا تھا۔ یہ پرچہ اردو کے عام پرچوں سے ذرا ہٹا ہوا ہے لیکن معیار انتخاب میں اور سختی کی ضرورت ہے۔

مکتوبات میں حضرت مولانا ولی رحمانی نے مجھے محبت سے یاد کیا ہے۔ان کا شکریہ ادا کر دیں اور میری طرف سے یہ بھی عرض کر دیں کہ اس وقت اردو میں کوئی ماہنامہ باقاعدہ نہیں شائع ہوتا۔ایک 'شاعر' ہے لیکن اس کا مزاج اور ہے۔اگر کوئی ماہنامہ باقاعدہ شائع ہونے لگے اور مجھ سے فرمائش کرے تو میں 'اردو دنیا' میں اپنے کالم کی طرح کا کالم یہاں بھی شروع کر دوں،تو میں حاضر ہوں۔فروغ اردو کونسل چھوڑنے کے بعد 'اردو دنیا' میں کالم لکھنا میں نے بند کر دیا۔ان کی طرف سے فرمائش بھی نہیں آئی۔'شاعر' بھی فرمائش کرے تو میں غور کر سکتا ہوں۔

محمد حامد سراج نے 'تناظر' کا ذکر کیا ہے کہ اس کا ایک شمارہ وہ میرے لئے آپ کو بھیج رہے ہیں۔جب 'تناظر' آپ کو مل جائے تو براہ کرم مجھے بھیج دیجئے گا۔ڈاک خرچ بے تکلف مجھ سے وصول کر لیجئے گا،شکریہ۔

آپ کے لئے کچھ چھوٹی موٹی تحریریں بھیجتا ہوں۔یہ دیباچہ یا رائے کے طور پر لکھی تھیں لیکن رسمی اور سرسری نہیں ہیں۔امید ہے ان میں کچھ کام کی باتیں آپ کو مل جائیں گی۔

شمس الرحمٰن فاروقی (الہٰ آباد)

☆☆☆

☆ مذاکرہ پڑھا۔

مجھ ناچیز کے خیال میں نیا وہ ہے جس میں خیال افروزی کا وصف ہو۔خیال افروزی فکر میں ارتعاش اور ہلچل پیدا کرتی ہے۔ان آندھیوں سے پیدا ہونے والا ارتعاش ہی تخلیق میں ناگہانی آگاہیوں کے امکانات پیدا کرتا ہے۔تقسیم کی افسانوی حقیقت منٹو کی اسی خیال افروزی کے سبب افسانے کو وہ ناگہانی آگاہیاں فراہم کرتی ہے جو اسے ٹوبہ ٹیک سنگھ کا ایک نیا اور تازہ افسانہ بنا دیتی ہیں۔چبائے ہوئے نوالے اسی لیے خیال افروز نہیں ہوتے۔سرسید اور حالی اپنی خیال افروزی اور قاری کو فراہم کرنے والی ناگہانی آگاہیوں کے سبب ہی جدید تھے۔خیال افروزی کا تعلق موضوع،متن اور وسیلۂ اظہار وغیرہ سے ہو سکتا

ہے۔ایسا نہیں ہے کہ آج نیا کچھ نہیں لکھا جا رہا ہے.....لکھنا مشق فغاں جیسا ہے۔فغاں کی اس مشق میں بس کوئی کوئی نالہ ہی کبھی کبھی ساتویں آسمان تک پہنچتا ہے۔ورنہ درمیان میں ہی دم توڑ دیتا ہے۔یار لوگوں نے مذاکرے میں اس تیاری کے ساتھ شرکت نہیں کی جس کا وہ مستحق تھا۔جی بھر کے ادھر ادھر کی اُڑائی گئی ہے۔جناب! کبھی کبھی تھوڑا سا ہوم ورک کر لینا چاہئے۔اپنی قابلیت پر اتنا بھی کیا گھمنڈ۔محفل میں پہلی بار شریک ہو رہا ہوں وہ بھی اس گستاخی کے ساتھ۔اس لیے معذرت خواہ ہوں۔اقبال مجید (بھوپال)

☆☆☆

☆ ثالث کا پانچواں شمارہ ملا جس کو دیکھ کر ایک خوشگوار احساس دامن گیر ہُوا۔سرِ ورَق کیسی عمدگی سے تصویر کیا گیا ہے مگر مواد کے اعتبار یہ خوبصورتی تھوڑی مبہم ضرور لگی۔اگر تھوڑا اور واضح ہو پاتا تو قدرے مناسب تھا اور یوں زیادہ متاثر بھی کرتا خیر یہ واجبی باتیں ہیں۔شاعری کا حصہ بہت خوبصورت کلام سے مزین ہے جس میں اچھے شعراء سے مِل کر اُن کا کلام پڑھ کر شعری ذوق کی تسکین مِلی اور مجھ ایسے قاری کو تو تحریک بھی۔ذوالفقار صاحب کی غزلیات کی اگر تعریف نہ کی جائے تو بلاشبہ ان کے ساتھ زیادتی ہوگی۔علی اکبر ناطق صاحب کی نظمیں ''داستان گو' اور ''سخنوروں میں خوشنوا!'' نے متاثر کیا۔اقبال حسن آزاد صاحب کی نظم ''ہوا دھوکا نہیں دیتی'' کی کیا بات ہے مصرعوں کا ٹریٹ منٹ ہی خاصے کی چیز ہے۔نظم خوبصورت ترین سطروں سے آراستہ نظم ہے۔

مذاکرہ میں عمدہ موضوع چنا گیا ہے۔چند ادیبوں کو چھوڑ کر باقی تمام ادیب جگالی کے قریب نظر آتے ہیں کیا اردو افسانوں نگاروں کے پاس لکھنے کے لئے نیا کچھ نہیں ہے جس سے مجھ ایسے تشنہ طالبِ علم کے لیے راحت کا سامان ہو اور کچھ سیکھنے کو ملا۔

افشاں ملک صاحبہ کی تحریر ''گنڈاسا کا تجزیہ'' پڑھی لیکن وہ تجزیے سے آگے نہیں جا سکی یعنی تحریر نے کسی جگہ بھی مصنفہ کے ہونے کا پتا نہیں دیا اب خدا خبر یہ خوبی میں شمار کیا جانے چاہیے یا اِسے کمزور پہلوؤں میں رکھ کر دیکھا جانا چاہیے۔

اِس کے علاوہ عمدہ اور نئے افسانے بھی ثالث کی زینت بنے۔حامد سراج صاحب کا ''مارگزیدہ'' عمدہ افسانہ ہے لیکن زیادہ جلدی میں اختتام کیا گیا۔مزید بہتر کیا جا سکتا ہے۔اس کے علاوہ یوسف عزیز زاہد صاحب کا افسانہ ''آواز سے بچھڑی ہوئی چیخ'' بہت عمدہ افسانہ ہے کئی بار پڑھنے کے بعد اس کی سمجھ آئی اور وہ بھی شاید ادھوری ہے ابھی۔

ثالث پر تبصرے بہت سے ادباء کے موجود ہیں اور نہایت عمدہ اور جامع تبصرے ہیں نعیم بیگ صاحب،فرخ ندیم صاحب،اور دیگر۔

افتخار حیدر صاحب کا تبصرہ بہت عمدہ اور اچھا ہے لیکن انہیں نثر پر دھیان دینا چاہئے نثر کو مزید بہتر

کیا جاسکتا ہے۔

القصہ مختصر کے ثالث میں خوبصورتی کے کئی رنگ ہیں جو ایک تصویر مکمل کرنے میں کم از کم کامیاب ہیں میں اِس خوبصورت پرچے پر مُدیران کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

افتخار احمد خٹک

☆☆☆

تقریباً ایک سال قبل ''ثالث'' کا ذکر صغیر رحمانی صاحب سے سنا تھا۔اس کے معیار کا بھی ذکر انہوں نے مجھ سے کیا تھا۔اور میں نے اپنی غزلیں روانہ کی تھیں لیکن لگتا ہے کہ ڈاک خانے کے ناقص نظام کی نذر ہوگئیں۔کچھ تخلیقات آپ کے انتخاب کی آسانی کے لیے روانہ کررہا ہوں۔اس لفافے کو سادہ ڈاک سے بھیجنے کی غلطی نہیں کروں گا۔اس طرح ثالث کے منظر عام پر آنے سے پہلے انشاء اللہ قابل اشاعت تخلیقات جگہ پا جائیں گی۔

ثالث کا زرسالانہ ادا کرنے کا وعدہ کرتا ہوں۔بس یوں سمجھ لیجئے کہ جب تک زرسالانہ ادا نہیں کروں گا، مروں گا نہیں۔ثالث کے معیار کو برقرار رکھنے میں دشواری تو آرہی ہوگی کیونکہ اس زمانے میں ادب سے متعلق کوئی بھی کام صرف گھاٹے کا ہی سودا ہی ہے لیکن یہ گھاٹا اب ہمیں ہر حال میں منظور کرنا پڑے گا۔میں اردو پر جاں نثاری کا جذبہ رکھنے والے ہر اس شخص کو سلام کرتا ہوں جس نے زبان کی ''دمت کو نفع نقصان سے اوپر اُٹھ کر اپنا نصب العین بنایا ہے۔

مصداق اعظمی (پھولپور، اعظم گڈھ)

☆☆☆

جناب صدرالدین امین بھایانی صاحب کا افسانہ ''خلا'' ثالث۔۵ میں مطالعے میں آیا. ان کی تین چار تحریریں پہلے پڑھ اور پسند کر چکا ہوں... ''خلا'' ان کا بہت ہی اچھا اور بڑا افسانہ ہے۔صارفیت دنیا میں ہمیشہ سے رہی ہے۔لیکن پہلے اس کا تصور صرف جنس کی خرید و فروخت تک محدود ہوا کرتا تھا۔وقت کے ساتھ اس کا دائرہ وسیع ہوتا گیا۔آج کہ سکتے ہیں کہ ہم ایک مکمل صارفی معاشرے میں جی رہے ہیں جہاں رشتے . ناتے . جزبات . اخلاق . خوشیاں . محرومیاں.....حتیٰ کہ ایمان اور مذہب تک خرید و فروخت کی اشیاء میں شامل ہو چکے ہیں ''خلاء'' اس صارفی معاشرے کی منھ بولتی تصویر ہے. امین صاحب نے لفظ خلاء کو محرومی کے وسیع معنی میں استعمال کیا ہے۔

افسانے کی مرکزی کردار بیگم مبینہ شوکت ایک رئیس باپ کی بگڑی ہوء اولاد ہے۔آسائشوں نے اسے ہر طرح سے برباد کر دیا ہے یہاں تک کہ وہ اپنے فزیکل کومپلیکیشن کی وجہ سے ماں بھی نہیں بن سکتی یعنی وہ کبھی ایک مکمل عورت نہیں بن سکتی۔وہ اپنے اندر کے خلاء کو پیسوں کے بوتے پر جو اس کے پاس بے پناہ

ہے کہ زریعہ اشیاء کو دوگنے. تگنے داموں خرید کر اور اپنے سے کمتر لوگوں کی تزلیل کر کے پر کرنے کی ناکام کوشش کرتی ہے۔افسانے کا دوسرا معاون کردار شوکت زماں ہے جو اپنے حالات سے مجبور ہو کر اپنے آپ کو مبینہ کے والد کے ہاتھوں فروخت کر دیتا ہے اور ایک خلاء سے نکل کر دوسرے خلاء میں جینے پر مجبور ہے اس کی زندگی بڑی المناک ہے

ذیلی کرداروں میں اکرام ہے جو اپنی زندگی چلانے کے لیے جویلر احسانی کی نوکری کرتا ہے اور چار و ناچار بیگم منیبہ کے ہاتھوں اس خوف میں ذلیل ہوتا رہتا ہے کہ کہیں نوکری نہ چلی جائے اس کی اپنی مجبوری خلاء ہے کہ وہ سب کچھ برداشت کرتا ہے۔اگر اس کھیل میں کسی کو فائدہ ہے تو وہ احسانی ہے جو اپنی چاپلوسی سے اپنے مال کو دوگنے اور تگنے داموں بیچتا ہے۔احسانی کا کردار ایک مکار بزنس مین کا بہترین کردار ہے۔منیبہ کے والد کا کردار بھی ایک بڑے سرمایہ دار اور عیار انسان کی اچھی مثال ہے

ہم اتنا تو سمجھتے ہیں کہ نچلے طبقے. نچلے متوسط طبقے. اور درمیانی طبقے کی زندگیوں میں طرح طرح کی محرومیاں ہوتی ہیں لیکن اس افسانے میں امین بھایانی نے معاشرے کے ان لوگ ں کے خلاء کو بڑی ہی چابکدستی سے پیش کیا جہاں عموماً ہماری نظر نہیں جاتی اور ہم سمجھتے ہیں کہ ان کی زندگی میں عیش ہی عیش ہیں اور وہاں محرومیوں کا شائبہ تک نہ ہوگا۔

افسانہ پلاٹ، واقعات، بیانیہ، کردار نگاری ہر لحاظ سے بھرپور اور مکمل ہے اور یقیناً برسوں یاد رہے گا۔اس خوبصورت افسانے کے لیئے جناب امین بھایانی کو بہت بہت مبارکباد۔ پرویز اختر

☆☆☆

☆ آپ نے میری کہانی پسند کی اور اس کو'' ثالث کے لئے منتخب کیا، یہ میرے لئے نہ صرف خوشی بلکہ اعزاز کی بات ہے۔شاید میری یہ پہلی کہانی ہوگی جو کسی رسالہ میں شائع ہو رہی ہے، ورنہ اب تک میں ''افسانہ فورم'' یا پھر اپنے ''بلاگ'' تک ہی محدود رہا۔میں اس کے لئے آپ کا جتنا بھی شکریہ ادا کروں کم ہے۔ اس دور میں جبکہ مافیا اور دلال قسم کے لوگ ہر جگہ در آئے ہیں ادب بھی اس سے محفوظ نہیں رہا ہے۔آپ نے نئے لکھاریوں کو جگہ دے کر اور ان کی ہمت و حوصلہ افزائی فرما کر جو جرات دکھائی ہے قابل ستائش ہے۔اس سے یقیناً نوجوان لکھاری کی مستقبل کی راہیں ہموار ہوں گی اور وہ دن بدن بدلتے ماحول اور نئی اڑانوں کیساتھ نوجوان فکر اور جذبات پر مشتمل معتد بہ حصہ ادب میں ڈال سکیں گے، اس کے لئے میں ایک مرتبہ پھر آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

محمد علم اللہ (نئی دہلی)